عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان

(سلطنت سے مغل عہد تک)

حصہ اول: دہلی سلطنت

(1206-1526)

پروفیسر ستیش چندر

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان

(سلطنت سے مغل عہد تک)

حصہ اوّل: دہلی سلطنت

(1206-1526)

پروفیسر ستیش چندر

مترجم

پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقیِ انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک-۱، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

دیباچہ

اس کام کا ارادہ بہت عرصے پہلے سے تھا۔ پچھلے کئی برسوں سے ملک اور بیرونی ممالک میں بسنے والے دوست واحباب مجھ سے تقاضہ کر رہے تھے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان پر ایک ایسی کتاب لکھوں جس میں جدید فکر اور تحقیق دونوں شامل ہوں اور جو عام مطالعہ اور طالب علموں کے لیے مفید ہو۔ بہر حال میں اس وقت تک اس کام کو پوری سنجیدگی سے شروع نہیں کر سکا جب تک کہ میں نے اپنی تیسری نثری تصنیف "عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں تاریخ نویسی، مذہب اور ریاست" (1996) مکمل نہیں کر لی۔ اس سے پہلے دو نثری تصانیف "عہد وسطیٰ کا ہندوستان۔ معاشرہ، جاگیرداری بحران اور گاؤں" (1982) اور "مغلوں کی مذہبی پالیسی۔ راجپوت اور دکن" (1993) ہیں۔

کتاب حاضرہ میں صرف 1206 سے 1526 کے دورِ سلطنت کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ میں نے تقسیم کا روایتی طریقہ اپنایا ہے لیکن یہ کوشش کی ہے کہ ایک تسلسل قائم رہے تاکہ اداروں کی خود ساختہ تقسیم تاریخ کی متصل تحریکوں کی سمجھ پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

محترم جناب نریندر کمار، چیئرمین، ہر آنند پبلیکیشن پرائیویٹ لمیٹڈ کی دوستانہ، ترغیبی اور ذاتی دلچسپی کے بغیر اس کتاب کی تکمیل مشکل ہی تھی۔

میں جناب پی۔این۔ سہائے، لائبریرین، انڈین کاؤنسل آف ہسٹوریکل ریسرچ، نہرو میموریل میوزیم اور لائبریری کے لائبریرین اور ڈاکٹر اے پی سریواستو، اس وقت دہلی یونیورسٹی کے ڈائریکٹر آف لائبریریز کا شکر گزار ہوں جنھوں نے کتابوں اور حوالوں کے حصول میں مسلسل مدد کی۔

میں سوسائٹی فار انڈین اوشن اسٹڈیز کے جناب جے۔کے۔ گوسائن کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے محترمہ مونیکا مور جانی کی مدد سے میرے مسودہ کے صفحات کم کرنے کا مشکل ترین کام اچھے ٹائپ کی مدد سے کیا اور اس میں اصلاحات کیں۔

ہندوستان تک پھیل گئی۔ ہم اس کا مطالعہ اس لحاظ سے کریں گے کہ یہ ایک مہم کا تسلسل تھا نہ کہ کسی ایک سلطان کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ۔

(الف) گجرات:

حالانکہ ترک غزنوی دور سے ہی گجرات کو فتح کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے حملوں کو چالوکیہ حکمرانوں نے ناکام کر دیا تھا۔ اس کے بعد معزالدین محمد غوری نے انہلواڑہ پر ایک حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا لیکن وہ زیادہ عرصے تک اس پر اپنا قبضہ نہ رکھ سکا۔ بہر حال گجرات کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے ترکوں کے لیے زیادہ عرصے تک اس کی طرف سے بے توجہی برتنا ممکن نہ تھا۔ نہ صرف یہ کہ یہ ایک زرخیز اور گنجان علاقہ تھا بلکہ یہ دستکاری، خاص طور پر کپڑوں کی صنعت کا مرکز بھی تھا۔ اس کی اہم بندرگاہ کھمبایت (کیمبے) سے مغربی ایشیا سے عالی پیمانے پر تجارت ہوتی تھی اور اس کے علاوہ چین سے بھی تجارت ہوتی تھی۔ جینیوں کے علاوہ ہندو اور بوہرا اور عرب تاجر کھمبایت میں عرصۂ دراز سے سکونت پذیر تھے۔ اس کے خوشحال ہونے کی وجہ سے یہاں کے حکمرانوں نے بہت سونا اور چاندی جمع کر لیا تھا اور کچھ اس کے مندروں میں بھی جمع تھا۔ دوسری وجہ گجرات پر قبضہ کرنے کی یہ بھی تھی کہ مرکزی اور مغربی ایشیا میں منگولوں کے اقتدار کے قائم ہونے اور ہندوستان پر ان کے متواتر حملوں کی وجہ سے وسطی ایشیا اور عراق سے گھوڑوں کی سپلائی متاثر ہوئی تھی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بلبن کو ہندوستانی گھوڑوں پر بھی انحصار کرنا پڑا۔ گجرات پر اقتدار کا مطلب عربی، عراقی اور ترکی گھوڑوں کی لگاتار سپلائی کی ضمانت ہو سکے گا جس کی ضرورت فوج کے لیے تھی اور جو ایران اور عراق سے عرصہ دراز سے تجارت کا اہم جزو تھا۔

لہٰذا سلاطین دہلی کو گجرات پر حملہ کرنے کے لیے کسی عذر کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ عذر پیش کرنے کا موقع اس وقت آیا جب روایت کے مطابق، نئے حکمراں، کرن، کے وزیر اعظم نے علاء الدین کو گجرات پر حملہ کرنے کی دعوت دی کیوں کہ کرن نے اس کی بیوی پر اس کی غیر موجودگی میں قبضہ کر لیا تھا اور اس کے علاوہ بھی کئی غیر قانونی کام کیے تھے۔ 1299 میں علاء الدین نے اپنے دو بڑے سپہ سالار الغ خاں اور نصرت خاں کو گجرات پر حملہ کرنے کے لیے مقرر کیا۔ الغ خاں نے جو سندھ سے چلا تھا۔ راستہ میں جیسلمیر کو لوٹا۔ پھر دونوں فوجیں چتوڑ کو پار

کرتی ہوئی گجرات کی طرف روانہ ہوئیں۔ حالانکہ چتوڑ کے رانا نے ان کی مخالف کی۔ گھلواڑہ پہنچ کر انھوں نے اس کو لوٹا اور تباہ کر دیا۔ رائے چند اس غیر متوقع حالات سے حیران ہوا اور دیوگیر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی تمام عورتوں اور خزانے، معہ اس کی خوبصورت بیوی کملادیوی پر ترکوں نے قبضہ کر لیا۔ ترکوں نے کملادیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔ اس کو دہلی لایا گیا جہاں علاء الدین نے اس کو اپنے حرم میں شامل کر لیا۔ گجرات کے دوسرے بڑے شہروں، معہ سورت کے، بہت سے عبادت خانوں اور مندروں کو، معہ سومناتھ کے جس کو دوبارہ تعمیر کیا گیا تھا، کو بری طرح لوٹا گیا۔ کھمبایت میں ہندو اور مسلمان تاجروں کو بھی نہیں چھوڑا گیا۔ یہ اسی جگہ ہوا کہ ایک غلام، ملک کافور کو جس نے بعد میں دکن کی مہموں میں اہم کردار ادا کیا، جس کو ہزار دیناری کہا جاتا تھا، یعنی ایک ہزار سونے کے دینار میں خریدا ہوا، زبردستی ایک مسلم تاجر سے لے لیا گیا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترکوں کے خلاف کوئی خاص مزاحمت نہیں ہوئی کیونکہ کرن جلد ہی تخت نشین ہوا تھا اور ایک نئے خاندان کی بنیاد ڈالی تھی کیونکہ پچھلے خاندان کے آخری راجا کے کوئی وارث نہ تھا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ کرن کو اس کے غلط کارناموں کی وجہ سے کوئی مقامی مدد حاصل نہیں تھی۔ اپنے دارالسلطنت سے بھاگ کر کرن نے بگلانا پر قبضہ کیا جو گجرات کے جنوب میں ہے جہاں ترکوں نے اسے کچھ عرصے تک پریشان نہیں کیا۔ گجرات کے باقی تمام حصوں پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا اور اس کا انتظام کرنے کے لیے ایک ترکی افسر تعینات کیا گیا۔

(ب) راجستھان:

حالانکہ اجمیر ترکوں کے زیر اقتدار معزالدین محمد غوری کے زمانے سے ہی آچکا تھا اور اسی کے ساتھ ناگور اور ماڈور بھی تھے، لیکن سلاطین ان جگہوں کے علاوہ راجستھان میں اپنا اقتدار بڑھا نہیں سکے اور رنتھمبور کو جو راجستھان کا سب سے مضبوط قلعہ تھا، اپنے زیر اقتدار لانے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیابی بہت کم مدت کے لیے مل سکی۔ جلال الدین خلجی نے رنتھمبور پر حملہ کیا لیکن اس کو ناکام واپس لوٹنا پڑا اس لیے کہ ایک تو قلعہ بہت مضبوط تھا اور دوسرے اسے رانا کی جوابی کارروائی کے مصمم ارادے کا اندازہ ہو گیا تھا۔

گجرات کو اپنی ریاست کا حصہ بنانے کے بعد علاء الدین کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ

راجستھان اور مالوہ پر بھی اپنا اقتدار قائم کرے تاکہ گجرات سے اس کا براہِ راست تعلق ہو سکے۔ یہ واقعہ ہے کہ میواڑ کے حکمراں نے ترکی فوجوں کی اپنے علاقے سے گجرات کے لیے نقل و حرکت کی مخالفت کی تھی۔ اسی کی مثال پر عمل کرتے ہوئے جالور کے حکمراں نے بھی ترکی فوجوں کے داخلے کی ممانعت کر دی۔ آخر کار، گجرات سے واپسی پر منگول، جن کو نو مسلم کہا جاتا تھا، گجرات کے مالِ غنیمت کے مسئلہ پر بغاوت پر آمادہ ہو گئے جو ان کے اور سلطان کے درمیان ہوا تھا۔ اگرچہ بغاوت کو دبا دیا گیا لیکن دو منگول افسروں نے معہ اپنے ساتھیوں کے رنتھمبور میں پناہ لے لی۔ وہاں کے حکمراں ہمیر دیو نے جو پرتھوی راج چوہان کے خاندان سے تھا، اپنے گھمنڈ اور قلعہ کی قوت کی بنا پر پناہ گزینوں کو سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا 1301 میں علاء الدین نے الغ خاں اور نصرت خاں کو، جو فاتح گجرات تھے، حکم دیا کہ وہ رنتھمبور کی سمت کوچ کریں۔ جب قلعہ کا محاصرہ چل رہا تھا تو نصرت خاں فوجوں کو ہدایت کرتا ہوا بہت نزدیک چلا گیا اور اسی میں مارا گیا۔ ترکی فوج میں انتشار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رانا قلعہ سے باہر نکل آیا۔ الغ خاں کو شکست دی اور اسے جھائن لوٹ جانے پر مجبور کیا جو وہاں سے 12 میل دور تھا اور رانا کے رنتھمبور میں پناہ لینے سے پہلے اس کا مرکز تھا۔

ان حالات کے پیش نظر علاء الدین کے لیے یہ لازمی ہو گیا تھا کہ وہ بذاتِ خود رنتھمبور جائے۔ اس نے اپنے خلاف ایک سازش کو ختم کرنے کے بعد ایسا ہی کیا۔ رنتھمبور پہنچنے پر اس نے بہت قریب سے اس کا محاصرہ کر لیا حالانکہ ترک فوجی اس کی دیواروں پر چڑھنے میں ناکام رہے لیکن یہ محاصرہ چار ماہ تک چلا جس کی وجہ سے کھانے پینے کے سامان اور پانی کی سخت قلت ہو گئی۔ اس لیے راجپوتوں نے جوہر کی خطرناک رسم ادا کی۔ تمام عورتیں چتا میں داخل ہو گئیں اور مرد لڑ کر مرنے کے لیے باہر نکل آئے۔ اس جنگ میں منگول بھی راجپوتوں کے ساتھ مرے۔ شاعر امیر خسرو جو علاء الدین کے ساتھ تھے قلعہ کا بیان کرتے ہیں اور جوہر کا بھی بیان ان کے ایک مشہور کلام میں ہے۔

رنتھمبور کے بعد چتوڑ کا نمبر آیا۔ اس کو بھی راجستھان کے مضبوط قلعوں میں سے ایک شمار کیا جاتا تھا۔ حالانکہ چتوڑ اس کے گوہل حکمرانوں اور گجرات کے چالوکیوں کے درمیان وجہ تنازعہ بنا رہا لیکن اس وقت اس پر گوہلوٹ حکمراں رتن سنگھ کا اختیار تھا جو حال ہی میں اپنے باپ کے بعد اس کا وارث بنا تھا۔ شاعر امیر خسرو جو علاء الدین کے ساتھ تھا اس محاصرے کی تفصیل بیان

کرتا ہے اور کہتا ہے کہ چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا تب رتن سنگھ باہر آیا اور اطاعت قبول کی۔ اس کا بہت اچھی طرح استقبال کیا گیا لیکن 30,000 کسان جنھوں نے قلعہ میں پناہ لی تھی وہ سب قتل کر دیے گئے۔ خسرو چتوڑ کے معاملے میں جوہر کا کوئی ذکر نہیں کرتے ہیں۔

خسرو کے بیان کی دوسرے ماخذ بھی تائید کرتے ہیں ان میں سے کسی نے بھی پدمنی کی حکایت کا ذکر نہیں کیا جو سب سے پہلے 15ویں صدی کے پہلے حصہ کے ادب میں لکھی گئی تھی۔ اس کو طرح طرح کے قصے کہانیوں سے دلچسپ داستان بنایا گیا تھا خاص طور پر ملک جائسی نے تقریباً سو سال بعد اس کو داستان بنایا۔ یہ کہانی بہت مشہور ہے اور اس کو دہرانا ضروری نہیں۔ اس کہانی کو زیادہ تر مورخین جن میں راجستھان کی تاریخ پر پایۂ اول کے مورخ گوری شنکر اوجھا بھی شامل ہیں، مسترد کر چکے ہیں۔ اس لیے پدمنی کا قصہ ہم کو زیادہ دیر روک نہیں سکتا۔ یہاں اس بات کا ذکر کیا جاسکتا ہے کہ اس کی فتح کے بعد چتوڑ کے قلعے کی گورنری خضر خاں کے سپرد کر دی گئی جو علاء الدین کا بیٹا تھا۔ چتوڑ کی فتح کے بعد راجستھان کے زیادہ تر راجاؤں معہ مارواڑ اور ہاڑوتی (بوندی) کے سب نے اطاعت قبول کرلی۔ مارواڑ میں ماڈور ترکوں کے قبضہ میں تھا ہی۔ جیسلمیر کو پہلے ہی گجرات کی مہم کے دوران مطیع کر لیا گیا تھا۔ سوانہ اور جالور جو کہ گجرات کے نزدیک ہیں وہ بہت اچھی طرح محفوظ تھے اور انھوں نے سختی سے مقابلہ بھی کیا لیکن ان پر بھی قبضہ ہو گیا اور 1308 اور 1311 میں ان کو لوٹ لیا گیا۔

لہٰذا دس سال کے عرصے میں پورے راجستھان پر ترکوں کا تسلط ہو گیا۔ حالانکہ صرف اجمیر پر قبضہ رکھنے اور کچھ مضبوط قلعوں جیسے رنتھمبور اور چتوڑ کے علاوہ علاء الدین نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی کہ وہ براہ راست راجستھان کی راجپوت ریاستوں پر حکومت کرے۔ حقیقتاً اس نے راجپوت راجاؤں سے بظاہر اچھے تعلقات رکھنے کی کوشش کی۔ لہٰذا روایت کے مطابق جالور کے حکمراں کے بھائی مالدیو نے معہ 500 گھوڑ سواروں کے علاء الدین کا ساتھ دیا اور 1313 کے قریب علاء الدین نے خضر خاں کی جگہ اس کو چتوڑ کا گورنر بنا دیا۔

یہ پالیسی کہ مقامی انتظامیہ میں مداخلت نہ کی جائے اور راجپوت حکمرانوں سے دوستی کی جائے علاء الدین نے دیوگیر اور دکن کے کچھ دیگر حکمرانوں تک بڑھادی جس سے اس کو کافی فائدہ ہوا۔

اس طرح علاء الدین دہلی سلطنت کا پہلا حکمراں تھا جس نے راجپوتوں کے تئیں اس پالیسی کو بنیادی شکل میں سامنے رکھا کہ جس میں دونوں فریقین کے مفاد کو سامنے رکھا جاتا ہے۔

(ج) مالوا:

چتوڑ کی فتح کے بعد علاء الدین نے اپنی توجہ مالوا کی طرف کی جو بہت زرخیز اور گنجان آبادی والے شہروں کا علاقہ تھا۔ امیر خسرو کے مطابق یہ اتنا وسیع تھا کہ کوئی ذہین جغرافیہ داں بھی اس کی حدود کا احاطہ کرنے سے عاجز تھا۔ اگرچہ التمش نے اور بعد میں جلال الدین کے عہد میں علاء الدین نے مالوا پر حملے کیے اور بہت سامان لوٹا لیکن براہ راست اس پر اقتدار حاصل کرنے کی بہت کم کوشش کی گئی۔ علاء الدین کے ذریعہ اس کی فتح کے بعد ایک تو گجرات کے راستہ پر اختیار حاصل ہوا اور جنوب کے لیے بھی راستہ صاف ہو گیا۔

1305 میں عین الملک ملتانی کو مالوا فتح کرنے کی غرض سے تعینات کیا گیا۔ رائے کے پاس 30 سے 40 ہزار تک گھوڑ سوار فوج تھی لیکن ترکی فوج سے اس کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ رائے کا اجین سے مانڈو تک پیچھا کیا گیا جہاں اس نے پناہ لی تھی۔ اسے شکست دی اور قتل کر دیا گیا۔ تمام مالوا کو، راجستھان کے برعکس، حکومت میں شامل کر لیا گیا اور عین الملک کو وہاں کا گورنر مقرر کیا گیا۔

لہٰذا بنگال کے علاوہ، جو غیاث الدین تغلق (24-1320) کے عہد تک آزاد رہا، پورا شمالی ہندوستان دہلی سلاطین کے زیرِ اقتدار آ گیا۔ غیاث الدین کے عہد میں اڑیسہ پر بھی حملہ کیا گیا، اسے فتح کیا لیکن اسے حکومت میں شامل نہیں کیا گیا۔

(د) مہاراشٹر اور جنوبی ہندوستان۔ پہلا دور: فتح۔

منگول حملوں سے کامیابی کے ساتھ نپٹنے اور اپنی فوج اور اندرونی انتظامیہ کا نظام ٹھیک کرنے کے بعد علاء الدین نے اپنے سب سے زیادہ جرأت مندانہ اقدامات کی تیاری مکمل کی یعنی دکن کی ریاستوں پر حملہ کر کے ان کو دہلی کے ماتحت لے آنا۔ مہاراشٹر اور جنوبی ہندوستان سونے اور خزانے کے علاقے مانے جاتے تھے۔ ان کی مشہور دستکاری اور پھلتی پھولتی بندرگاہوں کے نتیجے میں بے انتہا سونا جمع ہو گیا تھا جس کو حکمرانوں کی نسلوں نے اپنی تحویل میں رکھا تھا۔ اس علاقے

کے مندروں میں بھی بے انتہا سونا تھا جو یہ اندرونی اور بیرونی تجارت میں لگاتے تھے اور سود پر روپیہ دیتے تھے۔ لہٰذا یہ وہ علاقہ تھا جہاں دولت اور شہرت دونوں ہی حاصل ہو سکتی تھیں۔ اس کے بعد کچھ ایسا ہوا کہ اس مہم میں ایسی کامیابی حاصل ہوئی جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی کیونکہ اس علاقے کی ریاستیں اپنے مخصوص انداز میں ایک دوسرے سے لڑتی رہیں اور شمالی ہندوستان میں ہونے والی تبدیلیوں سے قطعی ناواقف تھیں اور نہ ہی وہ یہ محسوس کرتی تھیں کہ یہ تبدیلیاں ان کے لیے بھی خطرے کا باعث ہو سکتی ہیں۔

مہاراشٹر:

مہاراشٹر سے علاء الدین کا سابقہ 1296 میں پڑا جب وہ کڑا سے چل رہا تھا اور بندیلکھنڈ کے دشوار راستوں سے گزر رہا تھا کہ اچانک وہ دیوگیر پہنچ گیا۔ 8000 گھوڑوں کی فوج کے ساتھ اس نے یادو راجہ رام چندر اور پھر اس کے بعد اس کے بیٹے سنگھانا کو شکست دی۔ وہاں سے وہ بہت دولت لے کر لوٹا اور اس کے ساتھ ہی رام چندر کی طرف سے ایک مبہم سا وعدہ بھی ہوا کہ وہ اسے سالانہ خراج ادا کرے گا۔

چتوڑ اور مالوا کی فتح کے بعد علاء الدین نے ایک بار پھر دیوگیر کی طرف اپنی توجہ کی۔ حملہ کرنے کا ایک بہانہ بھی ہاتھ آگیا اگرچہ اس دور میں اس کی قطعی ضرورت نہیں تھی، کہ رام چندر نے دو تین سال سے خراج ادا نہیں کیا تھا۔ کچھ لوگوں کے مطابق یہ اس کے بیٹے سنگھانا کی وجہ سے تھا جس نے اپنے باپ کو دہلی کی اطاعت کے خلاف بھڑکایا تھا۔

1308 میں دو فوجیں دیوگیر کی سمت روانہ کی گئیں۔ ایک کرن کو جنوبی گجرات کے بگلانا سے نکالنے کے لیے جس پر وہ رام چندر کی مدد سے قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایک سخت جنگ کے بعد اس کو شکست ہوئی۔ پھر یہ فوج ملک کافور کے ساتھ شامل ہو گئی جسے رام چندر کو سزا دینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ یادو حکمراں نے تھوڑی مزاحمت پیش کی اور پھر اپنے آپ کو کافور کے حوالے کر دیا۔ امیر خسرو کے مطابق علاء الدین نے حکم دیا تھا کہ رام چندر یا اس کے افراد خاندان کو کسی طرح کا گزند نہ پہنچے۔ لہٰذا رام چندر یا رام دیو کو باعزت دہلی لایا گیا۔ دیوگیر اس کے بیٹے سنگھانا کے اختیار میں رہا۔ جب رام دیو علاء الدین کے دربار میں داخل ہوا تو اس نے موتی اور

ہیرے اس پر نچھاور کیے۔ اس کو چھ مہینے تک دہلی میں خاص مہمان کی حیثیت سے رکھا گیا۔ امیر خسرو کے مطابق "ہر روز اس کی عزت اور اعزاز میں اضافہ ہوتا رہا۔" پھر اپنے بیٹوں اور افرادِ خاندان کے ساتھ اس کو دیوگیر جانے کی اجازت دی گئی۔ روانگی کے وقت رام دیو کو ایک لاکھ سونے کے ٹنکے، رائے رایان کا خطاب اور سنہرے رنگ کا چھتر جو بادشاہت کی نشانی تھی، عطا کیے گئے۔ نوساری، جو گجرات کا ایک ضلع ہے وہ بھی بطور تحفہ عطا کیا گیا۔ شاید یہی وقت تھا جب رام دیو نے اپنی بیٹی جھتیاپالی کی شادی علاء الدین سے کی تھی۔ اس سے پیشتر، دیول دیوی کو، جو گجرات کی رانی کملا دیوی کی بیٹی تھی جو علاء الدین کے حرم میں داخل ہو گئی تھی اور اپنی خوب صورتی کی وجہ سے علاء الدین پر بہت اثر رکھتی تھی، اس کے باپ کرن کے خلاف مہم میں پکڑا گیا تھا، کملا دیوی کے اصرار پر، دیول دیوی کی شادی خضر خاں سے کر دی گئی جو علاء الدین کا بیٹا اور جانشین تھا۔ اگرچہ خضر خاں کا خاتمہ افسوسناک تھا، اس کو ہم علاء الدین کے راجپوت راجاؤں سے تعلقات کو بتدریج بہتر بنانے کی مہم کا حصہ سمجھ سکتے ہیں۔

جنوبی ریاستیں:

اس وقت جنوبی ہندوستان میں اہم ریاستیں وارنگل کی کاکاتیا (جدید تلنگانا) اور ہوئے سالا جس کی راجدھانی دوارسمدر (کرناٹک میں جدید ہیلی بڈ) تھیں۔ جنوب بعید میں مابار کے پانڈیہ اور مدورائی (تامل ناڈو)۔ یہ تمام طاقتیں علاقائی تنازعات کو لے کر ایک دوسرے سے اور دیوگیر کے یادو سے جھگڑتی رہتی تھیں۔

دیوگیر میں ایک معتمد شریک کار اور محفوظ بنیاد حاصل کرنے کے بعد علاء الدین نے 1309 اور 1311 میں ملک کافور کی سربراہی میں دو مہمیں جنوبی ریاستوں کی سمت روانہ کیں تاکہ وہ ان سے جمع شدہ دولت نکلوا سکے اور دوسرے ان کو دہلی کی سربراہی اور اقتدار کو ماننے اور سالانہ خراج ادا کرنے پر مجبور کر سکے۔ علاء الدین ان میں سے کسی ریاست پر قبضہ کر کے اس کو اپنے زیرِ انتظام لانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اتنے فاصلے اور مختلف حالات ایسی کسی بھی کوشش کے لیے مشکلات اور خطرات پیدا کر سکتے ہیں۔ عصامی کے مطابق جس نے اسی دور میں لکھا جس میں برنی نے لکھا ہے، علاء الدین نے ملک کافور کو وارنگل کی پہلی مہم سے پہلے ہدایت کی "اگر تلنگ کا

رائے ہماری اطاعت قبول کرلے (سلطان کی)، اس کی سلطنت اس کو واپس کر دینا اور خلعت اور چھتر سے اس کی عزت افزائی کرنا۔" برنی کا کہنا ہے کہ علاء الدین کی ہدایات تھیں "اگر رائے اپنا خزانہ، ہاتھی اور گھوڑے دے دے اور آئندہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کرے۔ اس تصفیہ کو مان لینا۔" یہ مانا جاسکتا ہے کہ ایسی ہی ہدایات دوسری مہم دوار سمدر اور مابار کے سلسلے میں بھی دی گئی ہوں گی۔

تلنگانہ میں وارنگل کے خلاف پہلی مہم (10-1309) میں چھ مہینہ کا عرصہ لگا۔ دور افتادہ اور تنگ راستوں سے گزر کر ملک کافور وارنگل کے قلعے تک پہنچ گیا۔ اس کی باہری دیوار مٹی کی تھی جو فولاد سے بھی زیادہ مضبوط تھی اور اندر قلعہ کی دیوار پتھر کی تھی۔ قریب کے محاصرے کے بعد جب قلعہ کے باہری حصہ پر قبضہ ہو گیا تو اندرونی قلعہ پر فتح یقینی ہو گئی تب رائے نے بات کی جس پر مصالحت ہو گئی۔ جو خزانہ ملا وہ ایک ہزار اونٹوں پر لاد کر دہلی بھیجا گیا جس کا علاء الدین نے بذاتِ خود معائنہ کیا۔ رائے سالانہ خراج دینے پر بھی راضی ہو گیا۔

اس کامیابی سے اس کی ہمت بڑھ گئی۔ دوسرے سال ہی ملک کافور کو ایک فوج کا سردار بنا کر دوار سمدر اور مابار پر حملوں کے لیے بھیجا گیا پہلے کی طرح دور افتادہ راستوں پر چل کر اور رام دیو کے مرہٹہ سرداروں کی مدد سے کافور نے بلال دیو کو جو دوار سمدر کا ہونے والا حکمراں تھا، اچانک گھیر لیا۔ قریبی محاصرے کے بعد بلال دیو وارنگل کے حکمراں کی طرح انہی شرطوں پر راضی ہو گیا۔ اس نے اپنا سارا خزانہ دے دیا اور سالانہ خراج دینا منظور کر لیا۔ عصامی کے مطابق بلال دیو، علاء الدین سے ملنے دہلی آیا۔ علاء الدین نے اسے 10 لاکھ ٹنکے، ایک خلعت اور چھتر دیا اور اس کی ریاست اس کو واپس کر دی۔

اس کے بعد کافور مابار (کورومنڈل) کے خلاف بڑھا لیکن اس وقت ان دونوں پانڈین بھائیوں سے جنگ کرنا مشکل تھا کیونکہ وہ ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے تھے۔ کافور پٹن (مسولی پٹنم) پہنچ گیا جہاں اسے مسلم تاجروں کی آبادی نظر آئی۔ پورے شہر کو تباہ کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ مسلم تاجروں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ کافور نے چدمبرم (مدراس کے نزدیک) کے مندر کو بھی تباہ کر دیا۔ وہاں اس نے بہت سے ہاتھیوں پر قبضہ کر لیا جو پانڈین بھائیوں کے تھے۔ اس نے مدرائی پر بھی حملہ کیا لیکن اس کو پانڈین بھائیوں سے ملنے یا ان سے معاہدہ کرنے کا موقع نہیں ملا اور اسے واپس آنا

پڑا۔ یہ مہم ایک سال تک چلی۔

ان دو مہموں سے نہ صرف یہ کہ علاء الدین کو کثیر دولت ملی بلکہ اس سے اس کی شہرت میں بھی اضافہ ہوا۔ اپنی ہمت اور مہارت، سمجھداری اور فوجی سردار کی حیثیت سے ملک کافور کی اہمیت عوام کی نظر میں بہت بڑھ گئی۔ علاء الدین کی نظر میں اس کی عظمت کا اس حد تک اضافہ ہوا کہ اسے ملک نائب کے خطاب سے نوازا۔ آگے چل کر طاقت کافور کے سر چڑھنے لگی جس کے نتیجے میں امراء میں کافور کے خلاف ایک جماعت پیدا ہو گئی جس کی بدولت اس کا زوال اور پھر موت واقع ہوئی۔

دکن کی مہموں کے فوری سیاسی فائدے بہت محدود تھے۔ جب تک رام دیو زندہ رہا دیوگیر شریک کار رہا۔ دوسری جنوبی ریاستوں سے جو معاہدے ہوئے تھے وہ کمزور ہو گئے جس سالانہ اخراج کا ان سے وعدہ ہوا تھا وہ مسلسل دباؤ، یہاں تک کہ فوجی مہم کے بغیر حاصل نہیں ہوتا تھا۔ نہ ہی ان مہموں سے کوئی فائدہ تجارت کو ہو سکتا تھا جب تک کہ وہاں ایک بہتر سیاسی استحکام نہ قائم ہو جائے۔ بہر حال ان مہموں سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ دوسرے قدم یعنی ان پر قبضہ کرنے کا راستہ صاف ہو گیا۔

مہاراشٹر اور جنوبی ہندوستان۔ دوسرا دور: قبضہ کرنا۔

حالانکہ علاء الدین نے مہاراشٹر اور جنوبی ریاستوں پر قبضہ نہ کرنے کی پالیسی سیاسی سوجھ بوجھ کے تحت بنائی تھی لیکن حالات کچھ اس طرح بدلے کہ اپنی زندگی میں ہی اپنی اس پالیسی میں تبدیلی کرنا پڑی۔ 1315 میں دیوگیر کے رام دیو کی موت واقع ہو گئی اور اس کے بیٹے بھلاما نے علاء الدین کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ علاء الدین نے بھلاما کو سزا دینے کے لیے ملک کافور کو ان ہدایات کے ساتھ بھیجا کہ اس کو دہلی بھیج دیا جائے اور اس کی ریاست پر قبضہ کر لیا جائے۔ لیکن بھلاما بھاگ گیا۔ کافور نے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور مرہٹہ سرداروں کو معطل کیے بغیر اس ریاست پر حکومت کرنے کی کوشش کی۔ کچھ حد تک وہ کامیاب بھی رہا۔ بہت سے سرداروں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا جب کہ ریاست کے ایک حصہ پر پرانے حکمراں خاندان کے افراد کا ہی قبضہ رہا۔

علاء الدین کی پہلے قبضہ نہ کرنے اور بعد میں قبضہ کر لینے کی پالیسی کچھ وضاحت چاہتی ہے۔ بھلاما کی بغاوت ہی محض ایک وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ بظاہر علاء الدین نے یہ محسوس کیا کہ

دیوگیر پر براہ راست ترکی کنٹرول ضروری ہے تاکہ سفارتی یا پھر اگر ضرورت ہوئی تو فوجی دباؤ کی مدد سے ان جنوبی ریاستوں کو قابو میں رکھا جاسکے۔ لہٰذا یہ جنوب میں قبضہ نہ کرنے کی پالیسی میں ایک تبدیلی تھی اسے پوری طرح ترک نہیں کیا گیا۔

جب مبارک خلجی، علاء الدین کا جانشین بنا تو وہ دیوگیر کی سمت اس ارادے سے بڑھا کہ اس پر مکمل طور پر اپنا قبضہ جما سکے۔ وہ ایسا کرنے میں بغیر کسی خاص مخالفت کے کامیاب ہو گیا۔ اس نے ایک مہم وارنگل کی طرف بھی روانہ کی جہاں رائے نے کئی سالوں سے خراج ادا نہیں کیا تھا۔ اس محاصرہ کا نتیجہ بھی وہی نکلا جو پہلے ہو چکا تھا یعنی جب قلعہ کے باہری حصہ پر قبضہ ہو گیا تو رائے نے اطاعت قبول کرلی۔ سلطان کی جانب سے یہ مانگ کی گئی کہ پہلے پانچ ضلعوں سے دست برداری ہو اور پورا خزانہ اور ہاتھی سپرد کیے جائیں۔ آخر میں رائے ایک ضلع دینے پر تیار ہو گیا اور سونے کی چالیس اینٹیں سالانہ خراج کے طور پر دینے پر راضی ہوا۔ یہ قبضہ نہ کرنے کی پالیسی کی تھوڑی سی خلاف ورزی تھی، اسے بالکل ترک کرنا نہیں تھا۔

جنوب میں قبضہ نہ کرنے کی علاء الدین کی پالیسی کو ترک کرنے کو غیاث الدین تغلق اور اس کے بیٹے اور جانشینوں سے منسوب کرنا زیادہ مناسب ہے۔ تخت نشین ہونے کے فوراً بعد غیاث الدین نے اپنے بیٹے الغ خاں کو جس کو بعد میں محمد بن تغلق کے نام سے جانا جاتا ہے، حکم دیا کہ وہ وارنگل پر حملہ کرے۔ اس لیے کہ وہاں کے حکمراں نے دہلی میں افراتفری کے حالات سے فائدہ اٹھا کر خراج دینا بند کر دیا تھا۔ ایک فوج کو دہلی سے روانہ کیا گیا جس نے دیوگیر میں آرام کرنے کے بعد وارنگل پر حملے کے لیے کوچ کیا۔ چھ مہینے کے محاصرے کے بعد جب قلعہ فتح ہونے ہی والا تھا، یہ افواہ پھیل گئی کہ دہلی میں سلطان کی موت واقع ہو گئی ہے جس کی وجہ سے الغ خاں کی فوج میں عجب افراتفری پھیل گئی۔ کچھ امراء کے بھاگ کھڑا ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رائے نے حملہ کر دیا اور الغ خاں کو مجبور کر دیا کہ وہ واپس دیوگیر چلا جائے۔

سلطان کی موت کی افواہ پر پوری طرح قابو پانے کے بعد اور دہلی سے آئی ہوئی نئی فوج کی مدد سے اگلے برس پھر الغ خاں نے وارنگل کے خلاف مہم شروع کی۔ اس مرتبہ رائے کے لیے کوئی کونہ نہیں چھوڑا گیا۔ اس کو اطاعت کے لیے مجبور کیا گیا اور دہلی بھیج دیا گیا لیکن راستے میں ہی

آخر میں اپنی شریکِ حیات محترمہ ساوتری چندر کا شکر گزار ہوں جن کی متواتر مدد، ہمت افزائی اور ساتھ مجھے اس پورے دور میں حاصل رہا جب میں کتاب مکمل کر رہا تھا۔

ستیش چندر

اس نے خودکشی کرلی۔ اب پورے تلنگانہ پر قبضہ ہو گیا تھا۔ اس کو 9 ضلعوں میں بانٹا گیا اور افسران کا تقرر کیا گیا تاکہ وہ ان کا انتظام سنبھالیں اور ایک سال کا لگان بھی وصول کیا گیا۔ وارنگل کا نام سلطان پور رکھا گیا۔

تلنگانہ کی فتح کے بعد ما بار کی فتح ہوئی۔ 1323 میں ما بار کی راجدھانی مدورائی پر قبضہ ہو گیا۔ ملک کافور نے مدورائی میں، جو پانڈیان کی راجدھانی تھی، ایک مسلم محافظ فوج تعینات کی تھی لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ کس حد تک پر اثر رہی۔ اس علاقے پر خسرو خاں نے بھی حملہ کیا تھا جو مبارک خلجی کا افسر تھا۔ اس لیے تامل علاقہ ایک انتشار کی حالت میں تھا۔ غیاث الدین تغلق کے عہد میں جو ایک فوج بھیجی گئی تھی اس نے مدورائی میں ایک مسلم گورنر کو بحال کر کے وہاں کا گورنر بنایا تھا اور پورا ما بار علاقہ دہلی کے ماتحت آ گیا تھا۔ آخر کار 1328 میں گرشاسپ کی بغاوت کے بعد، جو محمد بن تغلق کا چچازاد بھائی تھا اور جس نے جنوبی کرناٹک میں کمپل کے حکمراں کے ساتھ پناہ لی تھی، محمد بن تغلق نے ایک فوج بھیجی جس کے نتیجے میں کرناٹک پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔

لہٰذا بارہ سال کی مختصر مدت میں تمام جنوبی ہندوستان جس کی سرحد مالابار تک تھی، دہلی کے زیر انتظام آ چکا تھا۔ صرف چند علاقے، معہ دوارسمدر کے اپنے مقامی حکمرانوں کے تحت ہی رہے۔ لیکن واقعات نے جلد ہی یہ ثابت کر دیا کہ یہ قدم جلد بازی میں اور بغیر سوچے سمجھے اٹھایا گیا۔ اتنی تیزی کے ساتھ دہلی سے اس قدر دور اتنے بڑے علاقے کی شمولیت اور ایک الگ انتظامی بندوبست نے جو مختلف سماجی و ثقافتی روایات کے ساتھ تھا، دہلی سلطنت کے محدود وسائل میں کھنچاؤ پیدا کر دیا اور جلد ہی انتشار اور زوال کا عمل شروع ہو گیا۔

لہٰذا دہلی سلطنت کی علاقائی وسعت نے جہاں نئے مواقع فراہم کیے وہاں کچھ نئی چنوتیاں بھی پیدا کیں۔

■■■

-6-

مرکزیت پر مبنی تمام ہندوستان پر حکومت کے مسائل

غیاث الدین اور محمد بن تغلق (51-1320)

علاء الدین کے آخری سال سخت امراض اور امراء میں طاقت کی خاطر آپسی جدوجہد کی وجہ سے کافی پریشانی کا باعث بنے رہے۔ ملک کافور، نائب ملک جس کو علاء الدین کا اعتماد حاصل تھا، اس نے رفتہ رفتہ اپنے تمام مخالفین کو صاف کر دیا اور طاقت حاصل کرنے کے لیے اپنے راستہ کو صاف کرنے کے لیے اس نے خضر خاں کو، جو ولی عہد تھا قید خانے میں ڈال دیا اور پھر اس کو اندھا کروا دیا۔ علاء الدین کی موت (1316) کے بعد کافور نے علاء الدین کے نابالغ بیٹے کو تخت نشین کروایا اور سارا اقتدار خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن ایک ماہ کے اندر ہی کافور کو ہٹا دیا گیا اور علاء الدین کا دوسرا بیٹا مبارک خلجی تخت پر بیٹھا۔ شہرت حاصل کرنے کے لیے مبارک خلجی نے علاء الدین کی تمام زرعی اور مارکیٹ کنٹرول سے متعلق ضابطوں کو ختم کر دیا۔ بہر حال اس نے دکن اور گجرات میں علاء الدین کی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے وہاں مہمیں بھیجیں۔ برنی مبارک خلجی کی بہت ملامت کرتا ہے کہ وہ ہم جنس سے جماع کرنے والا گمراہ شخص تھا۔ حالانکہ یہ تمام عیب ترکی فوجی حلقوں میں عام تھے۔ برنی کی سلطان کی تنقید لی اصل بنیاد یہ تھی کہ وہ نو مسلموں کو زیادہ مراعات دے رہا تھا جس میں برادوجن کو وہ "رذیل" کہتا ہے شامل تھے۔ برادوس کا تعلق جنگجو ذات سے تھا جو اپنے سردار خسرو ملک کی سرپرستی میں آگے بڑھے تھے جس نے نوجوان سلطان کو قتل کر کے خود تخت حاصل کر لیا تھا (1320) اور اس طرح خلجی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ برنی برادو اور اس کے ہندو ساتھیوں کی بہت مذمت کرتا ہے جنھوں نے محل کے اندر بت پرستی شروع کروا دی تھی۔ وہ اسلام کی بے حرمتی کرتے اور روز بروز بت پرستی کو بڑھا وا دیتے۔ جدید تحقیق ان الزامات کو نہیں مانتی۔ برادو نے قطعی طور پر خود طاقت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کو علائی امراء اور دہلی کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کی حمایت حاصل تھی۔ ان کے خلاف بغاوت کا علم غیاث الدین تغلق نے بلند کیا جو منگولوں کے خلاف مہموں کا سردار تھا اور ایک تجربہ کار سپاہی تھا۔

برادو جنگ میں اس کے خلاف کھڑے نہیں رہ سکے تھے اور صرف دو مہینوں میں ہی ان کو شکست ہوئی اور وہ منتشر ہو گئے۔

نئے سلطان غیاث الدین تغلق کو بہت کم مدت کے لیے حکومت کرنے کا موقع ملا۔ انتظام کو ٹھیک کرنے کے بعد اور اپنے بیٹے الغ خاں کو وارنگل میں شاہی حیثیت بحال کرنے کے لیے نامزد کرنے، ایک امیر کو گجرات کی بغاوت فرو کرنے کے لیے بھیجنے کے بعد غیاث الدین بنگال کی سمت بڑھا تاکہ اسے بھی مطیع کیا جا سکے۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ اس کی کامیاب مہم کی واپسی پر ایک عمارت، جو اس کے بیٹے الغ خاں (محمد بن تغلق) نے اس کے استقبال کے لیے تعمیر کروائی تھی، گر گئی اور وہ اس میں دب کر مر گیا (1325)۔ جدید تحقیق اس بات سے متفق نہیں ہے کہ اس میں شہزادے کی سازش تھی یا بجلی کے اثر سے گری۔ عمارت کے گرنے کا سبب جلدی میں تعمیر کا ہونا اور پھر وہاں مقبوضہ ہاتھیوں کا دوڑانا تھا۔

(i) مسائل اور مختلف راہیں:

جیسا کہ پچھلے باب میں ذکر کیا گیا ہے غیاث الدین تغلق اور اس کے بیٹے اور جانشین، محمد بن تغلق نے علاء الدین کی دور دراز کے علاقوں پر قبضہ نہ کرنے کی پالیسی اور ان کی اطاعت اور سالانہ خراج کی ادائیگی پر اطمینان کو، مسترد کر دیا۔ برنی کہتا ہے کہ غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق دونوں بہت جاہ طلب تھے۔ محمد بن تغلق تو اس کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا کہ ہندوستان کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا بھی ایسا رہ جائے جس پر اس کا اختیار نہ ہو اور وہ اس کا مطیع نہ ہو۔ لہٰذا ان کے عہد میں دہلی کے براہ راست اختیار کو وارنگل (تلنگانہ)۔ مابار (کورومنڈل)۔ مدورائی (تامل ناڈو) اور ہندوستان کے جنوبی کنارے دوار سمدر (کرناٹک) تک پہنچا دیا۔ جب بھی کسی علاقے پر قبضہ کیا جاتا، محمد بن تغلق لگان کے محکمے کے افسران کا تقرر کر دیتا تاکہ وہ لگان کا حساب لگائیں۔ انہی کی مدد سے دور دراز کے صوبوں اور علاقوں کے حسابات کی جانچ وزیر کے دفتر میں ہوتی تھی "بالکل اسی طرح جس کی تفصیل دوآب کے گاؤں اور شہروں میں تھی۔" (برنی)

اتنی تیزی کے ساتھ براہ راست انتظام کے علاقوں کا پھیلاؤ اور اتنے بڑے پیمانے پر مرکزیت کی اپنی کچھ کمزوریاں بھی تھیں جن کا احساس محمد بن تغلق کو بعد میں ہوا۔

اس کے علاوہ دو اور پہلو ہیں جن کا تعلق ریاست کے مزاج سے ہے جن سے برنی اور دوسرے مورخین کو سروکار تھا۔ پہلا سوال عوام کی بہبودی کا تھا حالانکہ برنی علاء الدین کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ اس کی مارکیٹ کنٹرول اور اس کی ہندوؤں کی طاقت کو ختم کرنے کی پالیسی کو سراہتا ہے لیکن وہ اس کی 'خون خرابے' سخت اور ظالمانہ رویے، دوسروں پر سختیاں کر کے اپنے احکامات کی پیروی کروانے، کی پالیسی کی تنقید کرتا ہے۔ اس کے برخلاف وہ غیاث الدین تغلق کی تعریف کرتا ہے کہ اسے لوگوں کی بہبودی کا خیال تھا اور اس کی پالیسی ایسی معتدل تھی کہ لگان کے بوجھ سے ملک تباہ بھی نہ ہو اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ بھی نہ آنے پائے۔ ہندوؤں سے ٹیکس لیا جاتا تھا تاکہ وہ دولت کے نشے میں اندھے نہ ہوں جائیں اور اتنے بے چین نہ ہو جائیں کہ بغاوت پر آمادہ ہوں۔ دوسری طرف، نہ ہی وہ اتنے مفلس ہو جائیں کہ اپنی زراعت بھی نہ کر سکیں۔

ہم نے دیکھا کہ شاید پہلی مرتبہ زراعت اور دستکاری کی اہمیت پر ریاست نے توجہ کی اور اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ زراعت کو مسلسل وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا بہبودی اور انسانیت کی پالیسی جس کو جلال الدین خلجی نے پیش کیا تھا اسے دوبارہ سے موثر انداز سے نافذ کرانے کی کوشش غیاث الدین تغلق نے کی تھی۔ اس نے اس نرمی اور فیاضی کی پالیسی کو علاء الدین اور اس کے بیٹے قطب الدین کے دور کے اشراف خاندانوں تک وسیع کیا۔ ان میں سے کافی مفلسی اور کس مپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کو ملازمت اور اقطاع دیا گیا۔ لگان سے مبرا زمین جو علماء کو عرصۂ دراز سے ملی ہوئی تھیں ان میں سے کچھ کا تجزیہ کر کے ان کو کم کیا گیا جن لوگوں کو پہلے حکمراں سے کثیر رقم انعام میں ملی تھی ان کو حکم دیا گیا کہ اس کی جانچ کروائیں اور ان میں سے زیادہ تر کو مجبور کیا گیا کہ وہ رقوم کو واپس کریں۔

اس سوال سے متعلق کہ مذہب کا ریاست سے کیا رشتہ ہے، غیاث الدین تغلق نے جو بذات خود سخت مذہبی انسان تھا مذہبی امور یعنی پانچ وقت کی نماز، روزہ، جمعہ کی نماز کی ادائیگی وغیرہ کا پابند تھا شریعت کی محدود تشریح کو ماننے سے انکار کر دیا کہ ہندوؤں کو بے حرمت اور مفلس رکھا جائے۔ جیسا کہ کچھ علماء کی رائے تھی۔ محمد تغلق بھی شرعی اور یعنی نماز اور روزہ وغیرہ کا پابند تھا اور اس پر بھی سختی کرتا تھا کہ دوسرے لوگ بھی ان امور کی پابندی کریں۔ وہ ایک قابل شخص تھا اور

مختلف علوم کی واضح معلومات رکھتا تھا جیسے فلسفہ، حساب، طب اور مذہب وغیرہ۔ اس کو فارسی اور ہندی شاعری سے بھی دلچسپی تھی اور اس پر اس کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ برنی کی تنقید جس کو ہم ایک ستائش سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ایک "استدلال پسند" تھا یعنی وہ کسی بات کو بغیر ثبوت کے ماننے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جہاں مسلم عقائد کے ضروری اجزاء کو مسترد نہیں کرتا تھا وہیں وہ ایسی بہت سی روایات اور عملی کاموں کو محض اس بنیاد پر ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ وہ عقیدہ کی بنیاد ہیں۔ برنی محمد بن تغلق پر یہ الزام تراشی کرتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں رسول اللہ (نبوت) کی سنت کو اور سلطنت کو ملانا چاہتا تھا۔ یعنی وہ روحانیت اور سیاسی طاقتوں کو ملانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس الزام کی کوئی بنیاد نہیں ہے سوائے اس کے کہ محمد بن تغلق نے بہت سے علماء اور صوفیا کی روحانی طاقت کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ برنی تو علاء الدین خلجی پر بھی یہ الزام لگا چکا ہے کہ وہ ایک نیا دین شروع کرنا چاہتا تھا صرف اس وجہ سے کہ وہ آنکھیں بند کر کے شریعت کی سند یا اختیار کو ماننے کو تیار نہ تھا۔ حالانکہ محمد بن تغلق تصوف میں یقین نہیں رکھتا تھا لیکن وہ صوفیا کا احترام کرتا تھا۔ وہ پہلا سلطان تھا جس نے اجمیر میں معین الدین چشتی کے مزار پر حاضری دی۔ اس نے بہت سے صوفیاء کی قبور پر مقبرے تعمیر کروائے جن میں دہلی میں نظام الدین اولیاء کا مزار بھی شامل ہے۔

محمد تغلق اندھی تقلید کے بجائے ایک کھلا ہوا ذہن رکھتا تھا جو اس کے جوگیوں اور جین بھکتوں جیسے راج شیکھر اور جین پربھا سے تعلقات سے ظاہر ہوتا ہے۔ جب وہ گجرات میں تھا تو وہاں کے جین مندروں میں گیا اور ان کو عطیے بھی دیے۔ اس نے ہولی جیسے ہندو تہواروں سے بھی اپنا تعلق رکھا۔

برنی کی محمد بن تغلق کے کردار سے متعلق تنقید کو بھی یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے کردار میں تیزی اور جلد بازی تھی اور اسی کے ساتھ اسے اپنے فیصلوں پر بہت اعتماد تھا جس کی وجہ سے وہ دوسروں کے مشوروں کو ماننے کو تیار نہ تھا۔ لہٰذا اس کے بہت سے نئے کارنامے پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ تیار نہیں کیے گئے تھے یا ان پر بغیر کسی تیاری کے عمل کیا گیا۔ برنی اور مراقش کا سیاح، ابن بطوطہ بھی محمد بن تغلق کے بہت زیادہ نوازنے یا سزا دینے اور کم ذات اور چھوٹے خاندان والوں کو اعلیٰ منصب دینے کی بہت تنقید کرتے ہیں۔

(ii) تجربات اور اصلاحات:

وہ مسائل اور طریقۂ کار جن کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے ہمیں محمد بن تغلق کے بہت سے تجربات اور اصلاحات جو اس نے شروع کیے تھے انہیں سمجھنے میں مدد کریں گے، جن کے لیے وہ مشہور بھی ہے۔ محمد بن تغلق، انتظامیہ کو بہتر بنانے میں دلچسپی رکھتا تھا اور اس میں وہ یکسانیت پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس معاملے میں، ابن بطوطہ کے مطابق، اس نے بہت سے احکامات جاری کیے تھے۔ بہر حال ان میں سے صرف چند پر ہی مخصوص توجہ دی جاسکی یا ان کا کوئی اثر ہو سکا، ان کی فہرست برنی نے دی ہے۔ ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (الف) انتظامی اور سیاسی اقدامات (ب) معاشی اور زرعی اصلاحات۔ یہ حقیقت ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا اور دونوں کے درمیان کوئی ایک لائن نہیں کھینچی جاسکتی تھی۔

(الف) انتظامی اور سیاسی اقدامات: دیوگیری کو کوچ۔

ان اقدامات میں سے جو محمد بن تغلق نے اپنے عہد کے ابتدائی دور میں اٹھائے، سب سے زیادہ متنازعہ فیصلہ محمد بن تغلق کا اپنی راجدھانی کا نام نہاد تبادلہ دیوگیری میں کرنے کا تھا جس کا نام دولت آباد رکھا گیا تھا اور سلطان کا یہ حکم کہ دہلی کے تمام لوگ نئی راجدھانی چلے جائیں۔ اس دور کے ماخذ اور بعد کے ماخذ کے بغور مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ برنی نے اس واقعہ کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ جب وہ یہ الزام لگاتا ہے کہ اس فیصلہ سے دہلی برباد ہو گئی جو اس وقت تک اسلامی دنیا کے مشہور شہروں مصر اور بغداد کے ہم پلہ تھی۔ کچھ اور **لوگوں کی رائے** سے کہ چونکہ دہلی کے لوگوں کا رویہ محمد بن تغلق کے ساتھ مخالفانہ ہو گیا تھا لہٰذا ان **کو سزا دینے** کے لیے اس نے یہ قدم اٹھایا۔ بہر حال، ایسے شواہد موجود ہیں جن کی بنیاد پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ قدم سزا کے طور پر نہیں تھا بلکہ بہت ہی سوچا سمجھا فیصلہ تھا اور اچھی طرح ترتیب دیا گیا تھا۔

سلطان کے ذریعہ اٹھائے گئے اس قدم کا مقصد خود برنی نے ہی واضح کر دیا۔ یعنی یہ مقام پوری حکومت کے مرکز میں تھا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ غیاث الدین اور محمد بن تغلق کے ابتدائی دور میں دہلی کی براہ راست حکومت جنوبی ریاستوں پر قائم کر دی گئی تھی۔ علاء الدین کے

عہد سے ہی دیوگیری ایک ایسا مقام بن چکی تھی جہاں سے دکن کی تمام مہمات شروع ہوتی تھیں۔ محمد بن تغلق نے کافی عرصہ جنوب میں گزارا تھا۔ مختلف مہمات میں بحیثیت شہزادہ اور حکمراں وہ دیوگیری کے قرب وجوار سے خوب واقف تھا۔ پہاڑیوں سے چاروں طرف سے گھرے ہونے کی وجہ سے جس کی آب وہوا بہت خوشگوار تھی، وہ دوسری راجدھانی جنوب میں قائم کرنا چاہتا تھا تاکہ وہاں سے اسے آسانی سے کنٹرول کرسکے۔ 17ویں صدی کے مورخ فرشتہ کے مطابق کچھ مشیروں نے اس کام کے لیے اجین جو مالوا میں ہے تجویز کیا تھا جس کو راجہ وکرمادتیہ نے اسی بنیاد پر اپنا مرکز بنایا تھا لیکن سلطان نے دیوگیری کو بہتر سمجھا کیونکہ ایک تو وہ اس سے واقف تھا اور دوسرے وہ اس وقت ہندوستان کے بڑے شہروں میں تھا۔

دیوگیری کو دوسری راجدھانی بنانے کا فیصلہ 1327 میں کیا جاچکا تھا جب محمد بن تغلق اپنے چچازاد بھائی گرشاسپ کی بغاوت کو کچلنے کے لیے کرناٹک جاتے ہوئے دیوگیری سے گزرا تھا۔ اس فیصلہ کی تیاری میں اس نے سڑک کے دونوں طرف پیڑ لگوائے اور ہر دو میل (ایک کروہ) پر قیام گاہیں تعمیر کروائیں۔ ان قیام گاہوں میں مسافروں کے لیے کھانے اور پینے کا پانی کا انتظام تھا۔ زمین دی گئی کہ جن کے لگان سے ان میں کام کرنے والوں کو تنخواہ دی جاسکے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہر قیام گاہ پر ایک صوفی کا قیام تھا اور وہاں ان کی خانقاہ تعمیر کردی گئی تھی۔ اس کے کچھ دن بعد ہی سلطان کی والدہ کو دیوگیری یا دولت آباد بھیج دیا گیا۔ سلطان کی ماں کے ساتھ بہت سے امراء شہر کے خاص اشخاص، محل کا تمام شاہی اسباب جس میں غلام، نوکر اور شاہی خزانہ شامل تھا، روانہ کیا گیا۔ کچھ عرصے بعد سلطان نے دہلی کے تمام صوفیاء، علما اور بڑے امراء کو بلا لیا۔ یہ واقعہ 29-1328 میں ہوا۔

یہ واضح ہے کہ دہلی کی تمام آبادی کو جانے کے لیے نہیں کہا گیا تھا۔ بہرحال ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں پر جانے کے لیے کافی سختی کی گئی تھی یہاں تک کہ اس مقصد کے لیے شاہی نوکر گھروں کی تلاشی لے رہے تھے۔ جو دولت آباد جارہے تھے ان کو آسانی کے لیے مختلف کاروانوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ سفر کافی طویل تھا اور سخت گرمی میں کیا گیا تھا جس کے نتیجہ میں کافی لوگ راستہ میں ہی مر گئے تھے۔ دولت آباد میں پہنچنے والے لوگوں کا بہت شاندار طریقے سے استقبال

کیا گیا۔ شہر کو محلوں میں تقسیم کیا گیا جہاں عمدہ مکانات تھے جو فوجیوں، امراء، سرکاری نوکروں، قاضیوں اور عالموں، تاجروں اور صنعت کاروں میں علیحدہ علیحدہ تقسیم کر دیے گئے تھے۔ ہر محلہ میں مساجد، بازار اور عوامی حمام تعمیر کروائے گئے۔ سلطان نے ان لوگوں کے مکانات وغیرہ خرید لیے جو دہلی سے منتقل ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ حکومت ان کی جائداد کو خرید لے۔ دہلی سے چلتے وقت اور دولت آباد پہنچنے پر بھی لوگوں کو خوب عطیات دیے گئے اور یہاں انہیں مفت رہائشی انتظام مہیا کیا گیا۔

اس کے باوجود زیادہ مہاجر خوش نہیں تھے۔ وہ دہلی میں رہنے کے عادی ہو چکے تھے اور زیادہ تر وہاں سو سال سے زیادہ عرصے سے سکونت پذیر تھے اور اسی کو اپنا گھر سمجھتے تھے۔ بہت سے ترکوں کو ہندوستان سے محبت اور جذباتی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا جیسا کہ شاعر امیر خسرو کی شاعری سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے لیے دولت آباد ایک انجان جگہ تھی جہاں ہندو ہی ہندو تھے۔

اسی دوران، دہلی اجڑی نہیں تھی۔ سکے دہلی میں ہی ڈھلتے تھے۔ سنسکرت کے دو کتبات باولیوں (وہ کنویں جن میں زینہ ہوتا تھا) میں ملے جو اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ باولیاں دہلی کے کچھ دولت مند ہندوؤں نے بنوائی تھیں۔ لیکن، جیسا کہ ہمیں بتایا گیا ہے بہت سے مکانات بند کر دیے گئے تھے جن کو شہر کے بدمعاشوں نے لوٹنا شروع کر دیا۔ لہٰذا محمد بن تغلق نے دہلی کے قرب وجوار میں رہنے والے صوفیوں اور علماء اور دیگر افراد کو دہلی میں بسنے کی دعوت دی۔ 1334 میں جب ابن بطوطہ دہلی آیا تو دہلی پوری طرح آباد تھی۔ راجدھانی کا دہلی سے تبدیل ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ البتہ دولت آباد دوسری راجدھانی بن گیا۔ جو سکے دولت آباد میں ڈھالے گئے وہ اس بات کا ثبوت ہیں بہر حال سلطان کے اولوالعزم منصوبے نے جلد ہی تباہی کا سامان مہیا کر دیا۔ (1334-35) مابار (جدید کورومنڈل جو تامل ناڈو میں ہے) میں بہت سخت بغاوت ہوئی۔ سلطان جنوب کی سمت چلا تا کہ بغاوت کو دبا سکے۔ جب وہ بیدر میں ہی تھا تو پلیگ پھیلا جس کے نتیجے میں اس کے بہت سے فوجی ختم ہو گئے۔ محمد بن تغلق خود بیمار ہو گیا اور واپس دولت آباد آ گیا۔ سلطان کی موت کی افواہ پھیل گئی اور جلد ہی پورا جنوب، جن میں مابار، دوار سمدر (کرناٹک) اور وارنگل (تلنگانہ) شامل تھے دہلی سلطنت کے قبضہ سے نکل گئے۔ لہٰذا دولت آباد کو دوسری راجدھانی کا بنانے سوال ہی ختم ہو گیا۔ تقریباً اسی دوران یعنی (1335-37) ہی سلطان نے لوگوں کو دولت

آباد سے دہلی لوٹنے کی اجازت دے دی۔

لہٰذا دولت آباد کا کوچ بہت ہی مہنگی ناکامی ثابت ہوا اور لوگوں کے لیے بہت دشواریاں لایا۔ بہر حال اس کے اثرات سے دہلی کے عوام کے بجائے بڑے طبقے سے تعلق رکھنے والے زیادہ متاثر ہوئے۔ یہ بات واضح نہیں کہ محمد بن تغلق نے صوفیاء علماء اور دوسرے دانشمندوں کو دولت آباد جانے کے لیے کیوں کہا۔ شاید اس نے یہ محسوس کیا ہو کہ وہ یا اس کی حکومت صوفیا اور علماء کی موجودگی کے بغیر کام نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے اس کا یہ خیال بھی ہو کہ اپنی ذاتی مثالوں کے ذریعہ یہ صوفی اور علماء دینِ اسلام کی اشاعت کریں گے اور اس طرح سلطان کی حیثیت اور اقتدار زیادہ مضبوط ہوگا۔ اس کا کچھ بھی مقصد رہا ہو محمد بن تغلق کی دولت آباد کے کوچ کا ایک دیرپا اثر یہ ضرور ہوا کہ بہت سے علماء اور صوفیا نے دولت آباد میں ہی قیام کرنا پسند کیا تاکہ آئندہ دولت آباد اسلامی تعلیمات کا ایک مرکز بن جائے لیکن اس کا فائدہ دہلی کے سلاطین کو نہیں پہنچا بلکہ بھمنی حکمرانوں کو پہنچا جنھوں نے اس کے فوراً بعد اس علاقے پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔

خراسان اور قراچیل کی مہمیں:

اگرچہ خراسان اور قراچیل کی مہموں اور محمد بن تغلق کا ایک بڑی فوج کو تیار کرنے کا ذکر برنی نے علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے، ہم دونوں کو ایک ساتھ لے سکتے ہیں اس لیے کہ ان دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

خراسان کی مہم مرکزی اور مغربی ایشیا میں ہونے والے واقعات سے جڑی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ہی محمد بن تغلق کی اس خواہش کے ساتھ بھی کہ سندھ اور پنجاب کو منگولوں کے بار بار حملوں سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کیا جائے۔ چنگیز خاں کی موت کے بعد، اس کے ورثاء کی ایک شاخ، چغتائی شاخ کا اثر ترکستان اور ماوراء النہر پر تھا جب کہ دوسری شاخ، جس کا سردار ہلاکو تھا اس نے ایران اور عراق وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ غور، غزنی، افغانستان وغیرہ جہاں سے ہندوستان کا راستہ تھا، دونوں کے درمیان جھگڑے کی جڑ تھے۔ بہر حال دونوں شاخیں اس وقت زوال کی طرف مائل تھیں۔ ترماشرین کی موت کے بعد ماوراء النہر کے حالات غیر یقینی تھے جس کے 27-1326 میں ہندوستان پر حملوں کے بارے میں پہلے بتایا جا چکا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ محمد بن تغلق چنگیز خاں

کے ورثا کو نکال باہر کرنا چاہتا تھا۔ خراسان کو یونہی اس علاقے کی نشاندہی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور برنی اس میں عراق اور کبھی کبھی ماوراء النہر بھی شامل کر لیتا تھا۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے محمد بن تغلق نے اس علاقے کے نمایاں اور بڑے سرداروں کو بلایا اور ان کو قیمتی عطیات دیے۔ اس کے ساتھ 370,000 سپاہیوں کی ایک بڑی فوج بھی تیار کی۔ ان کی تنخواہ اقطاع سے ادا کی، لیکن برنی کا کہنا ہے کہ گھوڑوں کی قسموں کو طے کرنے، یا فوجیوں کے وضاحت یا ان کی مہارت کی جانچ پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ ایک سال تک ان کو بے کار ہی رکھا پھر ان کو نکال دیا گیا کیونکہ ان کو تنخواہ دینا ممکن نہیں تھا۔

فوج میں اتنی تیزی سے اضافہ اور اس کی ماہیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس کا مقصد کسی بڑی مہم کی سرکردگی نہ تھا بلکہ سلطان کا صرف کابل، غزنی وغیرہ پر اپنا اختیار رکھنے کے لیے تھا۔ محمد بن تغلق کی اس علاقے میں دلچسپی اس حقیقت سے واضح ہوتی ہے کہ ترماشرین کے حملے (27-1326) کی ناکامی کے بعد وہ لگاتار روپیہ غزنی کی حکومت کو بھیجتا ہے اور وہاں کے قاضی کو تو اپنے ہی ماتحت کر لیتا ہے جس امر کی برنی مذمت کرتا ہے۔ بہر حال اتنی چھوٹی مہم کے لیے بھی حالات سازگار نہیں تھے اسی لیے اس مہم کو ترک کرنا پڑا۔

قراچیل کی مہم (1333) کو خراسان کی مہم کے فوراً بعد شروع کیا گیا۔ اس مہم کا نشانہ ہماچل میں واقع کلو اور کانگڑہ کا علاقہ تھا۔ بہر حال برنی اس کو غلطی سے خراسان کی مہم کے ساتھ شامل کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی فتح گھوڑوں کو پکڑنے (ترکستان سے) میں مددگار ثابت ہوتی اور ماوراء النہر کو ایک آسان راستہ ملتا۔ بعد کے کچھ مورخین جیسے بدایونی اور فرشتہ اس کو چین اور ہماچل کی مہم بتاتے ہیں۔ عہد وسطی میں جغرافیہ کا علم نہ ہونے کے برابر تھا اور یہ مورخین یہ سمجھتے تھے کہ خطائی اور قدیم چین ہمالیہ کو پار کرنے کے فوراً بعد تھا۔ جیسا کہ صاف تھا یہ مہم ناکام ثابت ہوئی۔ دہلی کی فوج کا سردار پہاڑیوں میں اتنے اندر چلا گیا جس کے نتیجے میں اس کی واپسی کا راستہ محافظ فوج نے کاٹ دیا اور تقریباً 10 ہزار کی فوج پوری طرح تباہ ہو گئی۔ بہر حال یہ مہم پوری طرح ناکام نہیں رہی کیونکہ کچھ ہی عرصے بعد اس علاقے کے حکمراں نے محمد بن تغلق سے صلح کر لی اور وہ پہاڑیوں کے نیچے کی ہموار زمین کے استعمال پر بھی کچھ نقد رقم دینے کو تیار ہو گیا اور اس نے

-1-

دسویں اور بارہویں صدی کے دوران مغربی اور وسطیٰ ایشیا اور ہندوستان کی سمت ترکوں کی پیش رفت

مغربی اور وسطی ایشیا ہندوستان سے ایک ایسے پہاڑی سلسلے کے ذریعہ ملے ہوئے ہیں جو ہندوستان کی حدود کو مغربی اور وسطی ایشیا سے علیحدہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ پہاڑی سلسلے شمال میں ہمالیہ کی طرح ناقابل عبور بھی نہیں ہیں۔ نتیجہ کے طور پر ہندوستان میں پنجاب سے بنگال کی مشرقی سرحد تک پھیلے ہوئے زرخیز میدان، پھلتے پھولتے شہر اور بندرگاہیں، محنت کش کسان، ماہر کاریگروں، تجربہ کار تاجروں اور سرمایہ داروں وغیرہ کے ذریعہ پیدا کی گئی بے انتہا دولت کی کشش سے صحرا نورد خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش جتھے ان پہاڑی راستوں سے ہندوستان میں داخل ہونے کی مسلسل کوشش کرتے رہے ہیں۔

اسلام کے عروج اور مغربی ایشیا اور ایران میں اس کی فتح نے خراسان اور دریائے سیر اور آمو کے درمیان مغربی ایشیا کے زرخیز علاقے ماوراءالنہر میں اس کی دھیمی توسیع نے اس علاقے میں ہندوستان کے ثقافتی اور سیاسی اثر کو جو کہ زیادہ تر بدھ مذہب کے زیر اثر تھا محدود کر دیا۔ اس نے ہندوستان کی چین اور مغربی ایشیا کے ساتھ بری تجارت کو بھی بری طرح متاثر کیا۔ کچھ عرصے کے لیے مغربی ہندوستان کی بندرگاہوں سے ہونے والی تجارت بھی متاثر ہوئی۔ حالانکہ جلد ہی اس رجحان کو عربوں کے بحری تاجروں کے عروج نے مسترد کر دیا جنہوں نے ہندوستان کی مغربی ایشیا اور جنوبی مشرقی ایشیائی ممالک اور چین کے درمیان بحری تجارت کو بحال کیا۔ اور اسے مضبوط کیا۔ یہ یقین کرنا بے بنیاد ہے کہ ہندوستانی تاجر بحری تجارت سے علیحدہ کر دیئے گئے یا انھوں نے اپنے

سلطان کی فرماں روائی کو بھی مان لیا۔

(ب) معاشی اور زرعی اصلاحات:

علامتی سکہ: محمد بن تغلق کا مدعا یہ تھا کہ وہ سکوں میں بھی اصلاح کرے اور جدید مورخ ایشوری پرشاد کے مطابق، سلطنت کے مختلف مضروب خانوں سے، مختلف قسم کے سکے جاری کیے گئے۔ ان کے ڈیزائن اور خوبصورتی اور ان کی ہیئت کا جواب نہ تھا۔ ایک تجربہ جو محمد بن تغلق نے دیوگیر کے کوچ کے بعد کیا (30-1329) وہ علامتی سکے کا تھا جس کو بہت کم سمجھا گیا اور اس کی مذمت بہت زیادہ ہوئی۔

اس نے تانبے اور پیتل کے سکے جاری کیے ان کو سونے اور چاندی کے سکوں کے برابر ہی تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ جدید دنیا میں علامتی سکوں کا علم سب کو ہے لیکن عہد وسطی میں یہ ایک انوکھی بات تھی۔ بہر حال یہ کوئی ایسی نئی چیز نہ تھی۔ چین میں کاغذ کے نوٹ عام تھے۔ مغل حکمراں، کل بلائی خاں نے اپنی حکومت کے پہلے سال 1260 میں کاغذ کے نوٹ جاری کیے جس کو چاؤ (چھن) کہتے تھے جو اس کے پورے عہد یعنی 1294 میں اس کی وفات تک چلے۔ تمام لوگ معہ بیرونی تجاروں کے، اس کو لیتے تھے۔ یہ حقیقت عام طور پر واضح تھی۔ اس کا ذکر برنی نے بھی محمد بن تغلق کے عملی اقدام[1] کی وضاحت کے سلسلے میں کیا ہے۔ بعد میں 1294 میں ایران کے ایک شاہ، تے کاتو نے بھی کاغذ کے چن کو اپنی مملکت میں جاری کیا لیکن اس کی وجہ سے سخت ہنگامہ ہوا جس کے نتیجے میں آٹھ دن کے اندر ہی ان کو ختم کرنا پڑا۔

سلطان کے علامتی سکے جاری کرنے کے مقصد کے سلسلے میں کافی اختلاف ہے۔ برنی کے مطابق یہ اس کا ایک بڑا ہی جرأت مندانہ قدم تھا کہ وہ دنیا کے مختلف علاقوں کو فتح کرے، جس کے لیے ایک بہت بڑی فوج کی ضرورت تھی اور ایک کثیر خزانہ درکار تھا۔ لیکن برنی خود ہی اپنے بیان کی تردید کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ سلطان نے بے حد خرچہ کر کے اور لوگوں کو انعامات اور تحائف دے کر خزانہ خالی کر دیا تھا۔ بہر حال اس قدم کی وجہ سونے اور چاندی کی کمی نہیں تھی کیونکہ جب یہ تجربہ ناکام ہو گیا تو سلطان نے علامتی سکے واپس لے کر اس کے عوض سونے اور چاندی کے سکے ادا کر دیے۔

---

(1) اس کا حوالہ برنی کے تاریخ فیروز شاہی کے رام پور کے نسخہ سے لیا گیا ہے۔ دوسرا ایڈیشن جو مشہور ہو گیا اس میں اس کا حوالہ نہیں ہے۔

یہ تجربہ اس وجہ سے ناکام ہوا کیونکہ سلطان جعلی سکوں کی ڈھلائی کو نہیں روک سکا۔ برنی اپنے خوش بیان انداز میں کہتا ہے کہ "ہر ہندو کا گھر ایک ڈھلائی خانہ بن گیا۔" شاید اس کا مقصد یہ تھا کہ سنار جو ہندو تھے وہ اس فن سے واقف تھے کہ تانبہ کی بھرت اور پیتل کے سکّے کیسے بنائے جاسکتے ہیں اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔ حکومت کو اس کی وجہ سے بہت نقصان ہوا کیونکہ دیہی علاقوں میں خوط اور مقدموں نے لگان کی ادائیگی تانبے اور پیتل کے سکوں میں کی اور انہی سکوں سے ہتھیار اور گھوڑے خریدے۔ جلد ہی نئے سکّے اتنی کثیر تعداد میں آگئے جس کی وجہ سے ان کی قیمت بہت تیزی سے گر گئی اور ان کی حیثیت "پتھر اور مٹی کی ٹھیکروں" جیسی ہو گئی۔ بیوپار اور تجارت بگڑنا شروع ہو گئی۔ لہٰذا غصہ میں محمد بن تغلق نے اپنے حکم کو مسترد کر دیا اور علامتی سکوں کو سونے اور چاندی کے سکوں سے بدل دیا۔ یہ صرف ان ہی سکوں کے لیے کیا جاسکتا تھا جو شاہی ڈھلائی خانوں سے جاری ہوئے تھے۔ علامتی سکّے جن کو محمد بن تغلق نے جاری کیا تھا وہ پیتل اور تانبے کے تھے۔ پہلے سلاطین میں سے کسی نے بھی پیتل کے سکّے جاری نہیں کیے تھے جو تانبہ، ٹن اور جست کی ایک بھرت ہوتی ہے۔ ایک اہم جدید مورخ، پروفیسر محمد حبیب کے مطابق محمد بن تغلق نے کانسے کے سکّے جاری کیے جس پر عربی اور فارسی میں تحریر تھی جو نئے سکوں کی پہچان تھی۔ انتشار تو علیحدہ رہا عام لوگ ان سکوں اور جعلی سکوں میں شناخت پیدا نہ کرسکے۔ جعلی سکّے، جو لوگ تبدیل کرنے لائے تھے اور حکومت نے ان کو بدلنے سے انکار کر دیا تھا کافی عرصے تک قلعہ کے سامنے ڈھیر کی شکل میں پڑے رہے۔

اگر یہ تجربہ کامیاب رہتا تو ہندوستان کے کاروبار اور تجارت کو بہت وسعت ملتی کیونکہ تمام دنیا میں اس وقت چاندی کی کمی تھی۔ یہ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد بن تغلق نے اپنے ابتدائی دور میں ٹنکے میں چاندی کا حجم 178 سے گھٹا کر 140 رتی کر دیا تھا۔ علامتی سکّے کی ناکامی نے یقیناً شاہی خزانے کو بری طرح متاثر کیا ہوگا۔ لیکن یہ اتنا سنگین مسئلہ نہ تھا جس سے عام زندگی تتر بتر ہو جاتی۔ ان کو 1333 میں جاری کرنے کے تین سال بعد ترک کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا 732 ہجری یا 33-1332 کے بعد یہ علامتی سکّے نہیں ملتے۔ علامتی سکوں کا کوئی ذکر ابن بطوطہ نہیں کرتا جو 1334 میں دہلی آیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان واقعات کو بہت تیزی سے بھلا دیا گیا۔

زرعی اصلاحات:

ان تین تجربات کی ناکامی ' دیوگیری کو کوچ ' خراسان مہم کی ناکامی اور علامتی سکوں کا ترک کرنا اور اس کے ساتھ یہ قراچیل مہم کے تباہ کن نتائج ' نے سلطان کے بارے میں عوام کی رائے کو ضرور متاثر کیا ہوگا اور اس کے ساتھ ہی اس کے خزانے کو بھی۔ بہر حال سلطنت کے وسائل ابھی بہت زیادہ تھے اور خزانے کے نقصان کا بھی جلد اعادہ کر لیا گیا ہوگا۔ لیکن اس کے نتیجہ میں لگان کے لئے زمین کے بڑے بڑے علاقوں کو دینے کے طریقہ کو بڑھاوا ملا ہوگا جس کی طرف ہم بعد میں توجہ دیں گے۔

اسی دوران محمد بن تغلق کی زرعی اصلاحات ' وبائی بیماریاں ' قحط جب چھ سے سات سال تک چلا اور دو آب اور مالوا کے بڑے علاقوں کو متاثر کیا جس کی وجہ سے عوام میں سخت بے چینی اور کسانوں میں بڑے پیانے پر بغاوت پیدا ہوئی۔

ہمیں بتایا گیا ہے کہ غیاث الدین نے علاؤالدین کے کھیتوں کے ناپنے کے نظام کو پیداوار بانٹنے سے تبدیل کر دیا تھا۔ یہ کسانوں کے حق میں تھا کیونکہ اس سے کسانوں کو فصل کی مکمل یا کسی حد تک تباہی کی صورت میں راحت ملتی تھی۔ برنی کے مطابق سلطان کی پالیسی کے مطابق لگان کی وصولیابی میں اضافہ ایک رفتار سے ہونا چاہئے جس سے کسانوں کی خوشحالی پر کوئی اثر نہ پڑے۔ افسران کو ہدایت جاری کی گئیں کہ وہ یہ دیکھیں کہ ہر سال پیداوار میں اضافہ ہو اور اسی کے حساب سے لگان بھی بڑھایا جائے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس نے کسانوں سے کتنا وصول کیا لیکن اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اس نے لگان کو گھٹا کر پانچواں حصہ (5-1) کر دیا ہو ' جیسا کہ کچھ مورخین بتاتے ہیں۔

جب محمد بن تغلق تخت پر بیٹھا تو اس نے کسانوں سے لئے جانے والے لگان کو کچھ بڑھانے کی کوشش کی۔ برنی کا کہنا ہے کہ اس نے اس کو "ایک سے دس یا ایک سے بیس تک" بڑھا دیا۔ یہ صرف زبانی اعداد ہیں ان کو اصل معنوں میں اس طرح نہیں لیا جا سکتا کہ اضافہ دس سے بیس گنا تھا یا دس یا بیس میں سے ایک یعنی دس سے پانچ فیصدی تھا۔ برنی "ایک سے سو" یا "ایک سے ہزار" الفاظ کا استعمال معقول اضافے کو بتانے کے لئے کرتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ نئے ٹیکس

لگائے گئے اور پرانے ٹیکس، چرائی ٹیکس اور گھرہی (ہاؤس) ٹیکس سختی کے ساتھ وصول کیے گئے۔ جانوروں کو داغا گیا اور مکانوں کو شمار کیا گیا۔ خرابی یہ تھی کہ جب زمین کی پیداوار کا تخمینہ کیا گیا تو جو اصل پیداوار ہے اس کے بجائے جو ہونی چاہیئے اس کو درج کیا جاتا، اس کے علاوہ جب حکومت کے حصہ کو نقدی میں تبدیل کیا جاتا تو غلہ کی اس وقت کی قیمت کے بجائے جو سرکاری قیمت طے ہوتی اس کے مطابق ہی طے کیا جاتا۔

یہ اقدامات، جیسا کے ہمیں بتایا گیا ہے "کسانوں کی تباہی کا باعث بنے اور کسانوں نے بغاوت کی جس نے دہلی اور دو آب کے ایک بڑے علاقہ کو متاثر کیا۔ برنی کا کہنا ہے کہ ہندوؤں یعنی کسانوں نے اناج کے انباروں میں آگ لگادی اور اپنے مویشی باہر نکال دیئے لہذا "تمام علاقے تباہ ہو گئے۔ کاشتکاری بالکل ختم ہو گئی" سلطان نے بغاوت کو فرو کرنے کے لئے ویسے ہی اقدامات اٹھائے لہذا شقداروں اور فوجداروں کو حکم دیا کہ وہ ملک کو لوٹ لیں اور تباہ کر دیں۔ اس کے نتیجہ میں بہت سے خوط اور مقدم مارے گئے یا انھوں نے جنگلوں میں جا کر پناہ لی۔ سلطان کی فوج نے جنگل کو گھیر لیا اور جو ملا اس کو قتل کر دیا۔ لہذا پورا علاقہ قنوج سے دلماؤ تک یکسر تباہ ہو گیا۔

اس بغاوت کی حد اور وسعت کی بھی وضاحت کی ضرورت ہے کیونکہ ہمیں یاد ہے کہ علاؤالدین نے دو آب میں لگان کو آدھے تک بڑھادیا تھا جس میں خوط اور مقدم کو کوئی مراعات نہیں دی گئی تھیں اور پیمائش پر زور دیا گیا تھا جس سے کسانوں کو بارش کم ہونے یا بالکل نہ ہونے کی صورت میں نقصان ہوتا۔ پھر بھی خوط، اور مقدم اور کاشتکاروں نے بغاوت نہیں کی علاؤالدین کی سخت سزائیں بھی اس کا جواب نہیں ہیں کیونکہ محمد بن تغلق بھی ان معاملات میں کم درشت نہیں تھا۔ اگر ہم یہ تصور بھی کر لیں کہ برنی نے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہوگا جیسا کے وہ اکثر کرتا تھا، تب بھی اتنے بڑے پیمانے پر کسانوں کی بغاوت کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ محمد بن تغلق نے بظاہر لگان کو آدھے سے زیادہ بڑھادیا تھا جیسا کے علاءالدین نے کیا تھا۔ اگر ایسا تھا، تو برنی، جو محمد بن تغلق کی تنقید کرتا تھا، یہ ضرور کہتا۔ ایک ممکن تشریح یہ ہو سکتی ہے علاءالدین کے برخلاف محمد بن تغلق لگان کے افسران پر ایک مضبوط پکڑ نہ رکھ سکا لہذا لگان کے نام پر پیداوار سے سرکار کی طرف سے طے شدہ قیمت کی وصولیابی کے لئے ان میں سے بہت سے

افسران نے بہت سختیاں کی ہوں گی۔ برنی کہتا ہے کہ جب دور دراز کے کسانوں نے ان کسانوں کی تباہی کے بارے میں سنا تو اس ڈر سے ان پر بھی ان قوانین کا اطلاق کیا جائے گا، انھوں نے بغاوت کر دی۔ بہر حال اس بیان پر مبالغہ ہو سکتا ہے کیونکہ ہم نے یہ نہیں سنا کہ دو آب سے باہر بھی بغاوت پھیلی تھی۔

برنی کہتا ہے کہ دو آب میں زراعت کا بند ہونا' وہاں کے کسانوں کی تباہی' بنجاروں کی تعداد میں کمی ہونے سے اناج کے دہلی تک نہ پہنچنے کی وجہ سے قحط ہو گیا۔ بر سات بھی نہیں ہوئی لہذا اناج کی قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔

قحط سے نپٹنے کے لیے دہلی میں امدادی کیمپ کھول دیئے گئے۔ اودھ سے اناج منگایا گیا جہاں قحط نہیں تھا۔ محمد بن تغلق نے کنوئیں کھودنے' بیج خریدنے اور پھر سے کھیتی شروع کرنے کے لئے زراعتی قرضے دینے شروع کیے۔

ایسا لگتا ہے کہ قحط 1335-1334 میں شروع ہوا اور سات سال تک چلا۔ اس زمانے میں محمد بن تغلق نے یہ محسوس کیا کہ دہلی کی آب و ہوا وبائی ہو گئی ہے اس لئے پورا شاہی کیمپ 80 کلومیٹر دور گنگا کے کنارے لگایا گیا۔ اس مقام کا نام سورگ دوار (جنت کا راستہ) تھا۔ سلطان نے یہاں دو سال قیام کیا۔ اس کے لئے اناج اودھ سے آتا تھا۔ دہلی کے خاص لوگ بھی اس علاقہ میں چلے گئے جہاں قحط نہ تھا۔

سورگ دوار سے واپسی پر محمد بن تغلق نے زراعت کو بڑھانے اور بہتر بنانے کا ایک بڑا منصوبہ بنایا۔ اس نے ایک دیوان جس کا نام 'دیوانِ امیر کوہی' تھا۔ قائم کیا اور اس کے تحت 100 کلو میٹر ضرب 100 کلو میٹر کا علاقہ دیا گیا۔ اس نے علاقے میں زراعت کو بڑھانے کا منصوبہ بنایا تاکہ زمین کا ایک ٹکڑا بھی کاشت کے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کا مقصد بنجر زمین کو زیرِ کاشت لانا تھا نہ کہ اوسری زمین کو جیسا کہ برنی پرزور الفاظ میں کہتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جو کچھ بھی کاشت ہو گی اس کو بہتر بنایا جائے گا۔ برنی کے مطابق "جو کی جگہ گیہوں اور گیہوں کی جگہ گنا" بویا گیا اور "گنے کی جگہ انگور اور کھجور کے پودے لگائے گئے۔"

لہذا اس اسکیم کے دو پہلو تھے ایک تو زراعت کو بڑھانا اور دوسرے فصلوں کو بہتر بنانا۔

دونوں زیادہ لگان وصول کرنے میں معاون ہوئے ہونگے۔ اس اسکیم کے نفاذ کے لیے 100 شقداروں کا تقرر کیا گیا۔ ان کو اعزاز دیا گیا، گھوڑے دیے گئے اور کثیر رقم دی گئی تاکہ وہ زراعت کے لیے قرضہ دے سکیں، ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس طرح 70 لاکھ ٹنکے سے زیادہ زراعتی قرضہ (سوندھر) کے لیے دیئے گئے۔ عفیف، جس نے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں لکھا اس رقم کو اور زیادہ لکھتا ہے یعنی دو کروڑ۔

برنی کہتا ہے کہ یہ پوری اسکیم ناکام ہو گئی اور تین سال کہ عرصہ میں نہ تو ہزارواں یا سوواں حصہ بنجر زمین کا، زیر کاشت لایا جاسکا۔ وہ اس کا ذمہ داران لوگوں کو ٹھہراتا ہے جن کا انتخاب اس کام کے لیے کیا گیا تھا اور وہ بالکل ناکارہ ثابت ہوئے۔ وہ ان کو "لالچی، قلاش لوگ، جن کو نجات کی کوئی امید نہ تھی" کہتا ہے۔ بظاہر ان کو مقامی حالات کی کوئی سمجھ نہ تھی اور جو رقم انھوں نے قرض کے طور پر لی تھی وہ اپنے اخراجات اور ضرورتوں پر خرچ کر ڈالی۔

اگر محمد بن تغلق گجرات کی بغاوت کو فرو کرنے کے بعد اپنی مہم سے واپس آجاتا تو اِن لوگوں کو بہت مہنگی قیمت چکانا پڑتی۔ بہر حال محمد بن تغلق مر گیا اور اس کے فیروز تغلق نے وہ تمام قرضے معاف کر دیئے۔

بہر حال، اس اسکیم کو پوری طرح ناکام بھی نہیں کہا جاسکتا۔ کسانوں کو قرضے دے کر زراعت کی توسیع کرنا اور بہتر کرنے کا خیال بعد کے سلاطین کے لیے ایک خاص پالیسی بن گیا اور مغلوں کے لیے تو زراعتی پالیسی کا اہم حصہ بن گئی۔ لہٰذا اعلاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق نے زراعتی پالیسی کی احیاء میں مدد کی جو مغلوں کے دور میں اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

(iii) بغاوتیں اور حکمراں طبقے میں تبدیلیاں:

ایک ایسے حکمراں کی تصویر پیش کرنے کے لیے جو الجھے ذہن کا ہو، ایک منصوبہ کے بعد دوسرے منصوبہ پر جاتا ہو جس کے نتیجے میں خزانہ خالی ہو جائے اور بے چینی اور بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو جائے جن کو قابو میں کرنا سلطان کے بس میں نہ رہے۔ برنی نے ان تمام بغاوتوں کو یکجا کر دیا جو محمد بن تغلق کی ایک وسیع سلطنت میں 26 سال کے عرصے میں ہوئیں۔ بہر حال محمد بن تغلق کی کامیابیاں اور ناکامیوں کا تجزیہ کرنے کے لیے ہم اس کے عہد کو تین حصوں میں تقسیم

کرسکتے ہیں۔ پہلے دو حصے دس سال کے برابر برابر حصوں میں اور تیسرا دور اس کے عہد کے باقی پانچ یا چھ سال کا عہد۔

پہلے دور میں (35-1324) محمد بن تغلق اس وسیع حکومت کو مستحکم کرنے میں لگا رہا جو اسے وراثت میں ملی تھی۔ اس میں اس نے صرف کامپل کو فتح کیا جو کرناٹک کے جنوب میں ہے جو محمد بن تغلق کی اپنے چچازاد بھائی گرشاسپ کی بغاوت کو کچلنے کے بعد ہوئی۔ ملتان اور لکھنوتی میں بغاوتیں ہوئیں جن کو کچل دیا گیا۔ سندھ میں بھی بغاوت ہوئی اس پر بھی کچھ عرصے میں قابو پالیا گیا۔ اس کی اسکیموں کی ناکامی کے باوجود جن میں دیوگیری کو کوچ، خراسان اور قراچیل کی مہم، علامتی سکہ کا تجربہ شامل ہیں، سلطان کی عظمت بلند ہی رہی جس کی شہادت ابن بطوطہ دیتا ہے۔ اس کے مطابق دہلی کا حکمراں اس وقت کے دنیا کے چار بڑے حکمرانوں میں سے ایک تھا۔ باقی تین چین، عراق اور ازبکستان کے حکمراں تھے۔

دوسرا دوسالہ (45-1336) دور بری طرح شروع ہوا۔ مابار میں بغاوت، دوآب میں قحط، مابار مہم کی ناکامی جس میں وباء نے اہم کردار ادا کیا، جس کی وجہ سے دوسری تمام جنوبی ریاستیں ہاتھ سے نکل گئیں۔ بنگال بھی جاتا رہا۔ سلطان نے ان دور دراز کے علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرنے کی بہت کم کوشش کی کیونکہ یا تو اس کے پاس آدمیوں اور دولت کے وسائل میں کمی تھی، یا اس نے سوچا کہ ان علاقوں پر جو دہلی سے بہت دور ہیں کنٹرول کرنا اور براہ راست انتظام کرنا موجودہ حالات کے تحت ممکن نہیں تھا۔ وہ علاقہ جس کو اس نے اہم سمجھا اور جس پر قبضہ بھی رکھا وہ دولت آباد تھا۔

اس دور میں شمالی ہندوستان میں بہت سخت بغاوتیں ہوئیں اور دولت آباد کے علاقے میں بھی جس کو پرانے امراء کی بے اطمینانی یا لگان سے متعلق حریص پالیسیوں سے ملایا جاسکتا ہے۔ وہ امراء بھی جن کو سادہ امراء کہا جاتا ہے۔ اس دور میں غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔ شاید، قدیم امراء کی بغاوتوں میں، عین الملک کی بغاوت سب سے اہم تھی جو سلطان کا قریبی دوست اور ساتھی تھا اور جس کو اودھ کا گورنر بھی بنایا گیا تھا۔ جب سلطان سورگ دوار میں مقیم تھا تب اسی نے سلطان کو تمام چیزیں مہیا کی تھیں اور کڑا کے نزدیک ایک بغاوت کو بھی فرو کیا تھا۔ محمد بن تغلق عین الملک کی بڑھتی ہوئی شہرت سے مشتبہ ہو گیا۔ اس نے کچھ لگان ادا نہ کرنے والوں کو بھی پناہ دی تھی لہٰذا

محمد بن تغلق نے اس کا تبادلہ دولت آباد کر دیا تب ہی اس نے بغاوت کر دی حالانکہ محمد بن تغلق نے اس کو اسی وقت معاف کر دیا تھا۔ اس جھگڑے سے ہندوستانی اور بیرونی عناصر میں گہری تفریق نظر آتی ہے۔ عین الملک ایک ہندوستانی تھا اور وزیر، جو عین الملک کا دشمن تھا اس کی فوج کے زیادہ تر سپاہی بیرونی۔ ایرانی، ترک اور خراسانی تھے۔ یہ تفریق اور زیادہ بڑھ گئی کیونکہ محمد بن تغلق بیرونی افراد کی جن کو وہ 'عزیز' یا دوست کہتا ہے، سرپرستی کرتا تھا اور ان کو تحائف دیتا تھا۔

بیرونی افراد، جن کو محمد بن تغلق کی سرپرستی حاصل تھی، منگول تھے۔ ان میں سے بہت فوجیوں یا ادنیٰ افسروں کی حیثیت سے ہندوستان آئے۔ ادنیٰ افسران کو صدہ کہا جاتا تھا۔ صدہ یا سوایسی اصطلاح تھی جو منگول فوج میں استعمال ہوتی تھی ان کے لیے، جن کی سرپرستی میں سو سپاہی ہوتے تھے۔ لیکن ہندوستان میں صدہ کا لفظ علاقائی تقسیم کے لیے استعمال ہوا جس سے مراد سو گاؤں تھے۔ یہ ہی بظاہر پرگنہ کی بنیاد تھی جو اس وقت ایک انتظامی علاقے کی صورت میں ابھر کر سامنے آیا۔ صدہ امراء سب منگول ہی نہ تھے ان میں افغان اور دوسرے بھی شامل تھے۔

محمد بن تغلق کا امراء کے تئیں رویہ نہ ذات کی بنیاد پر تھا اور نہ مذہب کی تنگ نظر بنیاد پر۔ اس نے نہ صرف ان خاندانوں کا خیر مقدم کیا جو ہندوستان میں بہت پہلے سکونت اختیار کر چکے تھے اور پرانے حکمرانوں کے عہد میں ملازمت کر چکے تھے۔ بلکہ معمار اور دوسرے درجات / ذاتوں کی ملازمتوں میں شامل کیا جن کو ترک حقیر سمجھتے تھے جیسے مالی، حجام، باورچی، جُلاہے، شراب بنانے والے اور موسیقار وغیرہ۔ ان میں سے کچھ اپنا مذہب تبدیل کر چکے تھے اور کچھ ہندو تھے۔ لہٰذا برنی لکھتا ہے کہ کشن بزران اندری کو سہوان (سندھ) کا گورنر بنا دیا گیا۔ برنی کہتا ہے کہ ان لوگوں کو اعلیٰ مقام، دفاتر اور حکومت کرنے کے لیے علاقے دیئے گئے۔ لہٰذا نجبہ کو جو ایک موسیقار تھا بدایوں کا علاقہ پھر گجرات اور ملتان کا علاقہ دیا گیا۔ عزیز خمار کو جو شراب کشید کرتا تھا مالوا کا علاقہ دیا گیا۔ ان کے اتنے اونچے عہدوں پر پہنچنے پر قدیم امراء اور اعزاء میں گہری بے چینی تھی۔ ایسا نہ تھا کہ یہ لوگ نااہل تھے یا ابھی تک اپنے پرانے خاندانی پیشہ یا ذات پر چل رہے تھے۔ ان کا عروج ان کی صلاحیتوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ لیکن وہ سپاہی نہیں تھے۔ لہٰذا وہ ان مقامات پر ناکام رہے جہاں بغاوتیں ہوئیں۔ برنی نہ صرف محمد بن تغلق کی سخت تنقید کرتا ہے کہ اس نے ان کمتر،

اور حقیر لوگوں کو ملازمت دی بلکہ ان "کلرکوں، اناج کے تاجروں" (بنیوں) کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے جو گھوڑے کی اگاڑی اور پچھاڑی میں فرق نہیں کر سکتے تھے۔

اس طرح محمد بن تغلق کے امراء مزاج کے لحاظ سے مختلف الاوصاف تھے اور ایسے نہ تھے کہ پریشانی کے اوقات میں ان کا سہارا لیا جا سکے۔ حالانکہ نچلے طبقہ کے مذہبی اور بہت سے ترکی اور ہندوستانی امراء وفادار رہے لیکن منگول اور افغان صدہ امراء نے کچھ دوسرا ہی رخ اختیار کیا۔ محمد بن تغلق نے انتظامیہ میں بھی مذہبی طبقہ کے لوگوں کو، خاص طور پر صوفیاء کو شامل کرنے کی کوشش کی۔ اس معاملے میں تو وہ اس حد تک چلا گیا کہ ان میں سے کچھ کے ساتھ اس نے ازدواجی رشتہ قائم کر لیے۔ حالانکہ بہت سے صوفی اپنے آپ کو حکومت سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے اور انھوں نے اس کو نہیں سراہا۔ غصہ کی شدت میں محمد بن تغلق نے ان کو سخت سزائیں دیں اور کچھ کو تو قتل بھی کروا دیا۔ برنی کا کہنا ہے کہ اس نے بہت سے علماء، مشائخ، سادات، صوفیوں اور قلندروں کو قتل کروا دیا۔ اس کے انتقام میں اور اس کی جوگیوں کے ساتھ صحبت کی بنیاد پر قاضیوں نے یہ فتویٰ جاری کر کے قانوناً اس بات کی اجازت دے دی کہ کوئی بھی سلطان کے خلاف بغاوت کر سکتا ہے۔ اس پروپیگنڈے کی جوابی کارروائی کے لیے محمد بن تغلق نے طے کیا کہ وہ خلیفہ سے منشور حاصل کرے گا تاکہ علماء کی نظر میں اس کی حکومت کی قانونی حیثیت ثابت ہو سکے۔ اس کو پتہ چلا کہ خلیفہ بغداد کا ایک رشتہ دار جس کو 1258 میں منگولوں کے سردار ہلاکو نے قتل کیا تھا قاہرہ میں رہتا تھا۔ خلیفہ کے نمائندے اور اس کے وارثین میں سے ایک 1339 میں دہلی آئے تھے اور ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ محمد بن تغلق اس حد تک گیا کہ اپنے سکوں میں عباسی خلیفہ کا نام کھدوا دیا۔ بعد میں اسے خلیفہ کی طرف سے ایک منشور بھی ملا۔ لیکن ان سب کے باوجود اس کے لیے راسخ العقیدہ لوگوں کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

اس زمانے میں جو بغاوتیں ہوئیں جیسے کہ ایک کڑا میں، دوسری بیدر میں وہ اس لیے ہوئیں کہ سلطان نے کچھ لوگوں کو زمینیں مقطع پر دیں اس وعدے پر کہ وہ اسے ایک بڑی رقم دیں گے جو بہر حال وہ کسانوں سے وصول کرنے میں ناکام رہے۔ اسی دوران انھوں نے مقامی افسران یا صدہ کو دبانے کی کوشش کی۔ بعد میں مالوا اور گجرات میں ہونے والی بغاوتیں بھی اسی عمل سے

تعلق رکھتی تھیں۔

لگاتار ہونے والی ان بغاوتوں پر سلطان کی تشویش کے باوجود یہ قابو میں رہیں۔اس عرصے میں سلطان دہلی میں ہی رہا۔اس کی شہرت بلند ہی رہی یہ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسی دوران مختلف ممالک جیسے چین، مصر، خراسان، عراق، ماوراءالنہر اور کچھ افریقی ممالک کے سفیر اس کے پاس آئے۔

تیسرے دور (51-1346) میں گلبرگہ اور مالوا میں بغاوتیں ابھریں۔ایک زیادہ سخت بغاوت گجرات میں ہوئی اور بیدر میں حسن کانگو نے بھی بغاوت کی۔ محمد بن تغلق نے طے کیا کہ گجرات کے خلاف مہم میں وہ بذاتِ خود جائے گا کیوں کہ وہ معاشی اور مصلحت کے اعتبار سے کافی اہم تھا حالانکہ اس بغاوت کی سربراہی نیچے درجہ کے صدہ امیر کر رہے تھے۔اس کی غیر موجودگی میں دولت آباد ہاتھ سے نکل گیا اور بہمنی ریاست قائم ہوئی۔ محمد بن تغلق گجرات میں ڈھائی سال رہا۔بعد کے سال اس نے سوراشٹر میں گزارے اور پھر ایک باغی۔ تاغی، جو پہلے اس کا غلام رہ چکا تھا، کا پیچھا کرتا ہوا ٹھٹھ (سندھ کے نچلے حصہ) کی طرف چلا گیا، جس کو ٹھٹھ کے جام نے پناہ دی تھی۔ تعجب کی بات ہے کہ اس بے کار سی مہم میں اس نے 5 ہزار منگولوں کی مدد قبول کی جن کو ماوراءالنہر کے حکمراں التون بہادر نے بھیجا تھا۔ محمد بن تغلق کی ٹھٹھ پہنچنے سے پہلے ہی موت واقع ہو گئی۔اس دوران قائم مقام شوریٰ جس کو اس نے ہی بنایا تھا، دہلی میں کام کرتی رہی۔ شمال میں اس دوران سلطان کے طویل عرصے تک غیر حاضر رہنے کے باوجود کوئی بغاوت نہیں ہوئی۔

اپنی بہت سی مجبوریوں کے باوجود محمد بن تغلق نے وراثت میں ایک بڑی اور منظم سلطنت دی۔اس کا سخت اور جلد بازی کا مزاج، مشکوک رویہ اور سخت سزائیں دینے کی عادت نے اس کی مشکلات میں اضافہ کیا۔اس کی اصل مصیبت کی وجہ ایک وہ سلطنت تھی جو بہت وسیع اور کشادہ ہو چکی تھی اور جس میں اس نے یکساں اور انتہائی مرکزی نظام نافذ کرنے کی کوشش کی۔اس کے کچھ تجربات اور اصلاحات کے دوررس نتائج تھے۔اس کا علامتی سکّہ کا تجربہ انتہائی جرأت مندانہ قدم تھا لیکن یہ اس کے زمانے سے بہت آگے کی بات تھی۔اس نے بہرحال زراعت کی وسعت اور اضافے کی طرف نشاندہی کی تھی۔ آخرکار اس نے ایک لڑکھڑاتا پہلا قدم اٹھا کر ایک

آپ کو ان خدشات کی وجہ سے دور رکھا کہ نمکین -سمندروں یا ان علاقوں کے پار جہاں مونج گھاس اگتی ہے، سفر کرنے سے انسان اپنی ذات کھو دیتا ہے۔ بہر حال اس بات کے شواہد بھی موجود ہیں۔ اوّل وہ ہندوستانی تاجر جو خلیج فارس یا اس سے آگے رہتے ہیں۔ دوسرے ہندوستانی ویدوں اور دستکاروں کا وہ خیر مقدم جو بغداد میں عباسی خلیفہ کے دربار میں ہوا۔ اس بات کے بھی ثبوت ملتے ہیں کہ عرب تجار مالابار میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ راشٹر کوٹا کے بااثر حکمرانوں نے بھی جن کا دسویں صدی عیسوی تک مغربی ہندوستان، مالوا اور جنوبی ہندوستان کے علاقوں پر اقتدار تھا عرب تاجروں کا استقبال کیا۔ یہاں تک کہ انہیں عبادت کے لیے مساجد کی تعمیر کی بھی اجازت دی۔

(i) مغربی اور وسطیٰ ایشیا میں رفتار زمانہ:

نویں صدی عیسوی میں عباسی حکومت اپنے عروج پر تھی۔ اس کے اقتدار میں قسطنطنیہ اور مصر کے گرد و پیش کے علاقوں سے وسطی ایشیا اور عرب کے جزیرے شامل تھے۔ اس طرح یہ ایران کے عظیم بادشاہ 'دارا' (پانچویں صدی عیسوی) کے بعد ابھرنے والی سب سے زیادہ طاقت ور حکومت تھی، اگرچہ ان کی تمام تر طاقت ہندوستان کو فتح کرنے کی سنجیدہ کوشش کے بجائے وسطی ایشیا کے مشرک ترکوں سے لڑنے اور مغرب کی سمت اپنی حکومت کو پھیلانے میں صَرف ہوئی۔ یہ صورت حال نویں صدی کے آخر سے تبدیل ہونا شروع ہوئی جب عباسی حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور چھوٹی ریاستوں نے جارحانہ طریقہ پر سر ابھارنا شروع کر دیا۔ یہ ریاستیں بجز نام کے خود مختار تھیں۔ انھوں نے خلیفہ کی برائے نام اطاعت قبول کر رکھی تھی جس نے باقاعدہ تحریر یا منشور دیکر ان کی حیثیت کو قانونی قرار دے دیا تھا۔ ان ریاستوں کے حاکموں نے 'سلطان' کا خطاب اختیار کر لیا۔ ان میں سے زیادہ تر ترک تھے۔ ترک جو خانہ بدوش تھے اور زیادہ تر ان علاقوں میں آباد تھے جو اب منگولستان اور سنکیانگ کے نام سے مشہور ہیں، آٹھویں صدی سے ماوراءالنہر کے علاقے میں جو وسطی ایشیا اور قدیم تہذیب والے مشرقی ایشیا کے درمیان واقع ہے، داخل ہوتے رہے ہیں۔ اس علاقے کے ایرانی حاکم اور عباسی خلفاء ان ترکوں کو غلاموں اور ملازموں کی حیثیت سے لاتے تھے اور ان کو مسلمان بنانے کے بعد محلات کے محافظ کی حیثیت سے ملازمت دیتے تھے۔ ترکی فوجی

مخلوط حکمران طبقہ بنانے کی کوشش کی جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔اس سے کہیں زیادہ اہم یہ تھا کہ اس نے ذات کے تنگ دائرے سے ابھر کر ایسے لوگوں کو ملازمت میں شامل کیا جو نہ صرف زمیندار تھے بلکہ وہ لوگ بھی جو نچلے طبقے یا دست کاروں سے تعلق رکھتے تھے۔

■■■

-7-

فلاح و بہبود کی بنیاد پر حکومت کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش-دہلی سلطنت کا منتشر ہونا۔

محمد بن تغلق کی جگہ اس کے رشتہ کے بھائی فیروز تغلق کا ٹھٹہ میں اپنی فوج کی ابتری کے بعد تخت نشین ہونا اور اس کا طویل دورِ حکومت (1388-1351) دہلی سلطنت کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جلال الدین خلجی نے، جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں رعایا کی فلاح و بہبود چاہنے والی حکومت کی قائم کرنے کی جو بنیاد ڈالی تھی اس روایت کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش فیروز تغلق نے کی۔ اس نے امراء، اہلکاروں، فوجیوں، علماء اور کسانوں کے ان طبقوں کو پھر سے مطمئن کرنے کی کوشش جاری رکھی جو کسی نہ کسی وجہ سے محمد بن تغلق سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ چند فوجی مہمات کے بعد، جو کچھ خاص کامیاب بھی نہیں رہیں، فیروز نے فوج کشی چھوڑ دی اور حکومت کو ترقی اور خوشحالی کا وسیلہ بنانے کی کوشش کی۔ بد قسمتی سے اپنی حکومت کے آخری دور میں مذہبی معاملات میں وہ زیادہ تنگ نظر ہوتا چلا گیا۔ محمد بن تغلق جیسی وسیع فلسفیانہ بنیاد نہ رکھنے کی وجہ سے مذہب کے بارے میں اس کی سمجھ محدود معنوں اور تنگ نظری پر مبنی تھی جس کے شکار ہندو اور مسلمان دونوں کے کچھ طبقے ہوئے۔ اس کی وجہ سے رعایا کو فیض پہنچانے والی ریاست کو قائم کرنے کے اس کے ارادے کو تقویت نہیں ملی بلکہ اس میں کمزوری آگئی۔ مزید یہ کہ فیروز نے انتظامی اصلاحات کا جو ایک سلسلہ شروع کیا ان کی وجہ سے اسے فوری طور پر عوام میں مقبولیت تو حاصل ہوئی لیکن آگے چل کر وہ مرکزی حکومت کی کمزوری کا سبب بنیں۔

(i) عوام کی فلاح و بہبود کے متعلق فیروز کا تصور:

فیروز تغلق نے 'فلاح و بہبود' کے اپنے تصور کی وضاحت 'فتوحاتِ فیروز شاہی' میں کی ہے جو اس کی اپنی تصنیف سمجھی جاتی ہے اور جس کا ایک نامکمل جزو ہی اب دستیاب ہے۔ دورِ ماضی

میں ہوئی مسلمان کی خوں ریزی اور ان کو دی گئی جسمانی ایذاؤں کا ذکر کرتے ہوئے، جن میں، وہ ہاتھ، پیر، کان اور ناک کاٹ لیتے تھے، آنکھیں نکلوا لیتے، ہڈیاں توڑ ڈالتے، اور زندہ لوگوں کو جلا ڈالتے یا ان کی کھال اتروا لیتے، وغیرہ فیروز آگے کہتا ہے اس نے عہد کیا ہے کہ اس کے دورِ حکومت میں بغیر کسی معقول وجہ کے کسی مسلمان کا خون نہیں بہایا جائے گا نہ اسے ایذا پہنچائی جائے گی اور نہ کسی انسان کے جسم کا کوئی حصہ کاٹا جائے گا۔

اگرچہ شروع میں وہ یہ کہتا ہے کہ ایک سچے مسلمان کی طرح وہ ان تمام طریقوں کو ممنوع قرار دے گا جو اسلامی شریعت کے خلاف ہوں گے لیکن اس کے ان احکامات کا اطلاق مسلمان اور غیر مسلم دونوں پر ہی ہوگا۔ اگرچہ شرع میں ڈاکوؤں اور چوروں کے ہاتھ پیر کاٹنے اور کسی فرد پر کی گئی زیادتی یا جرم کا بدلہ لینے کی اجازت دی گئی ہے ہمیں نہیں معلوم کہ فیروز کے مندرجہ بالا احکامات کا نفاذ اس طرح ملنے والی سزاؤں پر بھی ہوا یا نہیں۔ شاید اس کے احکامات کا نفاذ سیاسی اور کسی حد تک معاشی معاملات تک ہی محدود رہا ہوگا۔

فیروز کہتا ہے کہ دورِ ماضی میں سخت سزائیں دینے کا مقصد لوگوں کو دہشت زدہ کرنا تھا تاکہ حکومت کا خوف ان کے دلوں میں بیٹھ جائے اور حکومت کے کاموں میں کوئی رخنہ نہ پڑے۔ فیروز کا کہنا ہے کہ سخت سزائیں ترک کر دینے سے حکومت کا رعب اور دبدبہ کم نہیں ہوتا بلکہ سزا کے خوف کے بغیر بھی لوگ حکومت سے رجوع کرتے ہیں۔

فلاح و بہبود کا یہ بنیادی تصور کہ رعایا خوف اور تشدد کے بغیر اپنے دل سے حکومت قبول کر لے۔ اپنے امکانات کو بہت بڑھا دیتی ہے خاص طور پر ایسے سماج میں جہاں اکثریت غیر مسلموں کی ہو۔

لوگوں کو پھر سے اپنی طرف کرنے کے لیے فیروز نے ان تمام دستاویزات کو برسرِ عام جلوا دیا جن کے مطابق دوآب میں کاشت کو بڑھانے اور بہتر بنانے کے لیے محمد بن تغلق نے دو کروڑ ٹنکوں کی رقم اہلکاروں کو دی تھی اور جس کا بیشتر حصہ وہ خُرد بُرد کر چکے تھے۔ ایک بچکانہ حرکت اس نے یہ کی کہ محمد بن تغلق نے جن لوگوں کے ہاتھ پیر، آنکھ، ناک اور کان وغیرہ کٹوا دیئے تھے ان سے یہ تحریر لکھوا کر کہ انھوں نے محمد بن تغلق کو معاف کیا اور ان تحریروں کو ایک صندوق

میں رکھ کر محمد تغلق کی قبر کے سرہانے دفنادیا۔

اسی طرح ان لوگوں کو بھی سخت سزائیں نہیں دی گئیں جنھوں نے اس زمانے میں جب فیروز ٹھٹہ میں تھا، ایک اور شخص کو دہلی کے تخت پر بٹھا دینے میں محمد بن تغلق کے چہیتے احمد ایاز کا ساتھ دیا تھا۔ فیروز کا بس چلتا تو وہ احمد ایاز کو بھی معاف کر دیتا لیکن اس کے خاص مشیر اس پر راضی نہیں ہوئے۔ پھر بھی اس نے ان لوگوں سے سونا اور جواہرات واپس لینے کی کوئی کوشش نہیں کی جو انہیں احمد ایاز نے اپنے ساتھ ملانے کے لیے دیئے تھے جبکہ غیاث الدین تغلق نے تخت نشیں ہونے کے بعد ان لوگوں سے وہ تمام مال و دولت سختی کے ساتھ اگلوالیا جو انھوں نے خسرو ملک کی فراخدلی کے سبب حاصل کیا تھا۔ فیروز تغلق نے ایک کام یہ کیا کہ مذہبی رہنماؤں، عالموں اور ناداروں کو جو معافی کی زمینیں (انعام اور ادرار کے طور پر) ملی ہوئی تھیں اور جنہیں گذشتہ حکمرانوں نے واپس لے کر خالصہ (شاہی ملکیت) میں شامل کر لیا تھا پھر انہیں واپس لوٹا دیں اور ہماری جانکاری کے مطابق بڑھا کر لوٹائیں۔

اس طرح کے نرم رویّہ کی وجہ سے، برنی کے مبالغہ آمیز بیان کے مطابق 'حکومت میں پائیداری آئی، امور سلطنت میں استحکام پیدا ہوا۔ ادنیٰ اور اعلیٰ، سب لوگ مطمئن ہوئے اور ہندو، مسلمان، ساری رعایا اپنے اپنے کاروبار میں مصروف زندگی گزارنے لگے۔

اس دور کے تمام مورخین، فیروز شاہ کے چالیس (قمری) برسوں کے دورِ حکومت میں عام خوشحالی اور اشیاء کی ارزانی کا ذکر کرتے ہیں۔ فیروز کا سوانح نگار شمس سراج عفیف کہتا ہے کہ اگرچہ علاء الدین کے دورِ حکومت میں اس کے سخت انتظامات کی وجہ سے اناج سستا تھا لیکن فیروز شاہ کے زمانے میں اس کی کسی کوشش کے بغیر ہی ہر چیز سستے داموں ملتی رہی۔ اس کے بیان کے مطابق اس خوشحالی میں تاجر اور اہلِ حرفہ سمیت سب شریک تھے کیونکہ پیداوار اور اجرتوں میں سال بہ سال اضافہ ہوتا رہا تھا۔ پہلے طریقوں کا، بظاہر، حوالہ دیتے ہوئے وہ بتاتا ہے کہ یہ قاعدے بنائے گئے کہ "زربفت، ریشم اور شاہی ضروریات کا جملہ سامان بازار کے بھاؤ، نقد خریدا جائے گا۔" یہ بتاتے ہوئے کہ "ہر گھر میں اناج، مال و اسباب اور گھوڑی کی بہتات ہے اور کوئی عورت بغیر زیورات کے نہیں رہتی۔" عفیف آگے لکھتا ہے کہ خوشحالی کا یہ عالم ہے کہ کہ غریب لوگ بھی

اپنی بیٹیوں کی شادی کم عمری میں کر دیتے ہیں۔ جس سے مراد، غالباً، یہ ہے کہ گھر کی آمدنی میں اضافے کے لیے بیٹیوں کی مدد کی ضرورت نہیں رہتی۔

رعیت اور کسانوں کے بارے میں عفیف لکھتا ہے کہ اسے بتایا گیا ہے کہ پہلے رواج یہ تھا کہ "ایک گائے کسان کے پاس رہنے دی جاتی تھی اور باقی، اس سے لے لی جاتی تھیں۔" فیروز نے اس زیادتی کے ازالے کے لیے تمام غیر شرعی ٹیکس ختم کر دیے اور پھر سے جمع بندی کروائی جس کی بنیاد پیمائش کے بجائے پیداوار قرار دی گئی۔ فیروز شاہ کی انتظامی اور زرعی پالیسی کے ذیل میں اس کا جائزہ بعد میں لیں گے۔

لوگوں کی بھلائی اور بہبود کے لیے فیروز شاہ کی کوششوں میں مسجدوں اور ان سے ملحقہ مدرسوں کی مرمت اور آبادکاری بھی شامل ہے۔ استادوں کے وظیفے (ادرار) 100 سے 200 ٹنکو سے بڑھا کر 400، یا 500، یا 700 یا 1000 ٹنکوں تک کر دیے گئے۔ اسی طرح طالب علموں کو جہاں پہلے 10 ٹنکے بھی وظیفہ نہیں ملتا تھا اب 100، 200 اور 300 ٹنکے تک وظیفہ دیا جانے لگا۔

اسی طرح صوفیوں کی بہت سی خانقاہوں کی مرمت کروائی گئی، ان کو آباد کیا گیا اور ان کی دیکھ ریکھ کے اخراجات کے لیے کچھ گاؤں ان کے نام کر دیے گئے۔ ضعیف مردوں اور عورتوں، بیواؤں، یتیموں اور جسمانی طور پر معذور لوگوں کے لیے وظیفہ مقرر کیے گئے۔ بے روزگاروں کی امداد کے لیے ایک ادارہ قائم کرنے اور شریف خاندان کی لڑکیوں کی شادی کے لیے سرکاری امداد کا انتظام کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان اقدامات سے عام طور پر مسلمانوں کو ہی فائدہ پہنچتا اور مسلمانوں میں بھی ان لوگوں کو جو دہلی میں یا اس کے قریب رہتے تھے۔ رفاہِ عام کا ایک کام جو فیروز شاہ نے کیا وہ دہلی میں ایک شفاخانہ (دارالشفاء) کا قیام تھا جہاں سب کا مفت علاج ہوتا تھا۔ اگرچہ دہلی میں محمد بن تغلق کے عہد سے ہی کئی شفاخانے موجود تھے لیکن ان اسپتالوں کی سرکار کی سرپرستی کو ایک مفید اور قابلِ ستائش قدم قرار دیا جا سکتا ہے۔

دورِ وسطیٰ کے حالات میں جبکہ لڑائی اور تشدد ایک معمول بن چکے تھے فلاح و بہبود کے اصول پر زور دینا اور اپنی تمام خامیوں کے باوجود ایک قابلِ قدر کارنامہ تھا جس کا سہرا فیروز کے سر رہا۔

(ii) فیروز کی فوجی مہمات اور ان کی محدود کامیابیوں کے اثرات:

جب فیروز تغلق 1351 میں ٹھٹہ میں تخت نشین ہوا تو سلطنت بڑی مشکل میں گرفتار تھی۔ جنوب کی ریاستیں جنہیں غیاث الدین اور محمد بن تغلق نے سلطنت میں شامل کر لیا تھا پھر سے الگ ہو گئیں جن کے بعد دولت آباد بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ گجرات اور سندھ میں بغاوتیں ہوئیں اور بنگال نے ایک مرتبہ پھر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔

نہ تو اپنے مزاج اور نہ اپنی تربیت کے لحاظ سے فیروز تغلق ایک جنگجو اور ایک بڑا فوجی سپہ سالار بننے کے لائق تھا، پھر بھی وہ دو مرتبہ فوجیں لے کر بنگال گیا۔ اڑیسہ اور نگر کوٹ پر حملہ کیا اور سندھ کے نچلے علاقوں پر فوج کشی کی۔ ان میں سے کسی مہم سے بھی سلطنت کے علاقوں میں اضافہ نہیں ہوا اور نہ ہی دہلی سلطنت کی حدود سمٹیں۔

بنگال کی مہمیں:

بنگال پر 54-1353 اور پھر 60-1359 کی فوجی مہم کا مقصد بنگال پر دوبارہ قبضہ حاصل کرنا تھا جس نے دہلی سے آزاد ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ دونوں مرتبہ فیروز ایک بڑی فوج لے کر روانہ ہوا جس میں گورکھپور اور چمپارن کے طاقتور رئیسوں کے دستے بھی شامل ہو گئے۔ اس طرح دہلی کی افواج نوّے ہزار سواروں پر مشتمل تھی۔ دونوں مرتبہ بنگال کے خودمختار حکمراں، حاجی الیاس پہلی مہم کے موقع پر اور اس کا بیٹا سکندر دوسری مہم کے موقع پر پسپا ہوئے اور انھوں نے جاکر 'اکدلہ' میں پناہ لی جو ایک مضبوط قلعہ تھا جس کے چاروں طرف ایک چوڑی خندق تھی جس میں قریب کی ندی سے ایک نہر کے ذریعہ پانی آتا تھا۔ دونوں مرتبہ فیروز قلعہ پر حملہ نہ کر سکا۔ قلعہ کو ناقابلِ تسخیر سمجھ کر اور محاصرے کو اس ڈر سے طول نہ دے کر کہ برسات آنے پر تمام راستے مسدود ہو جائیں گے، فیروز نے صلح کی پیش کش کی۔ دونوں طرف سے قیمتی تحفے پیش کیے جانے کے بعد اپنی اپنی جگہ پر ایک دوسرے کے اقتدار کو مان لینے اور امن قائم رکھنے کے معاہدے کیے گئے۔ عفیف کا بیان ہے کہ فیروز نے مزید خوں ریزی سے بچنے اور مسلمان عورتوں کی عزت و آبرو کے تحفظ کی خاطر قلعہ پر حملہ نہیں کیا شاید محض ایک سرکاری توجیہہ ہے۔

جاج نگر (اُڑیسہ) اور نگر کوٹ کی مہمیں:

بنگال کی دوسری مہم سے واپس لوٹتے وقت فیروز نے جونپور میں قیام کیا اور وہاں سے اُڑیسہ پر پیش قدمی کی۔ اس فوج کشی کا مقصد ان علاقوں پر دہلی کا پھر سے اقتدار جتانا تھا جنہیں غیاث الدین کے عہد میں شہزادہ محمد بن تغلق نے فتح کر لیا تھا۔ بنگال کے دہلی سے آزاد ہو جانے کے اعلان کے بعد یہاں کے حکمراں نے بھی خراج دینا بند کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ دہلی کے ساتھ فوجی ٹکراؤ میں اس نے بنگال کا ساتھ دیا تھا۔ فیروز کا یہ حملہ محض سیر وشکار ہی ثابت ہوا کیونکہ اڑیسہ کا حکمراں مقابلہ کرنے سے بچتا رہا۔ آخر اس نے صلح کر لی اور ہر سال باقاعدہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا جس میں ایک تعداد ہاتھیوں کی بھی تھی، جو فیروز کو بہت پسند تھے۔ واپسی کا سفر بخیریت طے ہوا سوائے اس کے کہ بقول عفیف، فیروز اِدھر اُدھر گھومتا رہا، جنگل میں راستہ بھٹک گیا اور چھ ماہ بعد واپس پہنچا۔

دہلی میں چار سال قیام کرنے کے بعد فیروز نے کانگڑہ میں نگر کوٹ پر چڑھائی کرنے کا فیصلہ کیا جو ملک کے سب سے مضبوط قلعوں میں سے ایک مانا جاتا تھا۔ شاید اس کا مقصد بنگال کی ناکام مہموں کی تلافی کرنا بھی تھا۔ فیروز نے پہلے دولت آباد پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس غرض سے بیانا تک جا پہنچا تھا۔ لیکن پھر معقول مشوروں کو مانتے ہوئے اس سے باز رہا۔ رائے نگر کوٹ پیچھے ہٹ گیا اور اپنے آپ کو قلعہ میں محصور کر لیا جس کا حملہ آور فوجوں نے محاصرہ کر لیا اور جیسا کہ ہوتا ہے، آس پاس کے علاقوں کو لوٹا گیا، چھ مہینے کے محاصرے کے بعد طرفین میں بات چیت شروع ہوئی۔ رائے خود حاضر ہوا۔ فیروز نے رائے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ اسے خلعت اور چھتر عنایت کیا اور تحفے دے کر رخصت کیا۔ جواب میں رائے نے سلطان کو سربراہ تسلیم کیا۔ اس کی خدمت میں بہت سی نذر اور بیش قیمت گھوڑے پیش کیے۔

اس حملے کے دوران کسی مندر کو گرانے کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ در حقیقت عفیف، فیروز کے 'جوالہ مکھی' مندر میں جانے کا ذکر کرتا ہے جو نگر کوٹ کے راستے میں پڑتا ہے لیکن وہ اس افواہ کی سختی سے تردید کرتا ہے جو کچھ ہندوؤں کی اڑائی ہوئی ہے۔ کہ "مندر میں جا کر فیروز نے مورتی (جو در اصل آگ کا ایک شعلہ ہے) کے اوپر ایک سونے کا چھتر پکڑے رکھا۔" مندر کو نقصان پہنچانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

ٹھٹہ پر فوج کشی (1365-67):

آخری فوجی مہم جس میں فیروز نے ڈھائی سال صَرف کیے وہ نچلے سندھ میں ٹھٹہ کے خلاف وہاں کے حکمرانوں کی سرکوبی کے لیے تھی جو جام اور بھبینہ کہلاتے تھے۔ اس مہم کی خاص غرض وغایت کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ ملتان کے حاکم کو ان سے بہت شکایت تھی لیکن یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی کہ فیروز بذات خود ان کی سرکوبی کے لیے جاتا۔ غالباً اس کا تعلق منگولوں کی آئے دن کی کاروائیوں سے تھا۔ گذشتہ سال منگولوں کی فوج دیپالپور تک پہنچ گئی تھی لیکن دہلی سے فوجوں کے آجانے پر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ شبہ یہ تھا کہ جام اور بھبینہ منگولوں سے قریبی رابطہ رکھتے تھے۔ بظاہر فیروز کو اس بات کا اندیشہ ہوگا کہ نچلے سندھ پر منگولوں کے قبضے سے نہ صرف پنجاب کو خطرہ لاحق ہو جائے گا بلکہ دریائے سندھ کے ذریعہ کی جانے والی تجارت میں بھی رکاوٹ پڑ جائے گی۔

کچھ جدید مورخین نے ٹھٹہ کی مہم کو نہایت غیر منظم مہم قرار دیا ہے۔ فیروز کی فوج کے ساتھ 5,000 کشتیوں کا بیڑہ تھا جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ دریائے سندھ کے آبی راستے سے کتنی تجارت ہوتی تھی۔ ٹھٹہ پہنچنے پر اس کو خلاف توقع سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ اس کے تین چوتھائی گھوڑے وَبا سے مر گئے اور اس کی فوج کو غذا کی شدید قلت پیش آئی۔ یقینی شکست کے پیشِ نظر اس نے ہٹ کر گجرات پہنچ جانے کا فیصلہ کیا لیکن رہبروں کی دغابازی سے کچھ کے رن میں راستہ سے بھٹک گیا۔ بڑی مصیبتوں سے فوج احمد آباد پہنچی۔ فوج کو نئے سرے سے آراستہ کرنے کے لیے دو کروڑ کی رقم لی گئی۔ لیکن بہت سے لوگ موقع سے فائدہ اٹھا کر دہلی لوٹ گئے۔ فیروز نے ان کو روکنے کی کوشش کو بے سود سمجھا۔ لیکن کم فوج کے ساتھ جب وہ پھر ٹھٹہ پہنچا تو چوڑے دریا کے دونوں کناروں پر بسے شہر کے دونوں حصوں پر قبضہ نہ کر سکا اس لیے اس نے اپنے وزیر، خانِ جہاں، سے کمک مانگی جس کے آجانے کے بعد ہی جام اور بھبینہ نے مذاکرات شروع کیے اور اطاعت کی۔ ان سے عزت واحترام کا سلوک کیا گیا اور فیروز ان کو اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔ ان کی جگہ نچلے سندھ کا علاقہ جام کے ایک بیٹے اور بھبینہ کے بھائی تماچی کے سپرد کیا گیا۔

ٹھٹہ سے واپس آکر فیروز نے طے کیا کہ اب وہ کسی مہم کی سربراہی نہیں کرے گا بلکہ

امن وسکون پر توجہ دے گا۔ سب سے آخری کوشش وہ تھی جب فیروز نے دولت آباد پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن خانِ جہاں کے فیصلے کو مانتے ہوئے وہ اس ارادے سے باز رہا کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کا خون بہے گا۔

مختلف فوجی مہموں کی محدود سی کامیابیوں میں فیروز کے امن کو ترجیح دینے یا مسلمانوں کے خون بہانے سے اس کے احتراز کرنے کا بہت کم تعلق تھا بلکہ ایک رہنما کی حیثیت سے یہ اس کی نااہلی کو ثابت کرتی ہیں۔ لیکن ان ناکامیابیوں سے ایک خیر کی صورت پیدا ہوئی۔ مزید فوجی مہمات سے گریز کر کے اب وہ ایک ایسی سلطنت پر حکمرانی کر رہا تھا جو مربوط تھی اور جس کا انتظام آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔ رقبہ کم ہو جانے پر بھی یہ کوئی چھوٹی سی سلطنت نہیں تھی اور کم و بیش اتنے ہی علاقوں پر مشتمل تھی جو علاء الدین نے اپنی وفات کے وقت چھوڑے تھے (سوائے دولت آباد کے جو اس کے دور کے آخری چند برسوں میں فتح ہوا تھا۔) فیروز خوش قسمت تھا کہ سابق حکمرانوں کی طرح اسے اپنے علاقوں پر منگولوں کے آئے دن کے حملوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

اس طرح فیروز استحکام اور ترقی کے کاموں پر پوری توجہ دے سکا جس کی وجہ سے کم از کم اس کی سلطنت کے وسطی علاقوں میں بے مثال خوش حالی آ سکی۔

(iii) امراء اور انتظامیہ کی از سر نو تنظیم:

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ فیروز سماج کے ہر طبقہ کو اور امراء کو بھی خوش رکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے امراء میں یکجہتی اور پائیداری آئے۔ التتمش کی وفات کے بعد سے امراء کے طبقے میں کافی ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔ ہر حکمراں نے اپنے وفادار نئے امراء کی ٹولی بنانے کی کوشش کی۔ جلال الدین خلجی اور غیاث الدین تغلق نے اپنے پرانے امیروں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنے کی کوشش کی لیکن مایوس ہوئے۔ فیروز تغلق نے ان امراء کو خوش رکھنے کی کوشش کی جو محمد بن تغلق کے وفادار رہے تھے۔ اس نے خانِ جہاں مقبول کو وزیر بنایا جس کی تربیت محمد بن تغلق نے کی تھی اور تقریباً سارے انتظامی کام اسی کے سپرد کر دیے۔ اس نے تاتار خاں جیسے بزرگ امیروں کو بھی اعزازات سے نوازا۔

محمد بن تغلق کے برخلاف اسے غیر ملکی زیادہ پسند نہیں تھے۔ اس نے اس کا اظہار بالکل

شروع میں ہی کر دیا تھا جب کہ ہرات، سیستان، عدن اور مصر وغیرہ سے آئے ہوئے بہت سے غیر ملکی ٹھٹھ میں اس امید پر قیام کیے رہے کہ محمد بن تغلق انہیں بلائے گا اور عہدوں کی پیش کش کرے گا۔ فیروز نے ان کے لیے سفر خرچ بھیجا اور واپس چلے جانے کو کہا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس نے ہندو اور مسلمانوں کے نچلے طبقے کے لوگوں کو جنہیں برنی 'کمینہ اور ذلیل' کہتا ہے امیر نہیں بنایا۔

فیروز اپنے امراء کو بڑی بڑی تنخواہیں دیتا تھا۔ 'خان' اور 'ملک' کو ان کی ذاتی آمدنی کے طور پر چار لاکھ، چھ لاکھ اور آٹھ لاکھ ٹنکے تنخواہ ملتی تھی۔ اس کے وزیر خانِ جہاں کو تیرہ لاکھ ٹنکے تنخواہ ملتی تھی اور ہر بچے یا بچی کی پیدائش پر مزید وظیفہ ملتا تھا۔ یہ تنخواہیں اقطع کی شکل میں دی جاتی تھیں۔ فیروز نے اپنے دور حکومت کی ابتدا میں پیداوار یا آمدنی کی بنیاد پر جمع بندیاں کرائی تھیں جن کو اس کے دور میں بدلا نہیں گیا۔ ان زمینوں پر کاشت کی توسیع یا ترقی کا فائدہ امیروں کو پہنچتا تھا۔

مزید یہ کہ فیروز نے امیروں کے عہدے کو موروثی قرار دینے کی کوشش کی۔ فتوحات میں فیروز کہتا ہے کہ "کسی عہدے دار کے انتقال پر میں اس کا عہدہ اور اس کے اعزازات اس کے لڑکے کو منتقل کر دیتا اور اس کے رتبے، سہولیات اور عہدے کے اعزازات میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جاتی۔" وراثت کے اس قانون کے نفاذ کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ سب سے نمایاں مثال یہ ہے کہ خانِ جہاں مقبول کی وفات (69-1368) کے بعد اس کے بیٹے جونا خاں کو وزارت کا عہدہ ملا۔ لیکن یہ جونا خاں کے اس مطالبے پر کیا گیا کہ فیروز تغلق نے غالباً خانِ جہاں مقبول کے تقرر کے وقت، یہ لکھ کر دیا تھا کہ اس کے دورِ حکومت میں وزارت اسی کے خاندان میں رہے گی۔ ایسی ہی ایک مثال گجرات کے ایک حاکم ظفر خاں کی ہے۔ جس کے 71-1370 میں انتقال کے بعد اس کا عہدہ اور خطاب اس کے بیٹے دریا خاں کو دیا گیا۔ لیکن دریا خاں کو جلد ہی اپنے عہدے سے برخاست کر دیا گیا۔ فیروز نے کسی اور اعلیٰ عہدے کے لیے اس قاعدے کو نہیں برتا۔ غالباً فیروز کا خیال یہ تھا کہ اقطع یافتہ شخص کی موت کے بعد یہ اقطاع (کسی اور کو) منتقل نہیں کیا جائے گا بلکہ اسی کے بیٹوں کو بخشا جائے گا۔ جب بھی مرکزی حکومت کمزور پڑی یہ ہی صورتِ حال اُبھری کیونکہ اس سے سلطان کے مقابلے میں امیروں کی طاقت بڑھتی تھی۔

انتظامیہ میں امراء کے بعد دوسری اہم اکائی فوج کی تھی۔ فیروز چاہتا تھا کہ امراء کی

کمانڈروں نے بہت جلد ایرانی زبان و تہذیب کو اپنا لیا جو کہ اس علاقے میں چھائی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے بھی فارسی اور عربی دونوں ہی زبانیں حکمراں طبقے کی زبانیں تھیں۔ ایرانی تہذیب اور انتظامیہ نے عباسیوں کو خاصا متاثر کیا تھا۔

اس طرح نو آباد ترک، اسلام کے ماننے والے اور فارسی داں ہو گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مستقبل کا خاکہ تیار کیا۔ ایک طرف یہ لوگ ان ترک قبیلوں سے لڑتے رہے جنہوں نے مذہب تبدیل نہیں کیا تھا اور دوسری طرف ہندوستان میں بھی پھیلتے رہے۔

عباسی خلفاء کے زوال کے بعد اس علاقے میں ابھرنے والا سب سے طاقتور خاندان سامانی (874-999) تھا جس کو بلخ کے ایک نو مسلم ایرانی امیر نے قائم کیا جو سمرقند اور ہرات کا گورنر تھا۔ کچھ عرصے بعد اس کی تقلید غزنوی نے کی (962-1186)۔ اس کو قائم کرنے والا سامانی گورنروں کا ایک ترک غلام الپتگین تھا۔ غزنویوں کو سلجوقیوں نے ہٹایا اور انھیں خوارزمی سلطنت نے جن کا دارالخلافہ مرو تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں خوارزمی حکومت کو تباہ کرنے والا چنگیز خاں منگول تھا۔ یہ حکومتیں آپس میں اور ساتھ ہی اس علاقے کے ان چھوٹے حکمرانوں سے بھی لڑتی رہیں جن کو وہ اپنا ماتحت بنانا چاہتی تھیں۔ اس طرح یہ حکمراں ان راجپوت راجاؤں سے مختلف نہیں تھے جو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنا اقتدار رکھتے تھے اور مسلسل ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ اس طرح مغربی اور وسطی ایشیا میں اپنی بقا کے لیے حفاظتی جنگ میں جنگی مہارت سب سے اہم سمجھی جاتی تھی اور اسی کے ساتھ فوجی نظام کا فروغ ہوا۔ اس کی وجہ سے ہندوستان اور اس سے ملے ہوئے دور کے علاقے ازبکستان اور افغانستان کے لیے بھی جنہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، یہ حکمراں فوری خطرہ بن کر سامنے آئے۔

نو مسلم ترکوں کی جارحانہ کارروائیوں میں بہت سے عامل شامل ہو گئے تھے۔ ان کے پاس دنیا کے بہترین گھوڑے تھے۔ ترکوں نے جو ماہر گھوڑ سوار اور دلیر سپاہی مانے جاتے تھے ان گھوڑوں کی نسل کی افزائش کی جو وسطی ایشیا کے لق و دق صحراؤں میں جنگلی ریوڑ کی طرح گھومتے تھے۔ ہندوستان میں ان گھوڑوں کی درآمد عرصۂ دراز سے تھی۔ ہندوستانی نسل کے گھوڑے چستی اور پھرتی میں وسطی ایشیا کے گھوڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی ہندوستانی گھوڑ سوار مہارت

طرح فوج میں بھی ایسے لوگ بھرتی کیے جائیں جو خاندانی سپاہی ہوں اور جن کا دور رس مفاد حکومت کے استحکام سے وابستہ ہو۔اس لیے اس نے حکم دیا کہ مرکزی فوج کے سپاہیوں کو نقد تنخواہ نہیں دی جائے گی بلکہ دہلی سے قریب یادو آب میں گاؤں (وجہ) دے دیئے جائیں۔اس طرح اس نے ترک سپاہیوں کا مطالبہ مان لیا جسے بلبن نے کسی قدر مان لیا تھا لیکن علاء الدین خلجی نے سختی سے نامنظور کر دیا تھا۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اسّی (80) فی صد مرکزی فوج کی تنخواہیں وجہ بخشے جانے سے ادا ہوتی تھیں۔باقی جو عارضی (غیر وجہی) طور پر بھرتی کیے گئے سپاہی تھے انہیں یا تو خزانے سے نقد تنخواہ ملتی تھی یا پھر امراء کو دیے گئے اقطاع میں شامل ہوتی تھی۔ لیکن امراء کے اقطع سے سپاہیوں کو تنخواہ کا کچھ حصہ ہی مل پاتا تھا۔

سپاہی پیشے کے موروثی یا خاندانی ہونے کی اہمیت کو بڑھانے کے لیے فیروز نے حکم دیا کہ کسی فوجی کی موت واقع ہو جانے پر اس کا گاؤں مستقل طور پر اس کے بیٹے کو ملے گا۔اگر بیٹا نہ ہو تو داماد کو ملے گا۔اگر داماد بھی نہ ہو تو غلام کو ملے گا اگر غلام بھی نہ ہو تو مستقل طور پر اس کی عورتوں کو ملے گا۔بعد میں فیروز نے یہ بھی حکم جاری کیا کہ اگر سپاہی بوڑھا ہو جائے تو اس کی جگہ اس کا بیٹا، بیٹا نہ ہو تو داماد، داماد نہ ہو تو غلام فوج میں جائے گا تاکہ بزرگ گھر پر آرام سے رہے اور قوی جوان فوج میں خدمات انجام دے۔

ان اقدامات کو درست قرار دینا مشکل ہے۔پھر بھی ایسے خاندانوں کو وجود میں لانے کی کوشش جن کا پیشہ ہی سپہ گری ہو، کامیاب ہو سکتی تھی اگر فیروز گھوڑوں کو داغنے کے طریقہ میں ڈھیل نہ دیتا جس کی وجہ سے کمزور اور ناکارہ گھوڑے فوج میں شامل نہیں کیے جاسکتے تھے۔عام طور پر داغنے کے لیے گھوڑوں کو ایک سال کے اندر اندر لانا پڑتا تھا لیکن بہت سے سپاہی ایسا نہ کر پاتے تو اس کام پر معمور نائب افسر کی سفارش پر فیروز انہیں اکیاون دن کی مہلت دے دیتا جو دو مہینے کے لیے اور بڑھا دی جاتی۔اس کے بعد بھی اس بنیاد پر سپاہی کو چھوٹ مل جاتی کہ افسروں نے اسے اپنی تنخواہیں وصول کرنے کے لیے گاؤں بھیج دیا تھا۔غلط قسم کی فیاضی برتتے ہوئے فیروز نے ایک مرتبہ ایک انتہائی پریشان سپاہی کو سونے کا ایک ٹنکا دیا تاکہ وہ سال گزرنے سے پہلے نائب افسر کو رشوت دے کر اس سے اپنا ناکارہ گھوڑا منظور کرا سکے۔

اپنی حکومت کے آخری دور میں فیروز کو احساس ہوا کہ نرمی برتنے کے غلط تصور کی وجہ سے اس نے مرکزی فوج کی کارکردگی کو کمزور کر دیا۔ اس لیے اس نے بڑے بڑے اقطاع داروں اور افسروں کو حکم دیا کہ جب وہ جنگ پر جائیں تو غلام پکڑ کر لائیں اور ان میں سے جو سب سے اچھے ہوں انہیں چھانٹ کر دربار کی خدمت کے لیے بھیجیں۔ ایسا ان سرداروں سے بھی کہا گیا جو رواج کے مطابق سلطان کو تحائف بھیجا کرتے تھے اس طرح ایک لاکھ اسی ہزار غلام مہیا ہو گئے۔ ان میں سے کچھ اپنا وقت پڑھنے اور مذہبی مطالعوں میں گزارتے اور بارہ ہزار مختلف قسم کے اہلِ حرفہ تھے جنہیں مختلف پرگنوں میں بھیج دیا گیا۔ غلاموں کے ایک بڑے دستے کو مسلح محافظ بنا دیا گیا جو اسی ہزار سواروں کی مرکزی فوج کے علاوہ تھے۔ غلاموں کی اس فوج کے لیے جن میں سے زیادہ تر پہلے ہندو تھے الگ نائب افسر (حاضری لینے والے)، الگ خزانے اور الگ دیوان قائم کیے گئے۔

غلاموں کی اس فوج کی کارکردگی کو فیروز میدانِ جنگ میں نہیں پرکھ سکا لیکن ایک حد تک یہ فوج امراء اور مستقل شاہی فوج کی قوت کا توڑ مہیا کرتی تھی مگر اس کی وجہ سے دوہرے انتظامات کرنے پڑتے تھے اور حکومت کی پائیداری کے لیے امراء کے طبقے کی یک جہتی پر انحصار کرنے اور سپاہیانہ روایات رکھنے والے گھرانوں ہی سے فوج کے سپاہی بھرتی کرنے کی فیروز کی کوششوں کے برخلاف تھی۔ اس لیے فیروز کی آنکھ بند ہو جانے سے پہلے ہی ان دونوں میں ٹکراؤ کا اٹھ کھڑا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔

فیروز کی خوش قسمتی تھی کہ سلطنت کے عام انتظامات کے لیے اسے خانِ جہاں مقبول جیسا قابل اور مستعد افسر مل گیا جسے سلطان 'بھائی' کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور ہر طرح اس کی اعانت کرتا تھا یہاں تک کہ وہ کہا کرتا تھا کہ اصل سلطان تو خانِ جہاں ہی ہے۔ لیکن خانِ جہاں نے بھی کبھی اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کیا۔ وہ ہر بات سے سلطان کو پوری طرح باخبر رکھتا۔ اس کے علاوہ وہ انتہائی ایمان دار بھی تھا۔ اگرچہ صوبہ داروں سے وہ تحائف لیتا تھا لیکن ان کا اندراج شاہی خزانے میں کرتا تھا۔ سرکاری واجبات وصول کرنے میں وہ کوئی ڈھیل نہیں دیتا تھا۔ پھر بھی اس کے اختیارات حساب کی جانچ کرنے والے افسر (آڈیٹر) اور مشرف (اکاؤنٹینٹ جنرل) کے تابع تھے۔ ان دونوں کی پہنچ سلطان تک براہ راست تھی۔ حساب جانچنے والوں سے کبھی کبھی خانِ جہاں کا

تلخ جھگڑا ہو جاتا تھا جسے سلطان سلجھا دیتا۔

فیروز کے دربار میں ایک اور طاقتور امیر عریضِ ملک (حاضری افسر) بشیر سلطان تھا۔ وہ فیروز کا غلام رہ چکا تھا اور بے ایمانی کر کے اس نے بہت دولت جمع کر لی تھی۔ خانِ جہاں اُسے بچائے رکھتا تھا۔ بشیر کا انتقال ہوا تو اس کے پاس 13 کروڑ ٹنکے نکلے۔ ان میں سے 9 کروڑ سلطان نے یہ کہہ کر رکھ لیے کہ وہ اس کا غلام رہ چکا تھا اور باقی رقم اس کے بیٹوں میں تقسیم کر دی۔

(iv) ترقیاتی کام۔زرعی اور شہری:

زراعت کی ترقی کے لیے فیروز تغلق نے، محمد بن تغلق کی روایات پر عمل جاری رکھا۔ اپنے دورِ حکومت کی ابتدا میں اس نے خواجہ حسام الدین جنید کو مالگزاری پھر سے طے کرنے کے کام پر لگایا۔ خواجہ چھ سال تک افسران کے ساتھ ملک کا دورہ کرتا رہا اور نئی جمع بندی مرتب کی۔ معائنہ کی بنیاد پر تخمینہ لگاتے ہوئے چھ کروڑ، ستر لاکھ ٹنکے مالگزاری کی جمع بندی تیار ہوئی جسے فیروز تغلق کے دورِ حکومت میں پھر نہیں بدلا گیا۔ اگرچہ اس جمع بندی سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کاشت کار کا حصہ کتنا ہوتا تھا لیکن چونکہ جمع بندی پیمائش کے بجائے پیداوار میں حصہ کی بنیاد پر ہوتی تھی اس لیے پیداوار میں اضافہ یا کمی کا اثر کاشت کار اور سرکار پر یکساں ہی پڑتا ہوگا۔ چونکہ مالگزاری کی آمدنی زیادہ تر امراء کو اقطاع کے طور پر ملتی تھی اس لیے کاشت میں اضافے اور بہتری کا فائدہ امراء کو پہنچتا تھا اور وہ اس کے لیے کوشاں رہتے۔

بنگال کی مہموں کے درمیان فیروز نے 'حصارِ فیروزہ' (جواب حصار کہلاتا ہے) شہر آباد کیا۔ اور جمنا اور ستلج سے ایک ایک نہر کے ذریعہ اس شہر تک پانی لانے کا انتظام کیا۔ یہ نہریں تقریباً سو (100) میل لمبی تھیں۔ دونوں نہریں کرنال کے قریب آکر مل جاتی تھیں جس کی وجہ سے حصار شہر کو کافی پانی مہیا ہو جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے یہ علاقہ اتنا خشک تھا عراق اور خراسان سے آنے والے سوداگروں کو ایک مٹکی پانی کے لیے چار جیتل ادا کرنے ہوتے تھے۔ لیکن اب کاشتکار دو فصلیں اگا لیتے ہیں، موسم بہار میں خریف کی اور موسم سرما میں ربیع کی۔ مٹی اَٹ جانے سے یہ نہر بند ہو گئی۔ پھر اکبر نے اس کی مرمت کروائی اور صاف کروایا۔ بعد میں شاہجہاں کے عہد میں اس کو دہلی تک بڑھا دیا گیا۔ انیسویں صدی میں انگریزوں نے پھر اس نہر کی مرمت اور توسیع کروائی اور

یہ ہی نہر مغربی جمنا ندی کی بنیاد بنی۔ فیروز کے زمانے میں نہر کے کنارے کی پوری زمین میں آبپاشی کی جانے لگی جس کی وجہ سے پرانے دیہات میں کاشت کے رقبے میں اضافہ ہوا اور نئے گاؤں آباد ہوئے۔ فیروز نے اور بھی کئی نہریں کھدوائیں۔ اس عہد کے مورخ چھ نہروں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر نہریں ہریانہ کے علاقے میں تھیں۔ ایک نہر دہلی کے جنوب میں فیروز کے بسائے ہوئے شہر۔ فیروز پور۔ کو پانی پہنچاتی تھی۔ عفیف لکھتا ہے کہ دریائے ستلج سے کول (موجودہ علی گڑھ) تک کے علاقے میں جم کر کھیتی ہونے لگی تھی۔ عفیف کے الفاظ میں "اس علاقے میں سامانہ کے شق کی طرح ایک کوس میں (دو میل کا ہوتا تھا) چار گاؤں ہوتے تھے۔" فصلوں کی قسموں میں بھی اس طرح کے سدھار کی کوششیں کی گئیں کہ سستے اناج کے بجائے گیہوں اور گنے کی کاشت زیادہ کی جائے۔ برنی اور عفیف کی تحریروں میں غالباً اسی علاقے کی خوشحالی اور یہیں کے امراء کے ٹھاٹ باٹ کا نقشہ ملتا ہے۔ یقیناً آبادی کے دوسرے حصے مثلاً کاشت کار، اہلِ حرفہ اور تاجر بھی اس خوشحالی سے متاثر ہوئے ہوں گے لیکن دہلی سے دور کے علاقوں، جیسے کہ سندھ میں اس زمانے کی ایک تحریر سے اناج کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ اور کاریگروں کی بہت زیادہ اجرت پانے کا پتہ چلتا ہے۔ دوسرے علاقوں میں کیا صورتِ حال تھی اس کی ہمیں اطلاع نہیں۔

علاقے کی اس زرعی خوش حالی سے فیروز کو بھی مالی فائدہ پہنچا۔ اس نے بہت سے عالموں اور ملاؤں کو جمع کیا جنہوں نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ چونکہ سلطان نے نہریں کھدوانے اور پانی مہیا کرنے کی زحمت اٹھائی ہے اس لیے مالگزاری کا دس فیصد الگ سے 'حق شرب' لینے کا وہ مجاز ہے۔ اس کا نفاذ ان پرانے دیہاتوں میں ہوا جہاں پیداوار میں اضافہ ہوا تھا۔ یہ مزید آمدنی سلطان کی نجی آمدنی (خالصہ) کا حصہ قرار پائی۔ نئے دیہات کی عام مالگزاری بھی سلطان کی نجی آمدنی تھی جو دو لاکھ ٹنکا تھی۔ سلطان اس رقم کو عالموں اور مذہبی بزرگوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔

نہروں کے علاوہ فیروز نے آبپاشی کے لیے متعدد بند بھی بنوائے۔ اُسے باغ لگوانے کا بھی بہت شوق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے دہلی کے قرب وجوار میں بارہ سو باغ لگوائے اور جن لوگوں کی زمینوں پر یہ باغ لگے سلطان نے ان لوگوں کو زمین کی قیمت بھی ادا کی۔ ان میں سے تیس باغ وہ تھے جنہیں علاء الدین نے لگوانا شروع کیا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ زیادہ تر باغوں میں سفید اور

کالے انگور کی بیلیں اور خشک میوے کے درخت تھے جن سے سلطان کو 1,80,000 ٹنکوں کی آمدنی ہوتی تھی۔

اپنے دور کے آخری برسوں میں فیروز نے زرعی ٹیکس کے نظام کو شرع کے مطابق بنانے کی کوشش کی۔ اس نے ایسے تمام ٹیکس منسوخ کر دیے جو شرع کے مطابق نہ تھے۔ اس زمانے کے مورخوں نے ایسے اکیس ٹیکس گنوائے ہیں۔ ان میں گھر پر لگایا گیا ٹیکس بھی تھا جس کا ذکر ہمیں علاء الدین کے زمانے میں ملتا ہے۔ کئی ایسے محصولوں کی صورت میں تھے جو پیداوار پر منڈیوں میں لگتے تھے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ اس طرح کے ٹیکسوں کے منسوخ کیے جانے سے کسانوں کو کتنا فائدہ پہنچا یا یہ کہ ان کو تنسیخ کا نفاذ کس حد تک ہوا کیونکہ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جن کو بعد میں اکبر نے اور پھر اورنگ زیب نے ختم کیا۔

صرف وہی ٹیکس لگانے کی اپنی پالیسی پر، جو شرع کے مطابق ہوں، فیروز کو غیر مسلموں کے جزیہ ادا کرنے پر اصرار کرنا پڑا۔ اگرچہ پہلے کے حکمراں بھی جزیہ لیتے تھے لیکن اسے زمین کے ٹیکس (خراج) میں شامل سمجھا جاتا تھا۔ اسے الگ سے شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ فیروز پہلا حکمراں تھا جس نے زمین کے ٹیکس کے علاوہ الگ سے جزیہ ٹیکس وصول کرنا شروع کیا۔ کسی حد تک اس ٹیکس نے افراد پر لگائے گئے رہائشی (گھر کے) ٹیکس کی جگہ لے لی۔

فیروز نے دہلی کے اطراف میں کئی شہر بسائے جن میں سے دو 'حصار فیروزہ' اور 'فیروز پور' کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ مشرقی یوپی میں اس نے جون پور تعمیر کروایا اس کو پھر سے ٹھیک کروایا اور جمنا کے کنارے ایک نیا دارالسلطنت 'فیروز آباد' تعمیر کروایا جس میں سے اب صرف قلعہ جسے کوٹلہ فیروز شاہ کہا جاتا ہے باقی رہ گیا ہے۔ اس شہر کا مشرقی حصہ 'رج' نام کی پہاڑی تک پھیلا ہوا تھا۔ خود شہر پانچ کوس یعنی دس میل کا تھا جس کے کچھ حصے بعد میں شاہجہاں آباد میں شامل ہو گئے جسے اب پرانی دہلی کہا جاتا ہے۔ فیروز نے بہت سے شہر ایک محسوس کی جانے والی ضرورت کے تحت آباد کیے یہ ان علاقوں میں ہونے والی زرعی ترقی کا مظہر تھے، جہاں کی پیداوار کے لیے منڈیوں کی اور ان کے لیے قصبوں کی تعمیر ضروری ہو گئی تھی۔ یہ شہر تجارت اور حرفوں کا مرکز بھی بنے، جن بارہ ہزار غلاموں کو مختلف حرفوں کی تربیت دی گئی تھی ان میں سے کچھ کو ایسے شہروں میں آباد کیا گیا تھا۔

اس طرح زرعی اور اس سے جڑی ہوئی شہری ترقی کے بارے میں فیروز کا تصور نمایاں طور پر جدید تصور تھا۔

فیروز عمارتوں کا بھی بہت شائق تھا۔ اس نے ایک شعبہ تعمیرات قائم کیا تھا جس نے بہت سی پرانی عمارتوں اور مقبروں کی مرمّت کی۔ اس نے قطب مینار کی بھی مرمت کروائی جس کی ایک منزل بجلی گرنے سے تباہ ہو گئی تھی اور اس کے قریب کی مسجد اور التتمش اور علاء الدین کے مقبروں کی مرمت اور درستی کروائی۔ اس نے شمسی تالاب کی اور حوضِ علائی کی (جواب حوضِ خاص کہلاتا ہے) صفائی اور مرمت کروائی جس میں پانی لانے والی نہر اَٹ گئی تھی۔ فیروز نے میرٹھ اور اس کے پاس سے اشوک کی دو لاٹ منگوائیں جن میں سے ایک کو فیروز آباد کے کوٹلے میں اور دوسری کو 'رج' پر بنی اپنی شکار گاہ میں نصب کروایا۔ مسافروں کے آرام کے لیے بہت سی سرائیں بنوائیں۔

فیروز نے 'فتوحات' میں اپنے کٹر مذہبی اقدامات کا ذکر کیا ہے لیکن اس میں شراب کشید کرنے پر پابندی لگانا شامل نہیں ہے۔ فیروز موسیقی اور گانا سننے کا بھی شائق تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد اور عیدین کے موقعوں پر وہ گانا سنا کرتا تھا۔ زندگی بھر اس کا یہی شعار رہا۔ شب برات بھی وہ بڑے کرّوفر سے مناتا تھا۔ بعد میں اورنگ زیب نے ان رسموں کو غیر اسلامی بتاتے ہوئے ممنوع قرار دے دیا۔

لیکن بوڑھا ہونے پر فیروز مذہبی معاملات میں زیادہ تنگ نظر اور کٹر ہوتا چلا گیا اگرچہ وہ اجودھن کے وسیع النظر صوفی بزرگ فریدالدین گنج شکر کا مرید تھا۔ 75-1374 میں سلطان بہرائچ میں سالار مسعود غازی کے مزار پر حاضر ہوئے تو خواب میں انہیں سالار مسعود نظر آئے جس کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ احتراماً اس نے اپنے سر کے بال اتروا دیئے۔ اس کے بہت سے امیروں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اسی کے بعد سلطان نے خلاف شرع سارے امور ممنوع قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ ایسے تمام ٹیکس منسوخ کر دیئے گئے جن کی شرع اجازت نہیں دیتی تھی اور ٹیکس وصول کرنے والے افسروں کو سخت ہدایات کیں کہ ایسا کوئی بھی ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔ اس نے محل میں بنی تصویروں میں سے انسانی شکلوں کو گھِس کر مٹا دینے کا حکم دیا۔ سونے اور چاندی کے برتنوں میں

کھانا پینا چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا۔ خالص ریشم کے اور خالص سونے چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے کپڑے یا جن پر انسانی شکلیں چھاپی گئی ہوں، ان کا پہننا منع کر دیا گیا۔

اس زمانے میں فیروز کے مذہبی کٹر پن کی بدترین مثال یہ ہے کہ اس نے ایک برہمن کو سر عام زندہ جلوادیا اس جرم میں کہ وہ اپنے گھر میں کھلے طور پر بتوں کی پوجا کیا کرتا تھا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے اور یہ کہ اس نے ایک مسلمان عورت کو بھی ہندو کر لیا تھا۔ فیروز نے برہمنوں سے بھی جزیہ وصول کرنے پر اصرار کیا جب کہ اس سے پہلے برہمن اس ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیے جاتے تھے۔ دہلی کے چاروں شہروں کے برہمنوں نے اس حکم پر احتجاج کرتے ہوئے بھوک ہڑتال کی لیکن فیروز نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ آخر وہاں کے ہندو برہمنوں پر لگائی گئی جزیہ کی رقم خود ادا کرنے پر راضی ہو گئے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ دوسرے شہروں میں بھی ایسا ہی کیا گیا یا نہیں۔

'فتوحات' میں فیروز کہتا ہے کہ جو ہندو جزیہ دیتے تھے انہیں امان حاصل ہوتی تھی۔ ان کی جائداد بھی محفوظ رہتی اور انہیں پوجا کرنے کی بھی اجازت ہوتی لیکن انھوں نے نئے مندر بنانے شروع کر دیئے جس کی شرع اجازت نہیں دیتی۔ ایسے مندروں کو اس نے گروادیا۔ ان میں دہلی کے قریب ایک گاؤں مالوا کا مندر بھی شامل ہے کیونکہ وہاں ہندوؤں نے ایک تالاب بنوایا تھا جہاں ایک تیوہار کے موقع پر ہندو مرد اور عورتیں اور مسلمان بھی جایا کرتے تھے۔ اسی طرح اس نے صالح پورا اور قصبہ گوہان میں بنوائے گئے مندر بھی گروادیے۔

شرع کو نافذ کرنے کے جوش میں اس نے شیعوں کے اسماعیلی فرقے کے رہنماؤں کو موت کی سزا دی۔ ایسی ہی سزا اس نے ان مسلمانوں کو بھی دی جن کے صوفیانہ عقائد کٹر مذہبی عقائد کے خلاف تھے۔ اپنے انہی عقائد کی بنا پر اس نے مسلمان عورتوں کے دہلی سے باہر بزرگوں کے مزارات پر جانے کی ممانعت کر دی تاکہ وہ بوالہوسوں کا نشانہ نہ بن جائیں۔

انفرادی زیادتیوں کے گنے چنے واقعات کو چھوڑ کر کوئی ایسے شواہد نہیں ملتے کہ ہندوؤں یا ذمیوں کو جو مذہبی آزادی ملی ہوئی تھی، فیروز نے اس میں کوئی کمی یا مداخلت کی ہو، نہ فیروز کے عہد کو بڑھتے ہوئے تعصب کا دور کہا جا سکتا ہے۔ درحقیقت یہ ہی وہ زمانہ تھا جب موسیقی اور

طب کے بارے میں سنسکرت کی بہت سی کتابیں فارسی زبان میں ترجمہ کی گئیں۔ فیروز، ہندو سرداروں کے ساتھ عزت اور احترام کا سلوک کرتا تھا۔ ان میں سے تین کو اس کے دربار میں نشستیں ملتی تھیں جو بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ پھر بھی کبھی کبھی اپنی سخت گیری اور دوسرے لوگوں کے مقابلے میں مذہبی علماء اور دیندار لوگوں کو ترجیح دینے اور کٹر علماء کی حیثیت کے مضبوط ہونے سے لوگوں کی بہبود اور مذہبی آزادی پر مبنی اپنی عام فلاح کی پالیسی کو بھی چھوڑنا پڑا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ایک مشترکہ حکمراں طبقہ کو جسے محمد بن تغلق نے شروع کیا تھا فیروز نے آگے بڑھنے سے روکا۔ لودیوں نے کسی حد تک اس پالیسی کو پھر سے اپنایا لیکن اکبر نے اس کو پوری طرح نافذ کیا۔

(v) دہلی سلطنت کا انتشار۔ اس کے اسباب:

فیروز کی آنکھ بند ہونے سے پہلے ہی سلطنت بکھرنی شروع ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے تو فیروز کے سب سے بڑے لڑکے شہزادہ محمد اور وزیر خانِ جہاں ثانی میں اقتدار کی کش مکش ہوئی۔ شاہزادہ محمد نے فیروز کی حمایت حاصل کر کے خانِ جہاں کو نکال دیا۔ فیروز نے شاہزادے کو شاہی مراتب عطا کیے اور اسے شریکِ سلطنت قرار دیا۔ یہ امر فیروز کے غلاموں کو ناپسند تھا جن کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی۔ اس جدوجہد میں فیروز نے غلاموں کا ساتھ دینے کی حماقت کی اور شہزادہ برطرف کر دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد 1388 میں فیروز کا انتقال ہو گیا اور اس کے بیٹوں اور پوتوں میں تاج کے لیے رسہ کشی شروع ہو گئی۔ غلاموں کے دستے نے بادشاہ گر بننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ وہ ہارے اور تتر بتر کر دیے گئے۔ کئی شہزادے تھوڑی مدت کے لیے تخت پر بیٹھے پھر 1394 میں نصیر الدین محمود تخت نشین ہوا اور 1412 میں تغلق خاندان کے خاتمے تک تخت سنبھالے رہا۔ اس دوران صوبے کے حاکموں نے آزادی کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے گجرات کے صوبے دار نے اور پھر پنجاب کے کوکھروں نے۔ پھر مالوا اور خاندیش کے صوبے داروں نے۔ اس کے فوراً بعد نصیر الدین محمود کے وزیر "خواجہ جہاں" نے قنوج سے بہار تک کے تمام اضلاع پر حکومت کرنے کی مراعت حاصل کر لی اور جونپور کی ریاست کی بنیاد پڑی۔ اسی زمانے میں مختلف ہندو راجاؤں نے باج دینا بند کر دیا اور یہ کہاوت مشہور ہوئی کہ "شاہ عالم (دہلی کے سلطان کا لقب، دنیا کا بادشاہ) کا حکم دہلی سے پالم تک چلتا ہے۔

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

دہلی سلطنت کی ٹوٹ پھوٹ کو تیمور نے پورا کر دیا جس نے 99-1398 میں دہلی اور آس پاس کے علاقوں کو تاراج کیا۔ حالانکہ اس کے بیٹے نے 97-1396 میں اوچھ اور دیپالپور فتح کر لیے تھے اور ملتان کا محاصرہ کر لیا تھا لیکن اس خطرے کا مقابلہ کرنے اور تیمور کے حملے کو روکنے کے لیے دہلی کے حکمرانوں نے کچھ نہیں کیا۔ تیمور نے نہ صرف دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں کو لوٹا اور تباہ کیا بلکہ اپنے قاعدے کے مطابق لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا جن میں سے بہت سے سنگتراش اور معمار تھے۔ ان سے اس نے سمرقند میں خوب صورت عمارتیں تعمیر کروائیں۔ لاہور، دیپالپور اور ملتان کے ضلع بھی اس نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے جن پر بعد میں بابر نے دعویٰ کیا۔ تیمور کے حملے کے سیاسی نتائج اس کے علاوہ اور کچھ نہیں نکلے۔

دہلی سلطنت کے زوال کے لیے کسی ایک سلطان کو ذمّے دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں علاقائی علیحدگی کے رجحانات زیادہ قوی تھے۔ بہت سے طاقتور راجہ ایسے تھے جو ایک بڑے قبیلے کے بانی یا سردار ہوتے تھے یا جن کا ایک خاص علاقے سے گہرا اور مضبوط تعلق ہوتا تھا۔ یہ لوگ جب بھی مرکزی حکومت میں کوئی کمزوری دیکھتے فوراً بغاوت کر بیٹھتے۔

انتشار کے ان عناصر کا سدّباب کرنے کے لیے سلطان پہلے غلاموں کی جماعت اکٹھی کرتے اور پھر ایسے لوگوں کو امیر مقرر کرتے جن کا سلطان کے علاوہ اور کوئی سہارا نہ ہو۔ اس کا اہم ذریعہ اقطاع کا نظام تھا۔ لیکن سلطانوں کو اس محدود حلقے میں بھی بعض طاقتور اور حوصلہ مند امیروں کو قابو میں رکھنا دشوار ہوتا جو خود اپنے زیرِ اثر ایک حلقہ یا علاقہ قائم کرنے کی جستجو میں لگے رہتے۔ اس طرح بنگال، سندھ، گجرات، دولت آباد جیسے دور دراز کے علاقے کے صوبہ داروں کو قابو میں رکھنا ہمیشہ دشوار ہوتا۔ اس سلسلے میں صرف اعلیٰ خاندان کے لوگوں کو امیر بنانے کی (بلبن کی) سلطان سے ذاتی وفاداری رکھنے والوں کو امیر مقرر کرنے اور ان پر 'مخبر' بھی تعینات کرنے کی (علاء الدین خلجی کی)، اور امیروں کو منتشر رکھنے کی (محمد بن تغلق کی) یکے بعد دیگرے سلطانوں کی مختلف کوششیں ناکام رہیں۔ اس لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ زیادہ تر وراثت کی بنیاد پر

اور جفاکشی میں ترک گھوڑسواروں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ شاید مغربی اور وسطی ایشیا میں لگاتار ترقی نے ہندوستان میں ان گھوڑوں کی آمد کو محدود رکھا۔ غور کے اطراف کے پہاڑوں میں معدنیات، خاص کر لوہے کے خزانے بھی موجود تھے اور وہاں اس علاقے کے دوسرے شہروں کی طرح جنگی سامان تیار کرنے کا رواج تھا۔ اس طرح ترکوں کے پاس گھوڑوں اور جنگی سامان دونوں کا کافی ذخیرہ موجود تھا۔ یہ دونوں ہی اس زمانے میں جنگ کے لیے اہم تھے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس زمانے میں مغربی ایشیا میں وہ جذبہ فروغ پا رہا تھا جسے 'غازی' ہونے کا جذبہ کہا جاتا تھا۔ یہ ایک نئے قسم کے جنگ باز تھے۔ ماوراء النہر اور اس کے ارد گرد کے علاقوں میں ایرانی اقتدار کی جگہ رفتہ رفتہ ترکوں نے لے لی تھی جن میں وہ خانہ بدوش ترک بھی شامل تھے جو ترکمان کہلاتے تھے۔ ایرانی اور ترک مسلمان حکمراں مسلسل خانہ بدوش، غیر مسلم ترکوں جیسے 'غز' یا 'اوغز' اور کراخطا اور وسطی ایشیا کے صحراؤں میں گھومنے والے دوسرے قبائل کے دباؤ میں رہتے تھے۔ اپنا تحفظ کرنے کے ساتھ ساتھ ہی ترک حکمراں وسطی ایشیا کے صحراؤں میں مستقل حملے کرتے رہتے تھے تاکہ وہاں سے نوجوانوں کو پکڑ سکیں جن کی سمرقند اور بخارا کے 'غلاموں کے بازار' میں بہت مانگ تھی۔ اس دفاعی اور جارحانہ جنگ کی ذمہ داری ان رضاکاروں کو سونپی گئی جن میں اسلام کے تحفظ اور اس کے پھیلانے کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ ان رضاکاروں کو باقاعدہ تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ اپنی لوٹ مار میں سے ہی یہ کچھ کما لیتے تھے۔ یہی رضاکار 'غازی' تھے۔

غازی ہونے کا جذبہ جو پہلے غیر مسلم ترکوں کے خلاف جنگ میں استعمال ہوتا تھا بعد میں ہندوستان میں کافروں (مشرکوں) کے خلاف استعمال کیا جانے لگا۔ اس تحریک کے ساتھ بہت قریبی رشتہ قائم کرنے والوں میں سب سے پہلا نام محمود غزنوی کا ہے جس کی زیادتیاں ہندوستان میں مشہور ہیں۔ دوسرا سنجر تھا جو ایک سلجوقی حاکم تھا جس کو خطائی (وسطی ایشیا) کے غور خاں کے غیر مسلم جتھوں کے ہاتھوں 43-1142 میں شکست فاش ہوئی۔ سنجر کی زندگی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کو غز کے ہاتھوں 1152 میں شکست ہوئی اور وہ گرفتار کر لیا گیا پھر وہ فرار ہو گیا لیکن کچھ عرصے بعد ہی اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس سے مسلمان ترکوں اور عام طور پر مسلمان حکمرانوں کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ اس دور میں کچھ مسلم خطوں میں وسطی ایشیا کے غیر مسلم

امیروں کا ایک چھوٹا طبقہ قائم رکھنے کی فیروز کی کوشش بھی کامیاب نہیں ہوئی۔

ایسی صورت میں مذہب سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی کیونکہ سلطنت کے قائم ہونے کے بعد خاص ٹکراؤ ہندو اور مسلمانوں میں نہیں رہ گیا تھا بلکہ خود مسلمانوں اور مسلمانوں میں تھا۔ مذہب کا نعرہ ہندو راجاؤں یا عام کسانوں کی لوٹ کو جائز قرار دینے کے لیے لگایا جاتا تھا۔

فوج کی بھرتی بھی ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ دہلی کے سلطانوں کا تعلق جب مغربی اور وسطی ایشیا سے کٹ گیا تو ان علاقوں سے ترک اور دوسرے لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنے کی امید ختم ہو گئی۔ اب انہیں (ا) اُن افغانوں کو جو ہندوستان میں آباد تھے، (ب) ان ترکی سپاہیوں کی اولاد کو جو فتوحات کے زمانے میں ہندوستان آگئے تھے، (ج) منگولوں یا نو مسلموں کو (د) ہندوؤں میں سے جنگجو قوموں (جیسے کہ راجپوت، جاٹ وغیرہ) کے لوگوں کو ہی فوج میں بھرتی کرنا پڑتا۔ ان میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے مسائل تھے۔ فیروز نے ترک اور منگولوں کی اولاد کو ترجیح دی اور ان کی وراثت قائم کی۔ اس نے نو مسلموں کو غلاموں کے دستے میں شامل کیا۔ دونوں میں سے کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ نسلی سپاہی ناکارہ اور غلاموں کا دستہ خود غرض اور بے وفا نکلا۔ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کا مخالف تھا۔

سلطانوں کو ایک بڑا مسئلہ یہ بھی درپیش تھا کہ ان کے بعد کون سلطان ہو؟ اگر امیر خوشی سے اس بات پر راضی ہو جائے کہ کامیاب سلطان کی اولاد میں سے ہی کوئی اس کا جانشین ہو تب بھی چونکہ سب سے بڑے بیٹے کو سلطان بنانے کا کوئی قاعدہ نہیں تھا اس لیے اولادوں میں جھگڑا ہوتا اور امراء بھی اپنے اپنے مفاد کی خاطر ان میں الگ الگ بٹ جاتے۔

■■■

-8-

دہلی سلطنت کے تحت حکومت اور انتظامیہ

(تیرھویں، چودھویں صدی)

دہلی سلطنت کے تحت انتظامیہ کا جو ڈھانچہ ابھرا وہ بنیادی طور پر عباسی طرزِ حکومت اور اس کے بعد غزنوی اور سلجوقی نظامِ حکومت پر مبنی تھا۔ اس پر ایرانی انتظامیہ اور کسی قدر ہندوستان کے حالات اور یہاں کی روایات کا بھی اثر تھا۔ مغربی ایشیا جس میں ایران بھی شامل تھا، اور ہندوستان، دونوں جگہ خود مختار بادشاہت کی دیرینہ روایت چلی آ رہی تھی جس میں وزیروں کی ایک کاؤنسل بادشاہ کی مدد کرتی تھی۔ اس طرح ہمیں انتظامیہ کے متعدد شعبے بلکہ افسر بھی ایسے نظر آتے ہیں جو فی الحقیقت نئے نام سے پرانے شعبوں کا ہی روپ ہیں۔ بہر حال، ترک اب اِس حد پر آگئے تھے کہ انھوں نے بھی کچھ ایسے نئے شعبے اور انتظامیہ کے تصورات ابھار لیے جنھوں نے قوت اور اقتدار میں مرکزیت لانے کے لیے وہ بنیاد فراہم کر دی جو ہندوستان میں پہلے موجود نہیں تھی۔

(ا) سلطان:

بعض مفکرین کے مطابق شخصی سلطنت اسلامی تصور ہی نہیں ہے اور اصل میں یہ حالات کے زیرِ اثر رفتہ رفتہ وجود میں آگئی۔ اسلام میں حکومت کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ایک امام ہوتا تھا جسے مسلمان چنتے تھے، وہ سیدھی سادی زندگی گزارتا تھا، اور اس کی ذات میں سیاسی اور روحانی دونوں قسم کے اختیارات مجتمع ہوتے تھے۔ بہر حال، خلافتِ عباسیہ کے خاتمے سے سلاطین وجود میں آئے جو صرف دنیاوی اختیارات کے حامل تھے۔ رفتہ رفتہ سلطان کا مرتبہ بڑھتا گیا، اور اس طرح وہ صرف انتظامیہ کا محور، فوج کا سپہ سالارِ اعظم اور تمام عدالتی معاملات میں منصفِ اعلیٰ ہی نہیں رہ گیا بلکہ وہ پورے معاشرے اور سیاست کا مرکز بھی ہو گیا اور ایک عالی شان دربار بھی کرنے لگا۔ عوام میں اب اُس کا عظیم رتبہ تھا۔ وہ عزت و اقتدار کا منبع اور سرچشمہ تھا، وہی سرپرست

تھا، اور اس وجہ سے ہر طرح کے لوگ، علماء فضلاء، موسیقار، فنکار، شعراء اور مذہبی افراد وغیرہ سب اُس کے دربار کی طرف بڑی تعداد میں کھنچے چلے آرہے تھے۔ طاقت اور اقتدار کی متواتر پھیلتی ہوئی اس مہک کے اثر سے بہت سے مفکروں نے بادشاہ کے ساتھ اُلوہی یا دینی خصوصیات بھی وابستہ کرنی شروع کر دیں۔ ہندو تصور کے مطابق حکمراں، بھگوان کا انسانی روپ ہوتا ہے۔ ایرانی تصورات، جن کا اسلام پر بڑا گہرا اثر تھا، اُن کے مطابق بھی بادشاہت کے عہدے میں اُلوہی اثرات شامل تھے۔ برنی کے مطابق بادشاہ کا قلب خدا کا آئینہ تھا یعنی وہ اللہ کی منشاء کا مظہر تھا جس کا مطلب یہ بھی تھا کہ بادشاہ کے افعال پر نکتہ چینی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اِنہی تصورات اور جذبات کے اثرات کو مستحکم کرنے کے لیے بلبن نے ظلِ اللہ کا خطاب اختیار کیا (جس کا مطلب ہے اللہ کا سایہ)، اور 'سجدہ' اور 'پابوس' (پیر چھونا) جیسے طریقے شروع کیے جو اسلامی شریعت میں صرف اللہ کے لیے وقف ہیں۔

اس سلسلے میں دو سوال اٹھتے ہیں: کیا عہد وسطیٰ کا سلطان فی الحقیقت ایسا مطلق العنان بادشاہ تھا جس کے اختیارات لامتناہی یا بے روک ٹوک تھے؟ اور دوسرے 'ہندوستان میں اس مرکزیت حاصل کر لینے میں ترک سلطانوں کو کسی ادارے کی بنیاد یا پشت پناہی حاصل تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے' اور صحیح بھی لگتا ہے کہ بالکل بے روک ٹوک یا بے لگام قسم کی شخصی مطلق العنانیت محض ایک وہم یا بے بنیاد تصور ہے کیونکہ کسی عام سماج میں کوئی شخص' خواہ وہ کتنا بھی طاقتور ہو' اسے اپنے اردگرد کے افراد کے اس زمرے کی امیدوں' تمناؤں اور رائے کا ضرور کچھ نہ کچھ خیال رکھنا پڑتا ہے جنکی مدد بغیر کام کر ہی نہیں سکتا۔ پھر اسے اپنی رعیّت یا آبادی کی کم سے کم خاموش حمایت بھی حاصل کرنی ضروری ہوتی ہے۔ مگر یہاں زیرِ غور مسئلہ یہ ہے کہ حکمرانوں پر کسی قسم کے ادارے کی پابندیاں یا حدیں عائد ہوتی تھیں یا نہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں نظریوں کے مطابق مذہب ہی کسی شہنشاہ پر سب سے اہم بندش یا روکاوٹ تھا۔ بادشاہ کے لیے ضروری تھا کہ وہ مذہب کے دیے ہوئے مقاصد کو مجموعی طور پر پورا کرنے کی کوشش کرتا رہے اور اس کے دیے ہوئے اخلاقی معیاروں کو پورا کرتے ہوئے اپنے فرائض انجام دے۔ کچھ مفکروں کے خیال میں اگر کوئی حکمراں ان چیزوں کی پابندی نہیں کرتا تو ملک کے لوگ اسے معزول کر سکتے ہیں اور اس سلسلے میں

مذہبی رہنماؤں کو عوام کی مدد کرنی چاہئے۔ بہر حال اس سلسلے میں اتفاق رائے کبھی نہیں رہا اور کچھ مفکر اسے خدا پر چھوڑ کر خاموش رہے۔ عملی طور پر حکمراں 'دھرم شاستر' یا 'شرع' کو مجموعی طور پر مانتا تھا یا اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتا تھا اور اس کے بعد اسے سیاسی کاموں میں کھلی چھوٹ دے دی جاتی تھی۔ دوسری طرف گو کہ وقتاً فوقتاً بے لگام قسم کے جابر اور مطلق العنان حکمراں تاریخ میں نظر آتے رہے، مگر اس کے باوجود بھی بحیثیت مجموعی حکمرانوں کے سیاسی رویئے پر مذہب جس طرح اثر انداز ہوتا تھا اسے بالکل فراموش بھی نہیں کیا جا سکتا۔

مغربی دنیا میں 'کلیسا کے علاوہ' شاہی استبدادیت پر اگر کسی ادارے کی طرف سے کچھ حدود یا پابندیاں عائد ہوتی تھیں تو وہ وہاں کے امراء کا موروثی سلسلہ تھا۔ مگر ترکوں کے سلسلے میں ایسا کوئی سلسلہ امراء بھی نظر نہیں آتا۔ حکمراں کسی کو امیر مقرر کرنے میں بھی خود مختار تھا اور وہ کسی کو بھی فوجی اور انتظامی امور میں وسیع اختیارات دے سکتا تھا۔ یہ نظام جس کی جڑیں سلجوقی نظام میں نظر آتی ہیں، بعد میں جہاں جہاں بھی اسلامی سلطنتیں قائم ہوئیں، وہاں مستقل صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ جیسا کے ہم پہلے دیکھ چکے ہیں اس میں مقررہ امیر کو فوجی اور انتظامی کافی وسیع اختیارات تو حاصل ہو جاتے تھے مگر اسے زمین پر کسی قسم کی موروثی حقوق نہیں حاصل ہوتے تھے اور وہ سلطان کی مرضی کے مطابق کسی وقت بھی منتقل کیے جا سکتے تھے۔ چنانچہ خاندانی حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ پچھلے اقتداروں کا برطرف کر دیا جانا لگ بھگ یقینی تھا۔ چنانچہ جب جلال الدین خلجی نے تخت نشینی کے بعد پرانے امراء کے بارے میں معلومات فراہم کیں تو معلوم ہوا کہ بلبن کے عہد کے بہت سے ممتاز امراء اپنے عہدوں سے برطرف کیے جانے، اور اقطاع کے تلف ہونے کے بعد مفلسی اور گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

ایک اور ادارہ جس نے کچھ عرصے سلطانوں کی طاقت اور اختیارات کو مضبوطی یا توسیع کے مواقع فراہم کیے وہ 'غلامی' کا سلسلہ تھا۔ اس ادارہ نے سلطان کو اس بات کے لیے مزید مواقع فراہم کیے کہ وہ اپنے ان پسندیدہ افراد کو آگے بڑھنے اور مضبوط ہونے دے جنھیں وہ پسند کرتا ہے اور جو پوری طرح صرف سلطان پر ہی منحصر ہیں۔ لیکن التتمش کے انتقال کے بعد چہلگانی ترکی افسروں اور دوسرے افسروں کے درمیان ابھرے نزاع نے اس سیاسی آلۂ کار کو بھی کمزور کر دیا اور

رفتہ رفتہ یہ بالکل ناکارہ ہو گیا۔ اسے فیروز تغلق نے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش بھی کی مگر مقابلتاً اب اس کا کردار مثبت کی بجائے منفی زیادہ ثابت ہوا۔ انفرادی غلامی کا سلسلہ چلتا رہا مگر اس کا سیاسی کردار یا اس کی اہمیت ختم ہو گئی۔ اس طرح سلطنت دور میں غلاموں کی سیاسی اہمیت کو ابتدائی دور کے علاوہ بہت زیادہ اہمیت دینا صحیح نہیں ہے۔

بلبن اور علاء الدین خلجی کے ذاتی یا انفرادی طاقت و اختیار، جس کی دوسری مثال ملنا مشکل ہے اس پر دو قسم کی رکاوٹیں یا حدود نظر آتی ہیں۔ اسلام میں کہیں بھی جانشینی کے سلسلے میں کوئی بنیادی یا اصول متعین نہیں تھے۔ انتخاب کے طریقے کو فاتح حکمرانوں نے نامزدگی سے بدل دیا تھا۔ لیکن اس کا انحصار بھی نامزد شدہ فرد کے امراء پر اثر اور اس کی فوجی صلاحیت و قابلیت پر ہوتا تھا، اور چونکہ سب سے بڑے بیٹے کی جانشینی کا اصول بھی پوری طرح مستحکم نہیں تھا اس لیے نامزدگی کے باوجود دوسرے دعوے داروں کے لیے حکومت حاصل کر لینے کی کوششوں کی گنجائش موجود تھی۔ متعدد موقعوں پر ایسے تمام دعوے داروں میں سے کسی ایک پُرجوش اور مستعد امیر نے باقی دعویداروں کا صفایا کر کے تختِ سلطنت پر قبضہ کر لیا اور دوسرے امراء نے اسے تسلیم بھی کر لیا۔ اس طریقے سے شخصی حکومت کے اقتدار و اختیار کو کسی حد تک دھکا ہی لگا چونکہ اس صورت میں کوئی بھی قابل اور اولوالعزم فوجی افسر حالات کو سمجھتے ہوئے اپنی قسمت آزما سکتا تھا۔ پھر بھی جانشینی کے مسئلے نے صرف چند مواقع کے استثناء کے ساتھ ترکی نظامِ حکومت کو کسی طرح کمزور نہیں کیا کیونکہ ہمیشہ کمزور اور ناقابل جانشین کو ہٹا کر مستعد اور لائق جانشین جلد ہی تخت پر بٹھا دیا گیا۔ خود امراء کے درمیان اقتدار کی کشمکش شاہی اختیار و اقتدار پر دوسری رکاوٹ تھی۔ مگر یہ مسئلہ بلبن کے اختیارات پر پوری گرفت حاصل کر لینے کے وقت تک لگ بھگ پوری طرح حل ہو چکا تھا۔ محمد بن تغلق کے دور میں جو بغاوتیں ہوئیں اُن کی مخصوص وجوہات تھیں جن پر پہلے لکھا جا چکا ہے۔ بہر طور، اپنے تمام مسائل کے باوجود شہنشاہیت ہی پورے سلطنت دور میں حکمرانی اور حکومت کا محور اور مرکز رہی۔

وزارتیں:

حکمرانی کے عمل میں سلطان کو بہت سے وزیر مدد دیتے تھے۔ ان وزیروں یا محکموں اور شعبوں کی تعداد جن کے سربراہ یہ وزیر ہوتے تھے متعین نہیں تھی۔ برنی ایک بیان میں، جس میں بلبن کا بیٹا بغرا خاں، اپنے بیٹے کو، جو دہلی پر حکومت کر رہا تھا، مشورہ دیتا ہے کہ وہ کسی مشیر پر انحصار نہ رکھے، حالانکہ وزیر ہی اُن میں بنیادی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ وہ چار ممتاز مشیروں کا ذکر کرتا ہے اور اسی کے ساتھ چار شعبوں کا نام بھی لیتا ہے۔ بہر حال، چار کا عدد محض اشارتا تھا۔ محکموں کی تعداد بدل سکتی تھی، بلکہ حقیقت میں بدلی بھی اور عملی طور پر شہنشاہ جس معتبر شخص سے چاہے مشورہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ فخر الدین جو دلّی کا صرف ایک کوتوال تھا اُسے بلبن کا اور اس کے بعد علاء الدین خلجی کا اعتماد حاصل تھا۔ وزیروں کی کوئی کاؤنسل تشکیل نہیں دی جاتی تھی کیونکہ مشترکہ ذمہ داری کا تصور ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ ہر ایک وزیر کو بادشاہ منتخب کرتا تھا اور وہ اُس وقت تک اپنے فرائض انجام دیتا تھا جب تک بادشاہ چاہے۔ بادشاہ کا مشیر خاص وزیر ہوتا تھا اور وہی عام طور پر حکومت کے پورے آلۂ کارکا نگراں بھی مانا جاتا تھا۔ اس کے کاموں میں مخصوص کام مالیات کے شعبے کا انتظام ہوتا تھا۔

وزیر:

وزیر کی صلاحیت، لیاقت، حکومت میں اس کے کردار اور اختیارات وغیرہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ سلجوقیوں کے وزیر نظام الملک، جن کی کتاب 'سیاست نامہ' نے مسلم سیاسی فلسفے اور فکر پر گہری چھاپ چھوڑی ہے، ان کے مطابق وزیر کو 'اہلِ کتاب' یعنی جنگجو کے مقابلے میں صاحبِ علم و فضل ہونا چاہیے۔ اُسے وسیع تجربے کار فہیم وذکی اور ہوشمند ہونا چاہیئے تاکہ اُس سے حکمراں کسی مسئلے یا کسی شعبے میں مشورہ کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی اُسے موقع شناس بھی ہونا چاہیے کیونکہ اسے امراء پر، ان میں سے کسی کو ناخوش کیے بغیر اُن پر گرفت بھی رکھنی ہوتی ہے۔ طاقتور وزیر نے ملک کے پورے انتظامیہ پر گرفت رکھنے کے ساتھ ساتھ فوجی مہموں کے کام بھی انجام دیے ہیں۔ یہ صورت اس وقت تک ناگزیر تھی جب تک سلطنت کا اپنا کردار عسکری تھا۔ بہر حال کسی مضبوط

اور طاقت ور حکمراں کے وزیر کے پاس اتنے ہی اقتدار و اختیارات ہوتے تھے جتنے حکمراں پسند کرتا تھا۔ مسلم سیاسی مفکروں نے اس صورت کے لیے کچھ اس طرح کا ایک کلیہ وضع کرنے کی کوشش کی۔ اُن کے مطابق دو قسم کے وزیر ہوتے تھے۔ وزیر تفویض یعنی وہ وزیر جسے اپنا جانشین مقرر کرنے کے علاوہ ہر طرح کے لامحدود اختیارات حاصل ہوتے تھے، اور دوسرا وزیر تنقید جو صرف حکمراں کے احکامات کی تعمیل کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ بہر حال مفروضے سے زیرِ غور مسئلے کا حل حاصل نہیں ہوتا۔ اصل میں حکمراں ایک ایسا وزیر چاہتا تھا جو اسے روزانہ کی ذمے داریوں اور الجھنوں سے سبکدوش رکھنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو مگر ساتھ ہی اتنا طاقت ور بھی نہ ہو جو اس کے اپنے اقتدار کو کم کرے یا اسے معزول کر سکے۔ اس مسئلے کے حل کے سلسلے میں متعدد تجربے کیے گئے۔ بعض موقعوں پر کوئی وزیر مقرر ہی نہیں کیا گیا، کبھی اس کی ذمہ داریوں کو تقسیم کر دیا گیا، کبھی کچھ ایسے محکمے قائم کر دیے گئے جو اس کے مدِ مقابل ہوں، یا کبھی کبھی اُس کی حیثیت و اقتدار کو پوری طرح ابھرنے نہ دیا گیا۔ مجموعی طور پر تیرھویں صدی اور چودھویں صدی کے پہلے چوتھائی حصے میں یہ تجربات عمل میں آئے جو تغلق اقتدار کے ساتھ ابھرے اور اپنا اثر و اقتدار قائم کیا۔

التتمش کا وزیر فخر الدین عصامی بغداد کے محکموں میں تیس برس کام کا تجربہ حاصل کیے ہوئے ایک بوڑھا شخص تھا۔ جلدی ہی اس کی جگہ محمد جنیدی نے لے لی جسے نظام الملک کا خطاب بھی عطا ہوا۔ محمد جنیدی مضبوط شخصیت کا مالک تھا۔ بہر حال اسے رضیہ کی مخالفت کی قیمت اپنے عہدے سے ہی نہیں اپنی جان سے چکانی پڑی۔ رضیہ کی موت کے بعد مہذب غنوی کچھ عرصے کے لیے بادشاہ گر کے روپ میں اُبھرا مگر بلبن کے عروج کے ساتھ ساتھ اس کا زوال ہوا۔ بلبن نے اپنے دور کے سب سے صاحب اقتدار اور طاقتور امیر کی حیثیت سے دعویٰ کیا اور اُسے نائب السلطنت یعنی سلطان کا نائب کا خطاب ملا بھی۔ بہر طور بلبن نے کل اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھے اور وزیر اس کے سایے میں رہ کر ہی اپنے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ پھر بعد میں جب ناصر الدین محمود کو معزول کر کے بلبن خود تخت نشین ہوا تو نائب السلطنت کا عہدہ ہی اس نے ختم کر دیا۔ بلبن خود اتنی مضبوط اور چھا جانے والی شخصیت کا مالک تھا کہ اس کی ماتحتی میں کوئی وزیر عروج پا ہی نہیں سکتا تھا۔ حالانکہ بلبن نے خواجہ حسن نام کے ایک شخص کو اپنا وزیر مقرر بھی کیا تھا مگر چونکہ اُسے

لگان کے معاملات سے بہت کم واقفیت تھی اس لیے وہ برائے نام ہی وزیر تھا۔ بلبن کی طرف سے اپنے معتمد خاص احمد ایاز کو 'عارضِ ممالک' کی جگہ مقرر کیے جانے پر وزیر کے اختیارات اور قوت میں مزید کمی آ گئی۔ اب عارض ممالک ہی فوج کی تیاری اور اس کو ادائیگیوں کا ذمہ دار تھا۔ بلبن نے ایک نائب وزیر بھی مقرر کیا۔

عہدۂ وزارت کے اختیارات علاء الدین خلجی کے دورِ حکومت تک زوال پذیر ہی رہے۔ خواجہ خاطر جو لگان کے معاملات میں خصوصی لیاقت رکھتا تھا اور جو بلبن کے عہدِ حکومت میں نائب وزیر رہ چکا تھا، اُسے علاء الدین خلجی نے کچھ عرصے کے لیے وزیر مقرر کیا مگر جلدی ہی اُس کی جگہ نصرت خاں نے لے لی جو سلطان کا بھائی تھا اور جانا مانا جنگجو تھا۔ جب نصرت خاں کی موت واقع ہوئی تو یہ عہدہ بادشاہ کے مقرب اور ممتاز جنرل، ملک کافور کو سونپا گیا۔ اس کے پاس وزیر کا عہدہ اور نائب السلطنت کا عہدہ، دونوں ایک ساتھ تھے۔ علاء الدین کی موت کے بعد ملک کافور نے نائب کی حیثیت سے بادشاہ گر کا کردار ادا کرنا چاہا لیکن خسرو ملک نے یہ جگہ سنبھالی اور آخر میں خود تخت نشین ہو گیا۔

اس طرح نائب کا عہدہ کچھ عتاب اور بدنامی کی زد میں آ کر تغلق دور کے شروع ہونے پر ختم کر دیا گیا۔ کچھ بعد میں پندرھویں صدی میں سید حکمرانوں میں اس عہدے میں وکیل السلطنت کے نام سے ایک بار پھر جان ڈالی گئی اور یہ مغل عہد کی ابتدا تک عروج و زوال دیکھتا ہوا قائم رہا۔

تغلق دور ہندوستان میں وزارت کے عہدے یا ادارے کے انتہائی عروج کا دور مانا جا سکتا ہے۔ غیاث الدین تغلق کے کچھ تجربوں کے بعد محمد بن تغلق نے احمد ایاز کو خان جہاں کے خطاب کے ساتھ اپنا وزیر مقرر کیا۔ خانِ جہاں ایک معمر آدمی تھا اور غیاث الدین تغلق کے زمانے میں امورِ عامہ (پبلک ورکس) کے شعبے میں کام کر چکا تھا۔ اُسے عام طور پر ایک سخت گیر مگر لائق شخص مانا جاتا تھا۔ سلطان کو اس پر اس حد تک اعتماد تھا کہ جب وہ خود فوجی مہموں یا بغاوتوں کو فرو کرنے نکلتا تھا تو دہلی کے انتظامی امور اسی کو سونپ کر جاتا تھا۔ یہ محمد بن تغلق کے اٹھائیس سالہ دورِ حکومت میں متواتر وزیر رہا مگر محمد بن تغلق پر اس کا کتنا اثر تھا اور اس کی پالیسیوں یا تصورات پر یہ کس حد تک اثر انداز ہوتا تھا اس سلسلے میں معلومات موجود نہیں ہیں۔ اس نے اپنے ارد گرد اپنے

حمایتیوں کا کوئی گروہ ابھارنے کی یا تو خود کوشش نہیں کی یا اسے اس کا موقع یا اجازت نہیں دی گئی جس کے نتیجے میں محمد بن تغلق کی موت کے بعد جب اس نے دہلی کی سلطنت کے لیے اپنا پسندیدہ شخص آگے بڑھانے کی کوشش کی تو وہ بری طرح ناکام ہو گیا۔

فیروز تغلق نے اپنا وزیر خانِ جہاں مقبول کو مقرر کیا جو تیلنگ' برہمن سے مسلمان ہوا تھا اور پچھلے وزیر کا نائب رہ چکا تھا۔ اس حقیقت سے کہ فیروز تغلق جیسے قدامت پسند مذہبی فرمانروا نے کسی نو مسلم کو اتنی اعلیٰ جگہ پر متعین کر لیا، اس بات کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ دہلی سلطنت تصوراتی اعتبار سے بلبن سے کتنی دور یا کتنی آگے بڑھ چکی تھی۔ مقبول ایک لائق وزیر تھا اور فیروز تمام معاملات میں اس پر اس حد تک اعتماد کرتا تھا کہ جب وہ بنگال اور اڑیسہ جیسی اہم اور طویل مہموں پر گیا تو دہلی کے تمام معاملات اسی کو سونپ گیا۔ مگر ساتھ ہی یہ سوچنا بھی غلط ہوگا کہ انتظامیہ میں فیروز کوئی دلچسپی ہی نہیں لیتا تھا اور خانِ جہاں مقبول مختار کل تھا۔ چنانچہ جب وزیر اور آڈیٹر جنرل عین الملک ماہرو کے درمیان سخت اختلافات رونما ہوئے اور وزیر نے آڈیٹر جنرل کا تبادلہ کرنا چاہا تو فیروز نے مداخلت کی اور کسی نہ کسی طرح دونوں میں مصالحت کرائی۔ یہ بات صحیح مانی جانی چاہیئے کہ خانِ جہاں کی کامیابی فیروز کو بنائے رکھنے یا اس کے لیے انتظامات کو صحیح رکھنے میں تھی نہ کہ طاقت واختیار کا کوئی مدِ مقابل مرکز ابھارنے میں۔

جب 69-1368 میں اٹھارہ برس وزیر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے بعد خانِ جہاں کا انتقال ہوا، تو معاہدے کے مطابق اس کے بیٹے جونا خان کو اس کی جگہ پر خانِ جہاں کے خطاب کے ساتھ مقرر کیا گیا۔ خانِ جہاں (دوم) کو اگر اپنے باپ سے زیادہ لائق وزیر نہ بھی کہا جائے تو کم سے کم وہ اس کے ہم پلہ ضرور تھا۔ مگر وہ اچھا فوجی رہنما نہیں تھا چنانچہ وہ جانشینی کی کھینچ تان میں جو فیروز کی زندگی میں ہی شروع ہو گئی تھی مات کھا گیا۔ اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ بہر حال اس پر عاید کیا گیا یہ الزام کے وہ کسی طرح اپنے نامزد کردہ شخص کو تخت نشین کرانا چاہتا تھا، اسے آر۔پی۔ ترپاٹھی جیسے بہت سے جدید تاریخ داں تسلیم نہیں کرتے۔

تغلق سلطانوں کے دور میں وزراء کا صرف عزت واحترام ہی بہت زیادہ نہیں تھا انھیں تنخواہیں بھی بہت زیادہ ملتی تھیں۔ محمد بن تغلق کے زمانے میں اعلیٰ ترین حیثیت پر فائز امیر خان کی

تنخواہ کئی لاکھ سالانہ تھی۔ خانِ جہاں کو جو تنخواہ ملتی تھی وہ عراق کی آمدنی کے برابر تھی۔ فیروز کے زمانے میں خانِ جہاں کو اس کی فوج کے اخراجات اور اس کے خدمتگاروں کے تنخواہ کے علاوہ 13 لاکھ ٹنکے تنخواہ کے طور پر ملتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے ہر لڑکے کو وجہ (تنخواہ) کے طور پر 11,000 ٹنکے اور اس کے دامادوں میں سے ہر ایک کو ان سے بھی زیادہ 15,000 ٹنکے ملتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خانِ جہاں مقبول ہر سال سلطان کو 4 لاکھ ٹنکے پیش کرنے کی حیثیت میں تھا۔

دیوانِ وزارت یعنی وزیر کا محکمہ بھی آہستہ آہستہ منظم ہوتا چلا گیا۔ عباسی دورِ حکومت میں بھی ایک مشرف ہوا کرتا تھا جو اخراجات کا نگراں ہوتا تھا اور ایک مستوفی جو غالبًا آمدنی کا نگران ہوتا تھا ایک خزانچی بھی ہوتا تھا۔ ہندوستان میں یہ عہدے التتمش کے دور سے جاری رہے جس نے وزیر کے پاس کاموں کے بہت بار کو دیکھ کر اس کا ایک نائب بھی مقرر کیا تھا جو اس کا مددگار ہوتا تھا۔ بلبن کے عہد سے 'عارضِ ممالک' کے تقرر کے ساتھ جو فوجی معاملات دیکھتا تھا وزیر کے محکمے کا مدنی (سوِلین) کردار اور واضح ہو گیا۔ پھر بھی تغلق سلطانوں کے عروج تک وزیر کا عہدہ مدنی انتظامیہ کے سربراہ کی حیثیت سے مستحکم نہیں ہو پایا۔ یوں بھی اس عسکری دور میں کسی بھی امیر کو، جس میں وزیر بھی شامل تھا، اگر اسے حکم دیا جائے تو فوجی خدمات انجام دینے کے لائق ہونا ضروری تھا۔ اس طرح سول اور فوجی خدمات میں کوئی واضح امتیاز ممکن نہیں تھا۔ لیکن صرف مذہبی اور قضاء یا محکمہ عدل کے افسران اس سے مستثنا تھے۔

علاء الدین خلجی کے دوآب (خالصہ) علاقے کو براہِ راست انتظامیہ کے تحت لانے کے ساتھ لگان (وصولی) کے محکمے میں بہت تیزی سے توسیع ہوئی اور سینکڑوں کی تعداد میں عامل، متصرف (کلکٹر) وغیرہ کا تقرر ہوا۔ ان پر گرفت رکھنے کے لیے ایک اور محکمہ 'دیوانِ مستخراج' قائم کیا گیا۔ بہر حال یہ محکمہ جلدی ہی بدنامی کی زد میں آگیا کیونکہ اس کے اکثر عاملوں اور اہلکاروں نے وصولیابی کرنے والوں سے حساب کتاب کرنے میں اور ان سے بقایا وصول کرنے میں بہت سختی برتی۔ علاء الدین خلجی کی موت کے بعد غالبًا اس محکمے کو ختم ہی کر دیا گیا لیکن عامل اور وصولیابی کے اہلکار موجود رہے اور محمد بن تغلق کے عہد میں محکمے کو ایک نئی شکل دینے کی کوشش کی گئی۔ اب اس محکمے کے افسران زرعی ترقی کے لیے بھی اگر زیادہ نہیں تو کم سے کم اتنے ہی ذمے دار تھے۔ چنانچہ

ترکوں کے خلاف جدو جہد کرنے میں کامیاب نہیں رہے۔ آخر میں انھوں نے منگولوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

خراسان اور ایران میں جنگی مہارت کے عروج میں چند ادارے بھی مثبتی طور پر مددگار ثابت ہوئے۔ ان میں سب سے اہم اقطاع کا نظام تھا۔ اقطاع ایک قطعہ زمین کے بارے میں بادشاہ کی طرف سے ایک سند ہوتی تھی جو اقطاع داروں کو یہ اختیار دیتی تھی کہ وہ کسانوں سے لگان اور دوسرے ٹیکس وصول کر سکیں جو صوبے کا محصول تھا۔ لیکن اقطاع دار کو یہ اختیار ہرگز نہیں تھا کہ وہ اراضی کے موجودہ حقوق میں دخل دیں یا اسے کسان یا اس کے بیوی بچوں یا اس کی دولت پر اختیار ہے۔ اقطاع کے بدلے میں اسے ایک مختصر فوج رکھنے کی اجازت تھی جسے سلطان کے حکم پر اس کے سامنے پیش کرنا پڑتا تھا۔ یہ نظام ترکی سلطانوں کو مناسب لگتا تھا کیوں کہ اس کا مطلب تھا کہ مقامی مالکان زمین، جنھیں 'دہقان' کہا جاتا تھا، مروجہ حقوق میں دخل اندازی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی ترک فوجی حاکم کا زمین پر کوئی موروثی اختیار ہوگا۔ ان کا پورا انحصار سلطان پر ہی ہوتا تھا جو انہیں کبھی بھی اور کہیں بھی بھیج سکتا تھا۔ یہ ایک انتہائی گشتی فوجی طاقت تھی جس کا انحصار حاکم کی مدد اور پشت پناہی پر تھا جو ترک سلاطین کے زیر سایہ مسلم طاقت کے مزید فروغ کا باعث ثابت ہوا۔

(ii) ہندوستان کی سمت ترکوں کی پیش قدمی اور ہندو شاہی:

یہ صرف وقت کا سوال تھا کہ لوٹ مار کرتے پھرنے والے یہ منظم سخت جان خانہ بدوش ہندوستان کی طرف بھی توجہ کرتے جو سونے کی سرزمین سمجھی جاتی تھی۔

پہلے بتایا جاتا ہے کہ 870 عیسوی میں بالآخر ازبکستان کہ یعقوب خان نے فتح کر لیا جو پڑوسی ایرانی سیستان کا حاکم تھا۔ بادشاہ قتل ہوا اور عوام کو مسلمان بنالیا گیا۔ 963 عیسوی میں الپتگین نے جو خراسان کے سامانی حکمرانوں کا ایک سپہ سالار تھا، جنوبی ازبکستاں میں واقع غزنی کی طرف کوچ کیا اور اپنے آپ کو ایک آزاد حکمراں قرار دے دیا۔ افغانستاں کے ہندو حکمرانوں نے جو ہندو شاہی کہلاتے تھے غزنی کے سامانی گورنر، ملتان کے قریبی علاقوں کے بااثر بھٹی حکمرانوں اور بولان گھاٹی کے اس پار ملتان کے لیے مسلمان امیر کے ساتھ مل کر اپنی سرحد پر اس ابھرتے ہوئے

ایک علاحدہ امیر کی سربراہی میں ایک نیا محکمہ 'دیوانِ کوہی' قائم ہوا اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس کا انجام بھی ناکامی میں ہوا۔

محکمہ مال کے ڈھانچے کو فیروز کے عہد میں پوری طرح مستحکم کر دیا گیا۔ مشرف اور مستوفی کے فرائض کو وضاحت سے طے کر دیا گیا، اوّل الذکر بنیادی طور پر آمدنی کا نگراں تھا اور موخر الذکر اخراجات کا۔ 'مشرف اعلیٰ' اور 'مستوفی اعلیٰ' اعلیٰ حیثیت کے افسر تھے اور ان کا تقرر خود سلطان کرتا تھا۔ لیکن یہ وزیر کے ماتحت ہوتے تھے۔ بہر حال اختیارات پر نگرانی اور توازن رکھنے کا یہ نظام عام طور پر وزیر کو پسند نہیں آتا تھا اور کبھی کبھی سلطان کو مداخلت کر کے صلح و صفائی کرنے کی ضرورت بھی پیش آجاتی تھی۔

فیروز نے ایک علاحدہ افسر کے تحت غلاموں کا بھی ایک محکمہ قائم کیا اور اسی طرح سلطان کی براہِ راست آمدنی کے لیے اِملاک کا محکمہ منظم کیا گیا۔

دیوانِ عرض:

عارضِ ممالک کی بنیادی ذمے داری فوج کی بھرتی، سازو سامان کی فراہمی اور فوجی سلسلے کی ادائیگی تھی۔ عارض فوج کا سپہ سالارِ اعظم (کمانڈر اِن چیف) نہیں ہوتا تھا چونکہ سپہ سالارِ اعظم خود سلطان ہی ہوتا تھا۔ لیکن عارض کوئی بہت اعلیٰ حیثیت کا امیر ہوتا تھا اور اپنے طور پر مانا ہوا جنگجو بھی ہوتا تھا۔ عارض کو سپاہیوں کا دوست اور خیر خواہ تصور کیا جاتا تھا اور اس سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ ان سے اپنی اولاد کی طرح سلوک کرے گا۔ عارض کا عہدہ خلافتِ عباسیہ میں بھی موجود تھا اور 'سیاست نامہ' میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ غالباً التمش کے دور میں بھی یہ عہدہ موجود تھا کیونکہ برنی کا بیان ہے کہ احمد ایاز 'رواتِ عرض'، جس کا تقرر 'عارضِ ممالک' کی حیثیت سے بلبن نے کیا تھا وہ شمسی سلاطین کے عہد میں تیس سال اس عہدے پر قائم رہا۔ بلبن اس عہدے کو وزیر سے زیادہ اہم مانتا تھا۔ "یہاں تک کہ احمد ایاز نے سب کو علی الاعلان باخبر کیا کہ یہاں جو لوگ جمع ہیں وہ سن لیں کہ نظامِ حکومت اور انتظامیہ کا ممد و محافظ اعلیٰ 'میں' ہوں۔"

بہر حال اس محکمے کے کاموں اور فرائض کو علاء الدین خلجی کے عہد میں صحیح طور پر

منظم کیا گیااور اس کے ساتھ ہی گھوڑوں کوداغ کرنے کے طریقے کو بھی مستحکم کیا گیا تا کہ سلطان کے سامنے گھٹیا قسم کے گھوڑے پیش نہ ہوں چونکہ ترک حکمرانوں کادارومدار ایک مستعد سوار فوج پر سب سے زیادہ تھا۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ علاء الدین نے بازار پر کس طرح مکمل گرفت رکھ کراس بات کو یقینی بنالیا تھا کہ حکومت کو اچھے قسم کے گھوڑے مقررہ قیمت پر فراہم ہوتے رہیں۔ اس نے سپاہیوں کے متعلق تفصیلی معلومات (چہرہ) کے طریقے کو بھی رائج کیا تا کہ فوجی رجسٹر پر غیر تربیت یافتہ ناقابلِ اعتبار اور غیر ضروری نام نہ چڑھیں اور فرضی سپاہیوں کے نام پر تنخواہوں کی رقم نہ نکالی جائے۔ یہ سلسلہ یوں تو فیروز تک چلتا رہا لیکن اس سے بھی دھوکے دھڑی کے خلاف پوری ضمانت نہ حاصل ہو سکی۔ فیروز نے اس تجربے کے بعد اسے تسلیم بھی کیا جب اس نے ایک سپاہی کو ایک سونے کا سکہ دے کر کسی کلرک سے ایک گھٹیا قسم کا گھوڑا پاس کروالیا۔

'میر حاجب' شاہی اصطبل کا سپرنٹنڈنٹ یا نگراں، جس عہدے پر رضیہ کے دورِ حکومت میں ملک یاقوت فائز تھا اور 'داروغہ فیل' ہاتھیوں کے اصطبل کا نگراں یہ دونوں عہدے جب تک عریض کا محکمہ پوری طرح منظم نہیں ہوا، اہم سمجھے جاتے تھے۔ اس کے بعد مشکل سے ہی کسی امیر کا نام ان عہدوں پر نظر آتا ہے۔

اس کی بھی معلومات موجود نہیں ہیں کہ فوج کی بھرتی اور اس کی تربیت کس طرح ہوتی تھی۔ اس بطوطہ کے مطابق جو محمد بن تغلق کے عہدِ حکومت میں ہندوستان آیا تھا، جب کوئی ملتان کے گورنر کی فوج میں تیر انداز کے طور پر بھرتی ہونا چاہتا تھا تو مختلف قسم کی سخت کمانیں دے کر اس کی طاقت کی جانچ کی جاتی تھی۔ اگر اُسے سوار کے طور پر بھرتی ہونا ہوتا تھا تو ایک نشانہ لگا دیا جاتا تھا جسے اسے اپنے نیزے سے اٹھانا ہوتا تھا اور سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے پر سوار اسے زمین پر رکھے ایک چھلے کو اپنے نیزے سے اٹھانا ہوتا تھا۔ گھوڑ سوار تیر انداز کو اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے ایک گیند کو نشانہ بنانا ہوتا تھا۔ یہ ایک عام طریقہ کار کا حصہ ہوتا تھا اور بھرتی کے بعد مذکورہ تربیت کا کام جاری رہتا ہوگا۔

ایسا لگتا ہے کہ ایک مرکزی فوج بھی موجود ہوگی۔ شاہی محافظ دستہ (رائل باڈی گارڈ) اسی کا ایک حصہ ہوگا۔ لیکن اس فوج کی تعداد یا طاقت کا کوئی تخمینہ موجود نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ

علاء الدین خلجی کی فوج 3,00,000 سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ محمد بن تغلق کی فوج اس سے بھی زیادہ تھی۔ ظاہر ہے یہ ساری فوج دہلی میں نہ رہتی ہوگی۔ بڑے اقطاع دار جن کے انتظام کے تحت بڑے اور وسیع علاقے تھے وہ بھی اپنی علاحدہ فوج رکھتے ہوں گے۔ علاقوں کے سرداروں کی بھی اپنی اپنی الگ فوج تھی۔ ضرورت پڑنے پر یہ دونوں فوجیں شاہی جھنڈے کے نیچے جمع کی جاسکتی تھیں۔ چنانچہ جب بلبن بنگال کی مہم سر کرنے چلا ہے تو مشرقی علاقوں کے ہندو سرداروں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی اپنی فوج کے ساتھ شامل ہو جائیں جب کہ خود بلبن نے اس علاقے سے 2,00,000 سپاہیوں کی اپنی فوج میں مزید بھرتی کی۔ جب سے منگولوں کے عروج نے ترکی حکمرانوں کو مغربی ایشیا سے لگ بھگ الگ تھلگ کیا تھا تو فوج کے سلسلے میں ان کا انحصار ہندوستانی مسلمانوں اور افغانستانیوں پر بڑھتا چلا جارہا تھا۔ اس طرح ترکی حکمرانوں کی فوج ایک مرکب سی ہوتی تھی جس میں اصلی ترکی سپاہیوں کی اولادیں اور افغان اور ہندوستانی مسلمان ہوتے تھے اور ان میں ہندو سرداروں کے دستے بھی شامل ہو جاتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اتنی بڑی فوج کو تنخواہ وغیرہ کی ادائیگی بڑی مشکل ذمے داری تھی۔ کسانوں سے زمینی لگان وصول کرنے کے علاوہ آس پاس کے ملکوں میں لوٹ مار سے حاصل کر لینا پرانا دستور چلا آرہا تھا جسے ترکوں نے بھی اپنا لیا، لیکن اسے مقدس جنگ 'جہاد' کا نام دے دیا۔ علاء الدین خلجی کے زمانے سے سپاہیوں کو نقد تنخواہ دی جانے لگی۔ گھوڑے کے ساتھ ایک سپاہی کی 238 ٹنکے کی تنخواہ جو علاء الدین خلجی نے مقرر کی تھی وہ کم تھی۔ مگر اس کے بعد یہ کتنی تھی اس کا علم نہیں ہے۔ بہر حال اس مرکزی فوجی طاقت کی مستعدی اور وفاداری ہی دہلی سلطنت کے استحکام میں سب سے اہم کردار ادا کرتی تھی۔

اس طرح عارض کا عہدہ بڑی اہمیت کا حامل تھا اور یہ وزیر کے اختیارات کو بھی کسی قدر محدود کرتا تھا۔ اس کے نتیجے میں بعد کے وزیروں میں سے کوئی بھی اتنا مضبوط فوجی افسر نہ ہو سکا جو اپنے نامزد کردہ شخص کو تخت نشین کرا سکے یا خود بادشاہ کا جانشین بن کر تاج و تخت حاصل کر سکے۔ یہ صورتِ حال صرف ان حالات میں پیدا ہوئی جب تباہ کن جنگوں کے سلسلے سے انتظامیہ کے ڈھانچے میں دراڑیں پڑ گئیں جیسا کہ فیروز کی موت اور تیمور کے حملے کے بعد ہمیں نظر آتا ہے۔

دیوانِ انشاء:

۱۰

دیوانِ انشاء امورِ خارجہ کا محکمہ نہیں تھا۔ اس زمانے میں مختلف ممالک کے درمیان تعلقات میں اتنا تسلسل پیدا نہیں ہوا تھا کہ کسی علاحدہ محکمہ خارجہ یا وزیر خارجہ کی ضرورت پیش آئے۔ بہر حال، وزیر کے فرائض میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ پڑوسی ملک کے حالات پر متواتر نگاہ رکھے اور اُن سے حکمراں کو مطلع کرتا رہے۔ کبھی کبھی پڑوسی حکمراں اور شہروں کو باقاعدہ شاہی تحریریں بھیجی جاتی تھیں جن کے ذریعے نئی تخت نشینی یا کسی اہم واقعے۔ مثال کے طور پر فتح۔ کی اطلاع دی جاتی تھی۔ اس قسم کی تحریریں اور خطوط بڑے ادبی انداز اور شان و شوکت کے اظہار کے ساتھ تیار کیے جاتے تھے، ان کی خوبصورت نقلیں کی جاتی تھیں اور دیوانِ انشاء انھیں بھیجتا تھا۔ اس دفتر کا نگراں ایک دبیر یا دبیر خاص ہوتا تھا۔ اہم اقطاع داروں اور آس پاس کے راجاؤں کو بھی دبیر ہی مختلف قسم کے خطوط اور پیغامات وغیرہ بھیجنے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ یہ بڑی اہمیت اور ذمہ داری کا عہدہ تھا اور اس کے لیے حکمراں سے ذہنی قربت اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی تھی، اور چونکہ اسے سلطان کا اعتماد حاصل ہوتا تھا اس لیے دبیر وزیر کا حریف بھی ہو سکتا تھا اور اس کے اختیارات پر ایک روک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھی دبیر خاص کا عہدہ وزارت کے عہدے کے لیے ایک زینہ بھی بن جاتا تھا۔

دیوانِ رسالت:

دیوانِ رسالت اُن چار خاص وزارتوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر برنی نے کیا ہے، لیکن اس کے کاموں کو اس نے بیان نہیں کیا ہے اور موجودہ تاریخ دانوں میں اُس کے فرائض کے بارے میں خاصے گہرے اختلافات نظر آتے ہیں۔ کچھ اسے امورِ خارجہ کا محکمہ مانتے ہیں، کچھ اسے قیمتوں اور عوام کے اخلاقی معاملات پر گرفت رکھنے والا محکمہ کہتے ہیں۔ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ یہ عوام کی شکایتیں سننے والا محکمہ تھا۔ اس کے عنوان یا نام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس محکمہ کا تعلق دینی یا مقدس امور سے ہوگا کیونکہ رسالت لفظ رسول یا پیغمبر سے لیا گیا ہے۔ عہدِ وسطیٰ کی سلطنتوں کے کاموں میں ایک کام مسلمان مذہبی افراد، علماء و فضلاء اور گوشہ نشین قسم کے لوگوں کو بے لگان

زمینوں (املاک) کی صورت میں وظیفے دینا بھی تھا۔ اس مذہبی امور کے شعبے کا نگراں یا تو صدرِ جہاں یا وکیلِ دار ہوتا تھا جسے رسولِ دار بھی کہا جاتا تھا۔

صدرِ جہاں کے علاوہ ایک اہم عہدہ قاضیِ اعظم یا قاضی القضاۃ کا ہوتا تھا جو محکمۂ عدل کا نگراں یا صدر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی صدرِ جہاں اور قاضیِ اعظم کے عہدے ایک ہی عہدے میں ضم بھی کر دیے جاتے تھے۔ وظائف اور بے لگان زمینیں عطا کرنے کے علاوہ صدر کے محکمے کا ایک کام عوامی اخلاق کے نگراں محتسبوں کا تقرر کرنا بھی تھا۔ یہ افسر عصمت فروشی وغیرہ کی نگرانی کرتے تھے اور یہ دیکھتے تھے کہ مسلمان شرع میں ممنوعہ امور، جیسے شراب خوری وغیرہ عام طور پر نہ کریں، اور شرعی پابندیوں جیسے نماز جماعت، روزہ وغیرہ کی خلاف ورزی نہ کریں۔ یہی افسر پیمانوں اور وزنوں کی جانچ پڑتال بھی کرتے تھے اور مجموعی طور پر عام اشیاء کی قیمتوں پر بھی نگاہ رکھتے تھے۔ یہ تمام امور بھی دیوانِ رسالت کے دائرۂ اختیار میں آتے تھے۔

دیوانِ رسالت کے کاموں کو یکجا بھی کیا جاسکتا تھا اور ان کے لیے علیحدہ دفاتر بھی قائم کیے جاسکتے تھے۔ جس زمانے میں علاء الدین خلجی بازاروں پر گرفت رکھنے کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے مختلف بازاروں پر نگاہ رکھنے کے لیے شحنہ مقرر کیا اور ان کے کام کی نگرانی کے لیے ایک بڑے امیر کو مقرر کیا گیا۔ یہ دیوانِ رسالت کہلاتا تھا۔ علاء الدین خلجی کی موت اور بازاروں پر گرفت کے طریقے کے خاتمے کے بعد اس محکمے کا بھی ذکر نہیں ملتا۔

فیروز تغلق جس نے عالموں، مولویوں اور طالب علموں کے لیے وظائف اور املاک (بے لگان زمینوں) کے عطیات میں اضافہ کیا اس نے کچھ شرعی سزاؤں کو منسوخ کرنے کی طرف بھی توجہ دی جن میں ہاتھ، ناک، کان وغیرہ کاٹ کر لوگوں کو بدشکل کیا جانا شامل تھا۔ وہ خود کو انسان دوست قسم کے حکمراں کے روپ میں بھی پیش کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے صدر اور قاضی القضاۃ کے محکموں کو علاحدہ کیا۔ اس نے عوام کی شکایات سننے والا ایک محکمہ بھی قائم کیا اور اسے دیوان رسالت کا نام دیا۔ اس کا سربراہ کوئی ممتاز امیر غالباً وکیلِ دار ہوتا تھا۔ وزیر اور شہزادے تک اپنی شکایات کے مداوا کے لیے اس محکمے سے رجوع کر سکتے تھے۔

اس طرح دیوانِ رسالت کا روپ مختلف حکمرانوں کے زمانے میں مختلف رہا ہے لیکن

ضرورت مندوں میں وظائف اور بے لگان زمینوں کی تقسیم کا کام غالباً تمام عرصے اس کے پاس ہی رہا ہے۔

(ب) دربار اور شاہی حرم (خاندان):

ایسی صورت میں کہ جہاں سلطان طاقت و اختیار کا مرکز ہو، وہاں شاہی دربار اور شاہی خاندان کی تنظیم کی اہمیت بنیادی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ بہر حال سلطنت دور میں مغلیہ دور کے برخلاف دربار اور شاہی حرم کا نگراں ایک ہی افسر نہیں ہوتا تھا۔

شاہی حرم کے امور کا سب سے اہم افسر وکیل در ہوتا تھا۔ وہی شاہی حرم کے تمام کاموں کا نگراں ہوتا تھا اور وہی سلطان کے ذاتی خدمتگاروں اور اہلکاروں کی تنخواہوں اور عطیات کی نگرانی کرتا تھا۔ اس میں شاہی مطبخ (باورچی خانہ) شراب کا شعبہ اور شاہی اصطبل بھی شامل تھے۔ شاہزادوں کی تعلیم کی ذمے داری بھی اسی کی ہوتی تھی۔ درباریوں، شہزادوں سلطان کے ذاتی خدمتگاروں حتیٰ کہ ملکاؤں کو بھی اپنے لیے کچھ حاصل کرنے کی غرض سے اس کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح یہ عہدہ بڑا نازک اور اہم تھا اور کسی بہت اعلیٰ رتبے کے امیر کو سونپا جاتا تھا۔ دربار اور حرم سے ملحق ایک اور اہم عہدہ 'امیر حاجب' کا ہوتا تھا۔ اسے باربک بھی کہتے تھے۔ یہ دربار کی تقریبات کا مالک و مختار ہوتا تھا۔ دربار میں امراء کی حسبِ مراتب جگہیں یا نشستیں مرتب کرنا بھی اسی کا کام تھا۔ سلطان کے سامنے پیش کی جانے والی تمام درخواستیں اور استغاثے بھی اسی کے توسط سے یا اس کے ماتحت افسروں کے توسط سے آگے بڑھتے تھے جنھیں حاجب کہا جاتا تھا۔ یہ عہدہ اتنا اہم اور ایسا نازک تھا کہ کبھی کبھی اس پر صرف شاہی خاندان کے لوگ یا خونی رشتہ رکھنے والے لوگ ہی مقرر کیے جاتے تھے۔

شاہی حرم سے متعلق ایک اور اہم شعبہ بریدِ خاص کا تھا جو جاسوسی یا خبر رسانی شعبے کا سربراہ ہوتا تھا۔ جاسوس یا برید سلطنت کے مختلف حصوں میں مقرر کیے جاتے تھے۔ سلطان کو اپنے علاقے کے تمام معاملات سے مطلع رکھنا انہی کی ذمے داری ہوتی تھی۔ بلبن اور علاء الدین خلجی کے ہاتھ میں اپنے امراء پر گرفت رکھنے اور انھیں ہراساں رکھنے کا سب سے اہم ہتھیار یہی تھا۔

ان کے علاوہ کچھ کمتر درجے کے افسر بھی ہوتے تھے جیسے شکار کا منتظم، شاہی مجالس کا

نگراں وغیرہ جنھیں نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال دو محکمے جن کا ذکر مناسب ہے ان میں ایک کارخانہ یا شاہی اسٹور اور دوسرا امورِ عامہ (پبلک ورکس) کا شعبہ تھا۔ کارخانہ شاہی ضرورتوں اور شاہی حرم کے لیے تمام ضروری اشیاء کی پیداوار اور فراہمی کا ذمے دار تھا۔ ان اشیاء میں کھانے پینے کی اشیاء، چارہ، روشنی کا سامان، تیل، لباس، فرنیچر، خیمے وغیرہ شامل تھے۔ فیروز تغلق کارخانوں کو بہت اہمیت دیتا تھا اور ان شعبوں میں کام کرنے والے بہت سے غلام بہت اچھے کاریگر اور دستکار ہو گئے تھے۔ ریشمی اور اونی چوغے جو محمد بن تغلق سال میں دوبار اپنے امراء میں تقسیم کرتا تھا انہیں شاہی کارخانوں میں تیار ہوتے تھے۔ ہر کارخانے کا کوئی اعلیٰ مرتبہ امیر نگراں ہوتا تھا اور اس کی مدد کے لیے بہت بڑی تعداد میں محاسب (اکاؤنٹنٹس) اور سپروائزروں کا عملہ ہوتا تھا۔ علاء الدین خلجی کے زمانے میں امورِ عامہ (دیوانِ عمارات) کی بھی اہمیت بڑھی گو کہ عمارتوں کا شہزادہ فیروز تھا جس نے صرف پرانی عمارتوں، سرایوں، مقبروں وغیرہ کی مرمت ہی نہیں کروائی بلکہ نہریں بھی کھدوائیں اور بہت سے نئے شہر تعمیر کروائے۔ چنانچہ اس کے عہد میں ایک الگ شعبہ ملک غازی کی سربراہی میں تشکیل دیا گیا اور اسے 'میر عمارات' کہا گیا۔

(ج) صوبائی اور علاقائی (لوکل) حکومتیں:

سلطنت دور میں صوبائی اور علاقائی حکومتوں کے ڈھانچے اور طریقۂ کار کے متعلق بہت کم معلومات موجود ہیں۔ شروع شروع میں سلطنت خود ایک ڈھیلا یا لچک دار ڈھانچہ کہی جاسکتی ہے جو متعدد فوجی کمانوں (علاقوں) پر مشتمل تھی۔ اس کی کوئی سمت مشکل سے ہی متعین کی جاسکتی ہے کیونکہ کمان دار اپنے اپنے علاقوں میں ہندو سرداروں کو زیر نگیں کرنے اور ان سے اپنی فوج کے اخراجات پورے کرنے کے لیے رقمیں حاصل کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ ایسی صورتِ حال میں پورے قلمرو میں کسی یکساں مدنی انتظامیہ کا سوال ہی مشکل سے پیدا ہو سکتا تھا مگر رفتہ رفتہ یہ صورتِ حال بدلتی چلی گئی۔ خلجی دور اس سلسلے کا عبوری دور کہا جاسکتا ہے۔

خلجی دور میں ہمیں 'والی' اور 'مقطی' کے نام نظر آتے ہیں جو ان ٹکڑوں کے کماندار اور منتظم ہوتے تھے جنھیں اقطاع یا ولایت کہا جاتا تھا۔ ان الفاظ کے لیے جو قریب ترین یا متوازی اصطلاح دی جاسکتی ہے وہ صوبہ ہے اور ان کے سربراہ کے لیے گورنر ہے۔ گورنر یا مقطی کے

اختیارات حالات کی مناسبت سے مختلف ہوتے تھے۔ لکھنوتی کا گورنر تقریباً خود مختار تھا اور ایک سے زیادہ بار خود کو سلطان بھی کہلوا چکا تھا اور اسے تابعدار کرنے کے لیے فوجی مہمیں بھی بھیجی جا چکی تھیں۔ بہر حال جیسا کچھ ماہرینِ قانون نے کوشش کی ہے انھیں لامحدود یا محدود اختیارات والے گورنروں کے خانوں میں رکھنے سے کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہے۔ چونکہ جیسے جیسے ہندوستان میں مرکزیت یا مرکزی اثر واقتدار پھیلتا گیا صوبائی گورنروں کو مرکزی گرفت کے دائرے میں آنا پڑا۔ دوسری صورت یہی تھی کہ وہ خود کو باغی قرار دیے جانے کے لیے تیار ہوں۔ شروع میں مقطی اپنے اقطاع کے انتظامیہ کا پوری طرح ذمے دار ہوتا تھا جس میں ایک فوج رکھنا بھی شامل تھا تا کہ جب سلطان کو ضرورت ہو تو اس کی طلب پر وہ فوج بھیج سکے۔ وہی اپنی فوج کے اخراجات کا بھی ذمے دار ہوتا تھا۔ خود اپنے اخراجات بھی پورے کرتا تھا اور سلطان کو بھی رقمیں بھیجتا تھا مگر اس کی بنیاد واضح نہیں تھی۔ بعد میں بلبن کے عہد سے مقطی اپنے اور اپنی فوج کے اخراجات پورے کرنے کے بعد بقیہ رقم (فواضل) بھیجتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مرکزی شعبۂ مالیات نے اقطاع کی متوقع آمدنی اور اقطاع کی فوج کے اخراجات اور مقطی کے ذاتی اخراجات کا تخمینہ مکمل کر لیا تھا۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں اس طریقۂ کار میں اور سختی آگئی۔ یہاں تک کہ مقطیوں کو لگان کا وہ تخمینہ تسلیم کرنا ہوتا تھا جو علاء الدین خلجی نے دوآب کے ان علاقوں کے لیے مقرر کیا تھا جو خالصہ کہلاتے تھے اور جس کی آمدنی براہِ راست شاہی خزانے میں جاتی تھی اور جس سے سپاہیوں کو نقد تنخواہ ادا کی جاتی تھی۔

جیسے جیسے مرکزی گرفت بڑھی ویسے ویسے مقطیوں کے انتظام پر بھی گرفت بڑھی۔ نائب دیوان (جو خواجہ بھی کہلاتا تھا) جو صوبوں میں لگان کے انتظامیہ کا نگراں ہوتا تھا اب مرکز کی طرف سے مقرر کیا جانے لگا۔ ایک 'برید' جاسوس افسر بھی صوبے میں متعین ہوتا تا کہ وہ سلطان کو حالات سے باخبر رکھے۔ مگر ایسا بھی لگتا ہے کہ مقطی بھی اپنے سپاہی مقرر کرتا اور ایک نائب عارض مرکز میں رکھتا جو اس کی ترجمانی کر سکے۔ یہ بات بہر حال صاف نہیں ہے کہ قاضی کا تقرر کون کرتا تھا۔ قاضیوں کے خلاف یا گورنر کی زیادتیوں یا طرزِ عمل کے خلاف سلطان کے سامنے استغاثہ کیا جا سکتا تھا۔ گورنر خود بھی اپنے اقطاع میں سے عالموں کو بے لگان زمینیں عطا کر سکتا تھا۔

محمد بن تغلق کے عہد میں کچھ ایسے گورنروں کے تقرر کی بھی اطلاعات ہیں جنھیں

لگان۔ زراعت (Revenue-farming) کی شرائط پر بھی مقرر کیا گیا تھا۔ آمدنی کو بڑھانے کا یہ طریقہ ایک معکوس قدم کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس سے محاصل کے معاملات سے مرکز کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ ایسے گورنروں کو مرکز کی خدمات کیلیے سپاہی رکھنے ضروری نہیں تھے۔ سپاہیوں کو ایک الگ افسر کے تحت رکھا جاتا تھا۔ طریقۂ کار کا یہ دوہراپن زیادہ دن نہ چل سکا اور اسے فیروز کے عہد میں ترک کر دیا گیا۔

برنی کے قول کے مطابق جب تک جنوبی علاقہ شامل نہیں تھا کل بیس صوبے تھے۔ لیکن اکبر کے دور کے صوبوں کے مقابلے میں یہ صوبے چھوٹے تھے۔ چنانچہ موجودہ اترپردیش میں سے وسطی دوآب، میرٹھ، برن (موجودہ بلند شہر) اور کول (موجودہ علی گڑھ) میں تقسیم تھا۔ دوسرے تین صوبے شمال مغرب میں تھے۔ مغل انداز کے صوبے فی الحقیقت محمد بن تغلق کے دور سے شروع ہوئے۔ اس کے عہد حکومت میں صوبوں کی کل تعداد ایک عرب لکھنے والے شہاب الدین عمر کے مطابق چوبیس تھی جس میں مالابار تک پورا ملک تقسیم تھا۔ ہمارے پاس اس قسم کی بھی معلومات موجود نہیں ہیں کہ صوبے سے نیچے ضلع یا تعلقہ وغیرہ جیسی کچھ چھوٹی انتظامی اکائیاں موجود تھیں یا نہیں۔ افغان تاریخوں میں شِقوں اور سرکاروں کا ذکر تو ضرور ملتا ہے جو لودیوں اور سوریوں کے معاملات سے تعلق رکھتی تھیں مگر یہ حالات اکبر کے عہد میں لکھے گئے تھے اس لیے یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ ممکن ہے یہ انتظامیہ اکائیاں بعد میں وجود میں آئی ہوں۔ بہرحال، پرگنہ صدی، (سو کی اکائی) اور چوراسی (84 کی اکائی) کا ذکر ضرور مل جاتا ہے۔ صدی دیہاتوں کے مجموعے کو کہتے تھے۔ تعداد میں تبدیلی بھی ہو سکتی تھی۔ غالباً چودھری جو موروثی مالکِ زمین ہوتا تھا یا کوئی عامل یا لگان وصول کرنے والا وہاں مقرر کر دیا جاتا تھا، خاص طور پر اگر وہ علاقہ خالصہ کے تحت آتا ہو۔ خوط اور مقدم کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اوّل الذکر ایک یا ایک سے زیادہ گاؤوں کا زمیندار ہوتا تھا جبکہ موخرالذکر گاؤں کا مکھیا ہوتا تھا۔ پٹواری بھی ایک دیہی افسر ہوتا تھا کیونکہ بیان کیا جاتا ہے کہ علاء الدین خلجی نے عاملوں اور متصرفوں کی دھوکادھڑیوں کی تحقیق کے لیے پٹواریوں کے حساب کتاب کے کھاتوں کی چھان بین کی تھی اور انھیں سخت سزائیں دی تھیں۔

اس طرح حکومت کا ایک بنیادی یا ابتدائی قسم کا نظام جسے کسی حد تک ہندو حکمرانوں کے

نظام سے بھی لیا گیا تھا، وہ گاؤں کی حد تک موجود تھا۔

اس طرح رفتہ رفتہ ایک نئی مرکزی بنیاد کی حکومت ابھری، ظاہر ہے اس سلسلے میں پہلا قدم مرکزی حکومت کا استحکام اور جماؤ تھا۔ جیسے جیسے مرکزی حکومت مضبوط ہوئی اور اس میں خود اعتمادی آتی گئی وہ ملک کے مختلف حصوں اور دیہی علاقوں پر مرکزی گرفت مضبوط کرتی چلی گئی، جس کا سیدھا مطلب تھا دیہی علاقوں پر قابض سرداروں کے اثر و اقتدار میں تخفیف۔ اس سے ایک طویل اور متواتر کشمکش کا سلسلہ بھی چلا اور جب تک دہلی سلطنت منتشر نہیں ہوئی کوئی بالکل واضح اور محکم شکل پیدا نہ ہو سکی۔ اس کام کو بعد میں مغلوں نے سنبھالا۔

■■■

خطرے کامقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ حکمراں ہندوشاہی حکمراں جے پال کے ساتھ شامل ہونے کے لیے اس لیے تیار ہوگئے کیوں کہ یہ خود غزنی کے حکمرانوں کے ذریعہ اپنے علاقوں میں غلام پکڑنے والے چھاپہ ماروں سے پریشان تھے۔ لیکن جے پال کا غزنی پر حملہ ناکام ہوگیااور اس نے جو گروہ بنایا تھاوہ جلد ہی بکھر گیا۔ سبکتگین نے جوالپتگین کا جانشین تھا(977) ہندوشاہی علاقوں میں لڑائی کو جاری رکھااور لمغان کے سرحدی راستے یعنی کابل اور جلال آباد کو تباہ کر دیا۔ تقریباً 91-990 میں ہندوشاہی حکمراں کو فیصلہ کن شکست ہوئی۔ سترھویں صدی کا تاریخ داں فرشتہ بتاتا ہے کہ اس لڑائی میں دہلی،اجمیر، کالنجر اور قنوج کے راجپوت حکمرانوں نے جے پال کی مدد کی تھی لیکن جدید تاریخ داں اس قول کی صحت پر شبہ کرتے ہیں کیوں کہ کسی دوسرے ہم عصر تاریخ داں نے اس کاذکر نہیں کیاہےاور نہ ہی دہلی اس دور میں کوئی اہم صوبہ تھا،اجمیر تعمیر نہیں ہوا تھا اور قنوج کے حکمرانوں کازوال تھا۔ چنانچہ ایسالگتاہے کہ فرشتہ کا یہ بیان غزنویوں کی فتح کو بڑھا کر بتانے کی خواہش پر بنی ہے۔ ہم عصر تاریخ داں عتبی کا کہناہے کہ ”اس وقت سے ہندوشاہیوں نے اپنی دم دبالی اورانھوں نے غزنی کے علاقوں میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔“

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دسویں صدی کے خاتمہ تک ہندوستان کے بیرونی دفاعی قلعے ازبکستان اور افغانستان ختم ہو چکے تھے۔اس لیے اگلاقدم ہندوستان پر فوج کشی تھا۔اس فوج کشی کی تیاری کے لیے غزنی کے یمنی حاکموں نے غزنی سے کابل اور جلال آباد تک سڑک کے رابطے کو بہتر بنایا۔اسی دوران ہندوشاہی حاکم جے پال نے مغرب کی سمت اپنے ہارے ہوئے علاقوں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے مشرق کی طرف اپنا اقتدار بڑھانے کی کوشش کی اوراس طرح وہ 991 میں لوہوارا(لاہور) تک پہنچ گیا۔ مقامی حاکموں کو کچھ عرصے تک جاگیرداروں کی حیثیت سے حکومت کرنے کی اجازت دی لیکن 999 میں لاہور کو شاہی حکومت میں ملالیا گیاجواب پشاور سے دریائے بیاس تک پھیلی ہوئی تھی۔

999 میں محمود غزنی کا حکمراں بنا۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ ہر سال ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ بیرونی چوکیوں پر شروع کے حملوں کے بعد 1001 میں اس نے شاہیوں کے خلاف حملہ کیا۔ پشاور کے قریب جو گھمسان لڑائی لڑی گئی اس میں محمود کی فوجوں کے پاس 15,000 بہترین

-9-

دہلی سلطنت کے دور میں شمالی ہندوستان کی معاشی اور سماجی زندگی

تیرھویں صدی سے شروع ہوئے ترکی سلطانوں کے عہدِ حکومت میں شمالی ہندوستان کی زندگی پر معاشی اور سماجی اعتبار سے کیا اثر پڑا، اس سلسلے میں تاریخ کے عالموں میں کافی اختلاف ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ اس علاقے کی معاشی زندگی اور سماجی اور ثقافتی ڈھانچے کو ترکوں نے اتنا شدید نقصان پہنچایا کہ اس کی کسی قدر تلافی کافی طویل عرصے بعد یعنی مغل عہد میں ہو سکی۔ اس طرح پورے سلطنت دور کو ایک تاریک دور کہا گیا، یہاں تک کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس دور میں شمالی ہندوستان میں آبادی بھی کم ہو گئی۔ دوسری طرف یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ہندوستانی سماج جس میں ہزاروں برس میں مشکل سے ہی کوئی تبدیلی رونما ہوئی تھی اس پر ترکوں کی سلطنت کے جو منفی اثرات مرتب ہوئے تھے ان کی تھوڑے عرصے میں تلافی ہو گئی اور جلدی ہی ترک سلطان عدل وانصاف اور عام لوگوں کے تحفظ کو فتوحات کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دینے لگے۔ اس طرح عوام کی زندگی کا انداز جیسا تھا ویسا ہی برقرار رہا اور ترکوں کی حکومت کا جو اثر بھی محسوس کیا وہ سابقہ حکمراں طبقے۔ راجپوت اور ان سے پوری طرح ملحق برہمن طبقے نے ہی کیا۔ اس زمرے کی طرف سے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ تبدیلی صرف سطحی درجے پر پیدا ہوئی۔

تازہ طور پر ہندوستان کی تاریخ کے سلسلے میں ایک اور نقطہ نظر ابھرا ہے جو استقرار یا تسلسل کی جگہ تبدیلی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس کے تحت ویدوں کے دور سے ہی سماجی ارتقا کے مختلف درجے یا ادوار متعین کیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ترقی، تنزل اور جمود کے ادوار کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سماج کی طویل تاریخ کے دوران سماجی ڈھانچے میں اہم تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ زیرِ نظر عہد سے پہلے کے زمانے کا مطالعہ اس وقت ہمارے لیے ضروری نہیں ہے۔ شمالی ہندوستان میں گپتا سلطنت کے تنزل کے بعد ایسا دور نظر آتا ہے جس میں شہروں اور دور دراز علاقوں سے تجارت میں کمی واقع ہوئی۔ سونے کے سکے تو فی الحقیقت ناپید ہوئے ہی چاندی کی

کرنسی میں بھی ملاوٹ اور گھٹیاپن نظر آیا۔ علاقائی حد تک اعلیٰ زمیندار طبقے کی طاقت اور اس کا اثر صرف معاشی اور سماجی زندگی پر ہی نہیں بڑھا بلکہ حکومت کے انتظامیہ طریقۂ کار پر بھی زیادہ ہوا۔ اس کے لیے جاگیرداری (فیوڈل) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے گو کہ فی الحقیقت یوروپی فیوڈلزم، مینر نظام (manor system) اور تابعداری نظام (Vassalage) کی کچھ بنیادی خصوصیات اس نظام میں موجود نہیں تھیں۔

جدید دور کے ایک معروف تاریخ داں محمد حبیب کے قول کے مطابق ہندوستان میں ترک سلطانوں کی حکومت نے یہاں کی سوسائٹی اور معاشی زندگی میں دوررس تبدیلیوں کی راہیں کھول دیں۔ ان کے مطابق نئی ترک سلطنت نے وہ سماجی دھارے پیدا کر دیے جنھوں نے ایک ایسی معاشی تنظیم کو جنم دیا جو اس سے پہلے کی معاشی تنظیم سے بہتر اور اعلیٰ تھی، اس کی وجہ سے شہروں کے پھیلنے کے مواقع پیدا ہوئے اور زرعی رشتوں میں اہم تبدیلیوں کی راہیں کھلیں۔

(ا) معاشی زندگی:

1- زرعی پیداوار:

سلطنت دور میں دیہی معاشیات میں کسی قسم کی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ ابنِ بطوطہ، جس نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا تھا، اس نے ہندوستان میں پیدا ہونے والے غلوں اور دوسری فصلوں، پھلوں، پھولوں وغیرہ کی بہت تفصیلی فہرست درج کی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر فصلوں سے ہم آج واقف ہیں۔ چاول اور گنا مشرق میں اور جنوب میں اور گیہوں اور سرسوں وغیرہ شمال میں۔ کپاس بہت بڑے علاقے میں بوئی جاتی تھی۔ جو، تل اور کچھ نچلے درجے کی دوسری فصلیں بھی عام طور پر اگائی جاتی تھیں۔ ابن بطوطہ کا کہنا ہے کہ زمین اتنی زرخیز تھی کہ اس سے سال میں دو فصلیں ملتی تھیں۔ ربیع سرما کی فصل، اور خریف (برسات) کی فصل۔ چاول کی فصل سال میں تین بار بوئی جاتی تھی۔ کچھ فصلیں دیہی صنعتوں کے لیے بنیاد فراہم کرتی تھیں۔ جیسے تیل نکالنا، گڑ بنانا، نیل تیار کرنا، سوت کتائی اور بنائی وغیرہ۔ آلو، مکئی، لال مرچ، تمباکو، جو سولھویں صدی میں ہندوستان پہنچے، وہ ابنِ بطوطہ کی فہرست میں بھی نہیں ہیں۔

محمد بن تغلق اور فیروز تغلق کے دور یعنی چودھویں صدی میں باغات میں خاص ترقی

ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ فیروز تغلق نے دہلی اور اس کے مضافات میں 1200۔ سلورا (دریا) کے کنارے کنارے 80 اور چتوڑ میں 44 باغات لگائے۔ ان باغات سے پھلوں کی پیداوار بڑھی، خاص طور پر انگور کی پیداوار۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ شراب، خصوصاً انگور کی شراب، دہلی میں علی گڑھ اور میرٹھ سے آتی تھی۔ دھولپور، گوالیار اور جودھپور کا شمار بھی ان علاقوں میں ہوتا تھا جہاں پھلوں کی پیداوار اور باغات کی نشوونما میں بہتر طریقے اپنائے گئے تھے۔ جودھ پور میں انار کی پیداوار پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ سکندر لودی نے علی الاعلان کہا تھا کہ خوشبو میں جودھ پور کے اناروں کا مقابلہ ایرانی انار بھی نہیں کر سکتے۔

بہر حال ان باغات کی پیداوار پھل، بنیادی طور پر شہروں اور دولت مند لوگوں کے دستر خوان کے لیے ہی ہوتے تھے۔ لیکن ان کی وجہ سے روزگار کے کچھ مواقع بھی پیدا ہوئے ہوں گے اور بیوپار کی راہیں بھی کچھ نہ کچھ ضرور کھلی ہوں گی۔

زراعتی اوزار اور سازوسامان، گو کہ مشکل سے ہی ان کا ذکر کیا جاتا ہے، ان میں انیسویں صدی تک یوں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی اس لیے اس دور میں بھی ہم انھیں سابق جیسا ہی فرض کر سکتے ہیں۔ زمین کی شرح پیداوار کے بارے میں بھی کوئی اندازہ لگانا مشکل ہے۔ بہر طور اس شرح کو اونچا ہونا چاہیے چونکہ مویشیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جس کا مطلب ہے زمین کو بہتر کھاد مہیا تھی۔ جانوروں کی زیادہ تعداد کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ زراعتی محصولوں میں چرائی محصول کافی اہم تھا جس کی بنیاد جانوروں کی تعداد ہی تھی۔ پھر بنجارے تھے جن کے پاس سامان ڈھونے کے لیے ہزاروں بیل تھے۔ کسانوں کے پاس فی کس زمین بھی زیادہ تھی کیونکہ آبادی بہت کم تھی۔ جنگلات بھی زیادہ وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ بہر حال، سماجی ضرورتوں اور تقاضوں کے تحت دیہات میں بے زمین مزدوروں اور نچلے درجے کے کامگاروں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ زیادہ تر کھیتی بارانی تھی گو کہ کنوئیں کھودنا اور آبپاشی کے لیے پانی جمع کرنے کی غرض سے بندھ باندھنا نیک کام مانا جاتا تھا اور حکومت ان کی تعمیر اور دیکھ بھال میں گہری دلچسپی لیتی تھی۔

چودھویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں فیروز تغلق نے پہلی بار نہروں کا ایک وسیع جال پھیلایا۔ جیسا پہلے ذکر آچکا ہے اس نے دو نہریں۔ ایک جمنا سے اور ایک ستلج اور گھاگرے سے

نکالیں۔ نگران سے (آج کے ہریانہ میں) حصار کے علاقے کو فائدہ پہنچتا تھا۔ سندھ اور پنجاب کے علاقوں میں بھی کچھ چھوٹی نہروں کا ذکر ملتا ہے۔

دیہی معاشرہ:

اس دور کے تمام ماخذ دیہی معاشرے کے موضوع پر لگ بھگ خاموش ہیں۔ مگر اس کمی کو کسی حد تک سنسکرت، اپ بھرنش اور کچھ جنوبی ہند کی زبانوں میں موجود حوالوں سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ دیہی زندگی کے بارے میں ان ماخذوں سے نویں۔ دسویں صدی اور اس کے بعد کی معلومات فراہم ہوئی ہیں لیکن ان سے وہ پس منظر مل جاتا ہے جن سے ہم سلطنت دور میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں اور دیہی زندگی میں جاری رہنے والی چیزوں کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

بارھویں صدی کے جین مصنف ہیم چندر کی تحریروں کی بنیاد پر ہم گاؤں کے باشندوں کو چار درجوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:۔ (1) پیداوار میں شریک یا بٹائی، والے کسان جن کے لیے کرشک یا اردھک کے الفاظ (جو فصل کا نصف وصول کرتے تھے) استعمال کیے گئے ہیں: (2) ہل میں شریک اور کھیت مزدور جن کے لیے کچھ مختلف الفاظ ہلواک، کناس، اور کبھی کبھی کرشک بھی استعمال ہوئے ہیں۔ یہ دو درجے سب سے نچلے یا انحصار رکھنے والے کسانوں کے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کرشک جس کے لفظی معنی زمین جوتنے والے کے ہیں، یہ لفظ کسان کے لیے ایک نسلی قسم کی پہچان دیتا تھا جو دیہی معاشرے کا سب سے بڑا زمرہ تھا۔ ان کے بعد (3) زمرے کے کاشتکار آتے تھے، جنھیں کچھ نئے لکھنے والوں نے آزاد کاشتکار بھی کہا ہے مگر ان کے لیے مالک (پروپرائٹر) کا لفظ شاید زیادہ مناسب ہوگا۔ بعد میں ان لوگوں کو زمین مالک یا خود کاشت کہا جانے لگا۔ انھیں اپنی موروثی زمینوں پر میراث کا حق حاصل تھا۔ یہ اپنی جھونپڑیوں یا مکانوں کے بھی مالک تھے اور شاملات (اجتماعی ملکیت زمینوں) کے بھی مالک تھے۔ عام طور یہ ذات برادری کی بنیاد پر منظم ہوتے تھے۔ آخری (اور (4)) زمرہ دیہی کامگاروں کا تھا۔ موچی، رسی بٹنے والے، چوکیدار وغیرہ۔ ان میں سے کچھ کامگار جیسے موچی اور کھیت مزدور، سواپاچ، اچھوت ذاتوں سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ نیچ اور ادھام جیسے لفظ انھیں سے متعلق تھے۔ محنت کش کسان کی دل سوز غربت اور پریشان حال زندگی کے سلسلے میں دھرم شاستروں کے مفسر اور دوسرے لکھنے والے سب یک زبان ہیں۔ پدم پران میں کرشک کی مصیبت زدہ زندگی کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنے وقت

کے حکمرانوں کے ظلم سے اتنے کچلے ہوئے تھے کہ یہ اپنے گھر والوں تک کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے تھے۔ کسانوں کی غربت کا زمیندار رؤسا، سامنت کی عیش و آرام کی زندگی سے مقابلہ کیا گیا ہے۔

اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ دیہی سماج میں بہت زیادہ نابرابری یا فرق تھا۔ سلطنت دور میں نقد لین دین کی ترقی اور تیز ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ فرق اور بڑھ گیا۔ حالانکہ سلاطین کی زرعی پالیسیاں اس خیال کے مدِ نظر وضع کی جاتی تھیں کہ حکمرانوں اور ان افسروں کی آمدنی متواتر جاری رہے جو اس سلطنت کے منتظم تھے مگر ان کا اثر بہر حال دیہی معاشرے اور معاشیات پر بھی پڑتا تھا۔ فی الحقیقت یہ نتیجہ ہمیں خود اخذ کرنا پڑے گا کیونکہ اس دور کے تاریخ نویس اس قسم کے مسئلوں سے مشکل سے ہی تعلق رکھتے تھے۔

محاصل کا نظام:

شمالی ہندوستان میں ترکوں کی آمد سے پہلے زرعی پالیسیوں اور عملی صورتِ حال کی معلومات ہمارے پاس بہت کم ہیں۔ فصلیں اگانے والوں کو بہت سے محصول یا چنگیاں جیسے 'بھاگ' بھوگ (لگان) اور 'کر' (غیر معمولی محصول) ادا کرنے ہوتے تھے۔ لیکن فصل کا کتنا حصہ اس طرح نکل جاتا تھا۔ انفرادی یا اجتماعی طور پر۔ نہ اس کا کوئی تخمینہ لگایا جا سکتا ہے نہ یہ کہ اس کا کتنا حصہ حکمراں کو پہنچتا تھا اور کتنا اس کے ماتحت کارندوں اور زمیندار رؤسا کو۔ دھرم شاستروں کے مطابق پیداوار میں سے روایتی طور پر صرف چھٹا حصہ (1/6) دینا ہوتا تھا۔ لیکن جنوبی ہندوستان میں ایسے حکمرانوں کا ذکر بھی موجود ہے جو پیداوار کا تیسرا حصہ (1/3) یا دو تہائی (2/3) تک طلب کرتے تھے۔ چولا خاندان کے ایک ایسے بادشاہ کا ذکر بھی ملتا ہے جس نے اپنے جاگیرداروں کو پیداوار کا آدھا حصہ جمع کر لینے کی اجازت دے دی تھی۔ بہر حال، عملی صورت یہ تھی کہ لگان کی مانگ اس بات پر منحصر تھی کہ کسان کو کتنا ادا کرنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔

تیرھویں صدی میں بھی دیہی معاشرے کے ڈھانچے میں مشکل سے ہی کوئی تبدیلی رونما ہوئی تھی اور چونکہ شروع دور کے ترک سلاطین لگان وصولی کے لیے ہندو سرداروں پر ہی منحصر تھے اس لیے انھوں نے اس کی وصولی کا کام اس وقت کے موجودہ طریقوں کے مطابق انھیں پر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس سے بھی اس لگان کی شرح کا اندازہ نہیں ہو سکتا جو حقیقت میں اس وقت

کسانوں سے طلب کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں ترکی حکمراں طبقے کی عام طرزِ فکر کو برنی نے لگ بھگ سو سال کے بعد بیان کیا تھا۔ اس کے مطابق بلبن نے بغرا خاں کو اتنا زیادہ لگان (خراج) وصول نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا کہ جو کسان کو مفلسی کی حد تک پہنچادے اور اتنا کم بھی نہ وصول کرنا چاہیے کہ اُن کے پاس ضرورت سے زیادہ پیسہ ہو جائے اور وہ باغی ہو جائیں۔ اسے کس طرح عاید کیا گیا تھا یا یہ کس طرح عمل میں آتا تھا اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ عام طور پر اس کو اس نقطہ نظر سے عاید کیا جاتا تھا کہ اس سے اُس وقت کے موجود دیہی ڈھانچے میں مداخلت نہ ہو۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے ابواب میں دیکھ چکے ہیں چودھویں صدی میں کئی نئی چیزیں ابھریں۔ علاؤالدین خلجی نے لگان کی مانگ اوپری دوآب کے علاقوں میں علی گڑھ تک اور راجستھان اور مالوا میں پیداوار کے نصف کی حد تک بڑھادی۔ اسی علاقے کو 'خالصہ' قرار دے دیا گیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اس کا لگان براہِ راست شاہی خزانے میں پہنچتا تھا۔ لگان کی مانگ ہر کسان کی مزروعہ زمین کے رقبہ کی بنیاد پر مقرر کی جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ دہلی کو چھوڑ کر، باقی علاقوں کے کسانوں کو نقد لگان دینے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ علاؤالدین نے بھی اس بات کو یقین بنانے کی کوشش کی کہ کاشتکار اپنی کھڑی فصلوں کو ہی بنجاروں کو بیچ دیں اور انھیں اپنے کھیتوں یا گوداموں میں نہ لے جائیں تاکہ ان کی زیادہ بہتر قیمت حاصل کرنے کی امید میں ذخیرہ اندوزی نہ کی جائے۔ بہر حال، عمل میں اس طریقۂ کار میں ترمیم کرنی ضروری ہو گئی کیونکہ یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ بہت سے کاشتکار خود اپنا غلّہ بیچنے کے لیے مقامی منڈیوں میں لے آتے تھے مگر ظاہر ہے یہ دولت مند کاشتکار ہوں گے۔

علاؤالدین کے اپنائے ہوئے زراعی طریقۂ کار دیہی معاملات میں زبردست مداخلت کے مترادف تھے۔ ان طریقوں سے وہ دیہات کے ترجیح یافتہ طبقے 'خوط، مقدم اور چودھریوں' اور کچھ حد تک ان دولت مند کاشتکاروں کے حقوق کے خلاف عمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جن کے پاس ان کی اپنی ضرورت سے زیادہ غلّہ بازار میں بیچنے کے لیے موجود تھا۔

'خوط' اور مقدموں کے سلسلے میں یہ شبہ تھا کہ وہ اپنے اوپر عائد ہونے والے محصولوں کا بوجھ کمزور طبقے پر منتقل کر دیتے تھے اور گھری اور چرائی محصول ادا نہیں کرتے تھے۔ برنی کے

دلفریب بیان کے مطابق خوط اور مقدم اتنے غریب ہو گئے تھے کہ وہ نہ قیمتی لباس پہن سکتے تھے نہ عربی اور عراقی گھوڑوں پر سوار ہو سکتے تھے اور ان کی عورتوں کو مسلمانوں کے گھروں میں کام کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ برنی بہر حال مبالغے سے کام لیتا ہے۔ لیکن خوطوں اور مقدموں کے یا زمین مالک اعلیٰ طبقے کے تمام حقوق اور آسانیاں جو انھیں باپ دادا سے ملتی چلی آرہی تھیں انھیں یکسر سلب کر لینے کی کوشش اور عاملوں کی ایک پوری فوج مقرر کرنا۔ جن میں زیادہ تر رشوت خور اور بے ایمان ثابت ہوئے۔ بہر طور، ان تمام کوششوں کو ناکام ہی ہونا تھا۔

بتایا جاتا ہے کہ علاء الدین کے عاید کردہ محصول کے سلسلے کے تمام اقدام اس کی موت کے ساتھ ہی خود بخود ختم ہو گئے۔ مگر یہ معلومات موجود نہیں کہ اس سے پیائش کا پورا نظام یا دو آب کے علاقوں میں خالصہ کی نصف پیداوار محصول میں لے لینے کا طریقہ بھی ختم ہو گیا۔ خوط اور مقدموں کے حقوق اور آسانیوں کی بحالی کا مطلب تھا کہ حکومت اب مزروعہ زمین کی بنیاد۔ یعنی ہر کاشتکار کے زیرِ کاشت علاقے کی پیائش پر لگان مقرر نہیں کرتی تھی، بلکہ اب یہ پورے علاقے سے ایک بالمقطع (کل ملی جلی) رقم وصول کرتی تھی اور انفرادی لگان کا تخمینہ لگانے کا کام مقدموں اور خوطوں کا ہی تھا۔ اس طرح یہ دیہی علاقوں میں مقدموں اور خوطوں کے معاشی اور سماجی اقتدار کی تصدیق بھی تھی۔

غیاث الدین تغلق نے پیائش کے نظام کو بدل کر خالصہ علاقوں کی پیداوار میں شرکت کا مکمل اقدام کیا۔ اسے کاشتکاروں کی بہتری کا اقدام مانا گیا کیونکہ پیائش کے طریقے میں فصل اگانے میں آخر تک جو خدشات رہتے ہیں ان کا زیادہ بڑا حصہ کاشتکار کو ہی برداشت کرنا ہوتا تھا لیکن حصہ داری یا بٹائی میں فائدہ اور نقصان، دونوں میں کاشتکار اور حکومت دونوں شریک ہوتے تھے۔ غیاث الدین نے ایک اور اہم اقدام بھی کیا۔ ان علاقوں میں جہاں اقطاع رکھنے والے لوگ تھے، یعنی خالصہ کے علاوہ علاقے، اس نے ان کے متعلق حکم جاری کیا کہ ان پر لگان محض تخمینے یا یکمشت حساب کر کے نہ بڑھا دیا جائے، "بلکہ بتدریج اور آہستہ آہستہ بڑھایا جائے کیونکہ یکمشت اضافے سے دیہات تباہ ہو جائیں گے اور خوشحالی میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔" برنی نے ان معتدل انداز کے اضافوں کی پالیسی کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اقطاع والے علاقوں سے لگان کی مانگ "دس یا گیارہ

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

میں ایک "کی شرح سے نہیں بڑھائی جانی چاہیے۔اس جملے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اضافہ ایک بٹا دس (1/10) یا ایک بٹا گیارہ (1/11) ہو سکتا ہے۔نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ لگان دسواں حصہ ہو، یا جیسا کہ کچھ نئے مورخوں نے فرض کر لیا ہے، (اسلامی) بنیادی تصور کے مطابق کم سے کم پانچواں حصہ ہو۔ برنی نے لگان کے پیمانے یا شرح کا کہیں ذکر نہیں کیا نہ دو آب کے خالصہ علاقوں کے سلسلے میں نہ اقطاع کے بارے میں۔شاید خالصہ سے باہر کے علاقوں میں لگان کی مانگ وہی سابقہ یعنی ایک تہائی رہی تھی۔

محمد تغلق نے علاء الدین کے نظام کو پھر عاید کرنے کی کوشش کی اور اسے اپنی پوری سلطنت میں پھیلانا چاہا، لیکن اس کے اقدامات نے دو آب کے علاقے میں ایک زبردست قسم کی کاشتکار شورش کھڑی کر دی۔اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ انفرادی طور پر لگان کا تخمینہ لگانے میں، پیمائش کے وقت حقیقی پیداوار کی بجائے پہلے سے طے شدہ (غیر حقیقی) پیداوار کو اپنایا گیا۔مزید براں پیداوار کو نقد رقم میں تبدیل کرتے وقت بھی حقیقی قیمتوں کی بجائے سرکار کی طرف سے طے کردہ قیمت اپنائی گئی۔ مویشیوں اور گھروں پر محصول لگانے کے سلسلے میں بھی سختی برتی گئی۔اس طرح حقیقی محصول یا لگان کی مانگ کافی بڑھ گئی یعنی نصف یا اس سے بھی زیادہ۔

علاء الدین خلجی کی زرعی اصلاحات کی طرح محمد بن تغلق کے اقدامات کو اس مقصد کے پیش نظر تیار کیا گیا تھا کہ دیہی علاقوں میں متمول طبقے، خاص طور پر خوط اور مقدم کو ملے حقوق و سہولیات میں کچھ تخفیف کی جا سکے۔مگر اس کے اقدامات سے اوسط کاشتکار کو بھی پریشانی ہوئی۔فی الحقیقت دو آب کے علاقے میں اس کے خلاف کافی سخت بغاوت کی یہی وجہ تھی۔

محمد تغلق نے اس کے بعد بالکل مختلف یا مخالف سمت میں اقدامات کرنے کی کوشش کی۔دو آب جو براہِ راست حکومت کے زیرِ انتظام (خالصہ) علاقہ تھا، یہاں اس نے فصلوں کے پرانے طریقے کو بدل کر انھیں بہتر کرنے کی کوشش کی اور نچلے درجے کی فصلوں کے بدلے اعلیٰ درجے کی فصلیں اگانے کی ترغیب دی۔اس سلسلے میں جو سب سے اہم ترغیب دی گئی وہ کنوئں وغیرہ کے لیے قرض دیا جانا تھا۔یہ پالیسی صرف متمول اور رئیس قسم کے کاشتکاروں اور خوطوں اور مقدموں کے تعاون سے ہی کامیاب ہو سکتی تھی کیونکہ انھیں کے پاس سب سے بڑے زمین کے

قطعے اور دوسرے ذرائع موجود تھے۔ مگر یہ قدم بھی ناکام ہوا کیونکہ اس کام کے لیے جو افسر مقرر کیے گئے وہ ان علاقائی کیفیات سے ناواقف تھے اور وہ صرف خود پروری اور زیادہ سے زیادہ خود کمانے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ فیروز کو ہریانہ میں کسانوں کو نہروں کا نظام فراہم کرکے، اس پر دس فیصدی کا غیر معمولی محصول بڑھا کر اور فصلوں کا چناؤ خود کاشتکار پر چھوڑ کر زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔

مجموعی طور پر اندازہ یہی ہوتا ہے سلطانوں کے عہد، خصوصاً چودھویں صدی میں، لگان خاصہ زیادہ تھا اور نصف کے آس پاس رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ پرانے بچولیوں۔ رائے، راوت، خوط اور مقدم وغیرہ کے حقوق و سہولیات کو متواتر گھٹاتے رہنے کی کوشش بھی اس میں واضح طور پر موجود تھی۔ پہلی بار اتنی بڑی مقدار میں لگان کا تخمینہ لگایا گیا تھا اور یہ اتنے وسیع اور زرخیز علاقے سے کئی عشروں تک جمع کیا جاتا رہا تھا۔ اس کے لیے جو انتظامی طریقے اپنائے گئے ان سے اور اتنی بڑی آمدنی کے ذرائع کو ایک مرکزیت مل جانے اور اس کے حکمراں طبقے کے ہاتھوں میں آجانے سے جو اثرات پیدا ہوئے ان کے نتائج دیہی زندگی اور شہری صناعوں، کاریگروں، تجارت اور کاروبار، سب پر بہت اہم تھے۔

فیروز تغلق کے زمانے کو عام طور پر دیہی خوشحالی کا دور مانا جاتا ہے۔ برنی اور عفیف کا کہنا ہے کہ سلطان کے احکامات کے نتیجے میں صوبوں میں زراعت بڑھی اور جتائی بوائی کو اتنا فروغ ہوا کہ دوآب میں کوئی گاؤں غیر مزروعہ نہیں رہا۔ ہریانہ میں نہری نظام سے جتائی بڑھی۔ عفیف کے مطابق "رعیت (کاشتکاروں) کے گھروں میں اتنا غلہ، دولت، گھوڑے، اور سازوسامان جمع ہو گیا کہ اسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔" اس نے یہاں تک بیان کیا ہے کہ کوئی کاشتکار عورت ایسی نہیں تھی جس کے پاس زیور نہ ہو، اور "ہر کاشتکار کے گھر میں بہت اچھی چارپائیاں اور ان پر صاف دھلی چادریں، بہت سا سازوسامان اور دولت" موجود تھی۔

ظاہر ہے یہ صورتِ حال عام طور پر زیادہ بڑے اور رئیس قسم کے کاشتکاروں اور دیہات کے اونچے طبقے۔ خوط مقدم وغیرہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس طرح دیہی معاشرے میں غیر مساوات اور فرق متواتر باقی رہا اور دیہات کی زائد پیداوار شاہی پالیسی کے تحت دیہات سے باہر نکلتی رہی۔ بہر حال، دیہات کی معاشی کیفیت میں بہتری پیدا کرنے کی کوششوں میں کسی حد تک

گھوڑ سوار، ایک بڑی تعداد غازیوں اور افغانوں کی تھی۔ جے پال کی فوج میں 12,000 گھوڑ سوار، 30,000 پیادے اور 300 ہاتھی تھے۔ یہ لڑائی گھوڑ سواروں کے درمیان کی لڑائی محسوس ہوتی تھی جن کے ساتھ ماہرانہ فوجی نقل و حرکت شامل تھی۔ جے پال کو شکست ہوئی اور محمود شاہی دارالخلافہ ویہند (او ہبندایا پشاور) تک پہنچ گیا جو بری طرح تباہ ہو گیا تھا۔ کچھ ذرائع کے مطابق جے پال کو گرفتار کر کے غزنی لے جایا گیا تھا لیکن کچھ عرصے بعد اس کو ایک بڑے معاوضے کے عوض رہا کر دیا گیا تھا۔ لیکن یہ کہانی من گھڑت لگتی ہے کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ اس فتح کے بعد محمود نے شاہی حاکموں سے مصالحت کر لی تھی اور صرف دریائے سندھ کے مغربی علاقے کو لے لیا تھا۔ یہ ناممکن ہی معلوم ہوتا ہے کہ شاہی حکمرانوں کو شکست ہوئی ہو اور وہ قید کر لیے گئے ہوں۔ بہر حال جے پال نے اپنی اس ہار سے بہت سبکی محسوس کی تھی اور چند سال بعد ہی اس نے خود سوزی کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا آنند پال اس کا جانشین بنا۔

اس پسپائی کے باوجود شاہی اتنے مضبوط تھے کہ انھوں نے محمود کو مزید آگے بڑھنے میں سنگین دشواریاں پیدا کیں۔ غزنویوں کو اصل پنجاب میں داخل ہونے سے پہلے دریائے سندھ کے قریب دو مزید سنگین جنگیں لڑنی پڑیں۔ 1006 میں سندھ کے قریب لڑی جانے والی جنگ میں محمود نے دریا کے بالائی علاقے پر فتح حاصل کر لی تھی اس وجہ سے اس کی رسائی پنجاب تک ہو گئی لیکن اصل پنجاب 1009 تک اس کے تسلط میں نہیں آیا۔ سندھ کے مسطح علاقے چچھ میں فیصلہ کن جنگ میں محمود کو آنند پال پر فتح حاصل ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اس نے نمک کے پہاڑوں میں نندانہ کو تباہ کیا جہاں شاہیوں نے اپنی پہلی شکست کے بعد پشاور سے اپنا دارالخلافہ منتقل کیا تھا۔ محمود نے وہ قلعہ بھی تاراج کر دیا جو بھیم نگر یا نگر کوٹ کہلاتا تھا (یہ کانگڑہ کے نگر کوٹ سے مختلف تھا)۔ کچھ عرصے تک آنند پال کو پنجاب پر ایک جاگیردار کی حیثیت سے حکومت کرنے کی اجازت دی گئی۔ 1015 میں محمود لاہور تک پہنچ گیا اور اس نے اسے تاخت و تاراج کر دیا۔ جلد ہی غزنوی حکومت دریائے جہلم تک پھیل گئی۔ اس عرصے میں ملتان پر مسلم حکومت قائم ہو چکی تھی جس نے محمود کے خلاف آنند پال سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اس کو بھی محمود نے تاراج کیا۔ لیکن 1015 میں کشمیر کو فتح کرنے کی کوشش خراب موسم کی وجہ سے ناکام رہی۔ محمود کی فوجوں کی ہندوستان

کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی لیکن اس کے زیادہ بڑے حصے سے عام طور پر دیہات کے اوپری طبقے اور حقوق یافتہ افراد ہی مستفید ہوئے تھے۔

2- غیر زرعی پیداوار:

سلطنت دور میں ملک کے معاشی ذرائع کا کوئی تفصیلی ذکر موجود نہیں ہے اور جو کچھ ہے اس میں ابوالفضل کی آئینِ اکبری میں دیے ہوئے بیانات بھی شامل کرنے ضروری ہیں، جو سولھویں صدی کے آخری حصے میں تحریر میں آئے تھے۔ مختصراً مصنوعات میں سب سے اہم کپڑا، دھات کی مصنوعات، عمارتی کام اور کچھ اور ضمنی کام، جیسے چمڑے کا کام، کاغذ سازی، کھلونے بنانا وغیرہ شامل تھے۔

کپڑے کی صنعت:

کپڑے کی صنعت ہندوستان کی سب سے بڑی صنعت رہی ہے اور پرانے وقتوں سے چلی آرہی ہے۔ اس میں سوتی کپڑا، اونی اور ریشم ہر طرح کا کپڑا شامل تھا۔ سوتی کپڑے کو بھی دو قسم کے کپڑوں میں بانٹا جاسکتا ہے، موٹا (کمین) اور عمدہ قسم کا (مہین)۔ موٹا یا گھٹیا قسم کا کپڑا 'پاٹ' کہلاتا تھا اور اسے غریب لوگ اور فقراء پہنتے تھے۔ ظاہر ہے یہ دیہات میں گھروں میں ہی بنا جاتا تھا لیکن کچھ علاقوں میں باقاعدہ طور پر بھی تیار کیا جاتا تھا جیسے اودھ میں، اور وہاں سے دہلی لایا جاتا تھا۔ کچھ بہتر قسم کا سوتی کپڑا، سادا کپڑا (کرپاس) کہلاتا تھا اور یہی عام طور پر استعمال میں آتا تھا۔ عمدہ قسم کا کپڑا ململ یا تن زیب ہوتا تھا جو بنگال میں سلہٹ اور ڈھاکہ میں اور دکن میں دیوگیری میں بنتا تھا۔ یہ اتنا باریک، ایسا نفیس اور اتنا قیمتی ہوتا تھا کہ اسے صرف رؤسا اور درباکے امراء ہی پہنتے تھے۔ گجرات میں بھی کئی طرح کا نفیس سوتی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ باربوسا نے لکھا ہے کہ کھمبے (کھمبایت) ہر قسم کے گھٹیا اور نفیس سوتی کپڑے کی پیداوار کا مرکز تھا اور اس کے علاوہ کچھ سستی قسم کی مخمل، ساٹن، تافتا (ریشمی کپڑا) اور دبیز دری بھی تیار ہوتے تھے۔

مختلف قسم کے کپڑوں کی رنگائی اور چھپائی ہوتی تھی اور چھپائی میں لکڑی کے بوٹے استعمال کیے جاتے تھے۔ اسی لیے چودھویں صدی کے صوفی ہندی شاعر ملا داؤد نے چھپے

(کھنڈ چھاپ) کپڑے کا ذکر کیا ہے۔ کپڑے کی تیاری کے علاوہ دوسری مختلف مصنوعات، جیسے دری، جانمازیں، غلاف، دریاں، نواڑ وغیرہ بھی گجرات کے دوسرے حصوں میں تیار کی جاتی تھیں۔

اس دور میں کپڑے کی صنعت میں چرخے کی آمد سے بھی بہتری ہوئی تھی۔ جدید دور کے ایک مورخ، عرفان حبیب کے مطابق چرخے کی موجودگی کی تصدیق ایران کے بارہویں صدی کے متعدد معروف شعراء کے کلام سے ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں اس کا سب سے پہلا حوالہ چودھویں صدی کے وسط میں ملتا ہے۔ اس طرح یہ ترکوں کے ساتھ ہندوستان آیا ہوگا اور چودھویں صدی کے وسط تک عام استعمال میں آنے لگا ہوگا۔ بتایا جاتا ہے کہ سب سے سیدھے سادے چرخے سے کاتنے والے کی پیداواری صلاحیت ہاتھ کی تکلی سے سوت کاتنے والے کے مقابلے میں چھ گنا بڑھ گئی۔

ایک اور اوزار جس کا اسی عرصے میں استعمال شروع ہوا وہ دھنیے کی کمان یا دھنکی تھی جس سے بنولوں سے روئی کو چھڑانے کا کام کافی تیزی سے ہونے لگا۔

ریشم بنگال سے درآمد کیا جاتا تھا جہاں ریشم کے کیڑے پالے جاتے تھے۔ بہر طور ریشم کے دھاگے کی زیادہ مقدار میں سپلائی، جس میں کچا ریشم بھی شامل تھا ایران اور افغانستان سے ہوتی تھی۔ ریشمی، اور سوت اور ریشم کے ملے جلے کپڑے کی مانگ دہلی اور اس کے قرب وجوار میں بہت تھی۔ کھمبایت کا ریشم کپڑے کی اُن قیمتی قسموں میں تھا جن پر علاء الدین خلجی نے کنٹرول کیا تھا۔ گجرات کے طرح طرح کے ڈیزائن والے 'پٹولا' کی بہت قدر تھی۔ گجرات سونے چاندی سے کڑھائی کے کام کے لیے بھی مشہور تھا جو عام طور پر ریشم پر ہوتی تھی۔

گو کہ بھیڑیں میدانی علاقوں میں بھی پالی جاتی تھیں مگر اون پہاڑی علاقوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ بہترین قسم کا اونی کپڑا اور سمور زیادہ تر باہر سے درآمد کیا جاتا تھا اور اسے لگ بھگ صرف دربار کے امراء ہی پہنتے تھے۔ بہر حال کشمیر کی شال کی صنعت کافی جمی ہوئی تھی۔ محمد بن تغلق نے چین کے شہنشاہ کو کشمیری شالیں تحفے میں بھیجی تھیں۔ سلطانوں کی سرپرستی میں قالین بننے کے کام نے بھی ترقی کی اور ان میں بہت سے ایرانی اور وسط ایشیائی ڈیزائن اپنائے گئے۔

رنگائی کی صنعت کا ذکر بھی ضروری ہے۔ نیل (انڈیگو) اور دوسری سبزیاں وہ رنگ

فراہم کرتی تھیں جن رنگے ہوئے چمکتے رنگین کپڑے عورتیں اور مرد دونوں بڑے شوق سے پہنتے تھے۔ رنگائی کی صنعت اور چھینٹ کی چھپائی میں بھی گہرا تعلق ہے 'ٹائی اینڈ ڈائی' (بندھن) رنگائی کی کاری گری راجستھان کی پرانی صنعت ہے۔ بہر حال اس بات کا علم نہیں ہے کہ لکڑی کے بوٹوں (بلاک) کے ذریعے چھپائی کا کام کب شروع ہوا۔

کپڑے کی صنعت جو بڑی تعداد میں روزگار فراہم کرتی تھی اس کی تنظیم کیسی تھی اس کی معلومات موجود نہیں ہیں۔ اور پھر جیسا کہ بعد میں نظر آتا ہے، کاتنا عورتوں کا کام تصور کیا جاتا تھا اور عام طور پر گھروں میں ہوتا تھا۔ اس کام کے لیے کنیزوں سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ بنائی بھی ایک ایک گھریلو صنعت تھی جو عام طور پر قصبوں اور شہروں میں چلتی تھی اور گاؤوں میں بھی کہیں کہیں کپڑا بُنا جاتا تھا۔ بنائی کا مال (دھاگا وغیرہ) بنکر کو خود خریدنا ہوتا تھا یا بیوپاری اُسے بنکروں کو پہنچاتے تھے۔ نفیس قسم کے یا عیش و آرام والے کپڑے سرکاری کارگاہوں یا کارخانوں' میں تقسیم ہوتے تھے۔ اس طرح ہمیں پتہ چلتا ہے کہ محمد تغلق کے کارخانوں میں 4000 کاریگر تھے جو مختلف قسم کی چادریں اور کپڑے تیار کرتے تھے۔ فیروز تغلق نے اپنے کارخانوں اور پرگنوں میں کام کرنے کے لیے بہت سے غلاموں کو بھرتی کر کے اُن کی تربیت کی تھی۔

دھات کا کام:

ہندوستان میں دھات کے کام کی روایت بھی قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔ اس کی تصدیق مہرولی (دہلی) میں موجود لاٹ سے ہوتی ہے جو صدیوں سے موسم کے گرم و سرد کی زیادتی جھیلتی چلی آرہی ہے۔ ہندوستان کے دھات کے دستکاروں کی کاریگری اور چابک دستی کی تصدیق تانبے اور ملی جلی دھاتوں کی اَن گنت مورتیوں سے بھی ہوتی ہے۔ دھات میں دوسری دھاتوں کے نقش و نگار یا پچی کاری والی تلواریں، خنجر وغیرہ پوری دنیا میں مشہور تھے۔ کانسے اور تانبے کے منقش اور پچی کاری والے برتن جو دکن میں تیار کیے جاتے تھے ان کی مغربی ایشیا میں متواتر مانگ رہتی تھی۔ سلطنت دور کے اعلیٰ معیار بھی ہندوستان میں دھات کے کام کی نفاست اور بہترین کاری گری کا ثبوت ہیں۔ چاندی۔ سونے کا کام کرنے والے سنار اپنے نازک زیورات کی وجہ سے چاروں طرف جانے جاتے تھے اور زیورات کی مانگ مرد عورتوں دونوں طرف سے برابر بنی رہتی تھی۔

عمارتی صنعت:

عمارتی صنعت یعنی تعمیر کا کام بھی لوگوں کے لیے روزگار کا اہم ذریعہ تھا۔ دسویں صدی سے شمالی ہندوستان میں مندروں کی تعمیر کا سلسلہ کافی تیزی سے چل رہا تھا جیسا کہ بندیلکھنڈ میں کھجوراہو، راجستھان میں دلواڑا اور اڑیسہ اور گجرات میں بنے دوسرے مندروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ترکی سلطان بھی عمارتیں بنوانے کے زبردست شوقین تھے۔ انھوں نے محراب کے نئے طرز، گنبد اور محرابی یا قوسی چھتیں بنوانی شروع کیں اور ایک نئے مسالے سے روشناس کرایا۔ یہ پلاسٹر میں استعمال کیا جانے والا چونے کا مسالہ تھا۔ انھوں نے شہر، قلعے، مسجدیں، محلات، تعمیر کرائے جن میں سے کچھ کے باقیات یا کھنڈراب بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اینٹیں بنانے کے کام میں زبردست تیزی آئی اور زیادہ سے زیادہ لوگوں نے اینٹوں اور پتھر سے بنے پکّے مکانوں میں رہنا شروع کردیا لیکن غریب لوگ بہر حال کچے، چھپر والے مکانوں میں ہی زندگی بسر کرتے رہے۔ سنگ تراشی میں ہندوستان کے کاریگروں کا یوں بھی کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ امیر خسرو کا دعویٰ تھا کہ دہلی کے سنگ تراش اور راج پوری مسلم دنیا میں سب سے اچھے کاریگر ہوتے تھے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات بھی پوری طرح مانی جاتی ہے کہ تیمور اپنے ساتھ اپنے پایۂ تخت سمرقند کی تعمیر کے لیے دہلی سے سنگتراش اور راج لے گیا تھا۔ اس بات کا بہر حال کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ عمارت کی صنعت میں کتنے لوگ لگے ہوئے تھے۔ برنی کا بیان ہے کہ علاء الدین خلجی نے 70,000 کاریگروں کو اپنی عمارات کی تعمیر میں لگایا تھا۔ محمد تغلق اور فیروز دونوں بہت بڑے معمار سلطان تھے۔ فیروز نے صرف کچھ نئے شہر ہی نہیں بسائے بلکہ بہت سی پرانی عمارتوں اور مقبروں وغیرہ کی مرمت کا کام بھی کروایا۔ اسی دور میں چینی کاری کے ٹائلوں کا رواج بھی شروع ہوا۔ ہندو راجاؤں اور سرداروں نے بھی تعمیری کام کی سرپرستی کی اور بہت سے نئے شہر۔ جیسے راجستھان میں جودھپور، اسی زمانے میں تعمیر ہوئے۔ بہترین قسم کا لکڑی کا کام بھی پورے ملک میں ہوتا تھا اور دروازے نشستیں (کرسیاں)، مسہریاں اور گھریلو استعمال کی بہت سی چیزیں تیار ہوتی تھیں۔

دوسرے حرفے اور کاغذ سازی کی صنعت:

ایک اور حرفہ جو ہندوستان میں کافی وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا تھا وہ چمڑے کا کام تھا جس کی بنیاد ملک میں موجود مویشیوں کی بہت بڑی تعداد کی موجودگی تھی۔ یہ کام ذات کی بنیاد پر منظم تھا۔ اصطبلوں میں بہت بڑی تعداد میں گھوڑے موجود تھے جن کے لیے اعلیٰ درجے کی زینیں بنتی تھیں جو امراء کو تحفے میں بھی دی جاتی تھیں۔ گجرات میں بہت نفیس چمڑے کی لال۔ نیلی چٹائیاں یا فرش بنتے تھے جنھیں چڑیوں یا جنگلی جانوروں کی تصویروں سے یا میناکاری وغیرہ سے سجایا جاتا تھا۔

اس دور میں جو ایک نئی صنعت اُبھری وہ کاغذ سازی کی تھی۔ حالانکہ چین میں اس کی واقفیت پہلی صدی عیسوی میں ہی پیدا ہو چکی تھی لیکن سمرقند اور بغداد میں یہ جانکاری آٹھویں صدی تک پہنچی۔ عربوں نے اس میں شہتوت اور کچھ دوسرے پیڑوں کی چھال کی بجائے کپڑے کی دھجیوں اور رسی استعمال کر کے اسے ایک نئی ٹکنالوجی بخشی۔ بہر حال ہندوستان میں تیرھویں صدی سے پہلے اس کے استعمال کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے اور کاغذ پر لکھا پہلا مخطوطہ اس وقت 24-1223 کا گجرات کا موجود ہے۔ کاغذ کی صنعت نے کتابوں کی موجودگی میں یقیناً بہت اضافہ کیا ہوگا۔

ان کے علاوہ کچھ صنعتیں نمک سازی، سنگِ مرمر اور دوسرے پتھروں کی کھدائی اور لوہے اور تانبے کی کان کنی سے متعلق تھیں۔ پنّا اور جنوبی ہندوستان میں ہیرے کی کھدائی اور سمندر میں موتیوں کے لیے غوطے کے کام بھی ہوتا تھا۔ ہاتھی دانت کا کام بھی ایک اہم دستکاری تھی۔

3- تجارت:

(ا):اندرونی تجارت:

سلطنت عہد میں، جیسا کہ پہلے بھی تھا، ہندوستان پورے ایشیائی علاقے اور مشرقی افریقہ کے قریبی علاقوں کے لیے ایک صنعتی کارگاہ (ورکشاپ) کی حیثیت رکھتا تھا جہاں بہت تیز اور پوری طرح جمی ہوئی گھریلو تجارت بھی ہوتی تھی۔ ہندوستان کو یہ حیثیت اس کی بے حد اچھی پیداوار دینے والی زراعت، تربیت یافتہ دستکاروں اور حرفہ نگاروں اور بہت اعلیٰ درجے کے تربیت یافتہ اور تجربہ کار تاجروں اور سرمایہ کاروں سے حاصل ہوئی تھی۔ ترک سلطنت نے جو مرکزیت

پیدا کی تھی اور جس سے ایک اچھا خبر رسانی کا ذریعہ (کمیونیکیشن)، چاندی کے ٹنکے اور تانبے کے درہم کی بنیاد پر ایک مضبوط اور مستحکم کرنسی کا نظام اور ہندوستانی تجارت کی نئی تنظیم اور تحریک پیدا ہوئی تھی ان سب کی وجہ سے شمالی ہندوستان میں نئے شہروں کی آباد کاری اور زر (روپے پیسے) کی بنیاد پر کاروبار میں اضافے کو ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔

داخلی یا ملک کے اندر تجارت کو دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ پہلے دیہاتوں کے درمیان آپسی، اور ضلعوں میں شہروں کی منڈیوں سے تجارت اور دوسرے بڑے بڑے ملی جلی آبادی والے (میٹروپالیٹن) شہروں اور علاقوں کے درمیان جو تجارت ہوتی تھی وہ ان دونوں کے درمیان رکھی جاسکتی ہے۔ علاقائی تجارت یا چھوٹے علاقہ کی تجارت لگان کی ادائیگی کے لیے اور ان شہروں کی غذائی ضرورتیں پورا کرنے کے لیے ہوتی تھی جو علاقے کی وسعت اور تعداد' دونوں طرح متواتر پھیل رہی تھی۔ فصلوں کی بیچنے کی بنیادی ذمے داری گاؤں کے بنیے کی ہوتی تھی اور یہی کسانوں کی ضرورت کا سامان 'نمک' مصالے' اور گاؤوں کے لوہار کے لیے کچا لوہا بھی بیچتا تھا۔ کبھی کبھی رئیس اور بڑے کسان خود اپنی زائد پیداوار کو منڈی میں بیچنے لے جاتے تھے جس کی علاء الدین خلجی نے گاؤں میں ذخیرہ اندوزی روکنے کی غرض سے ترغیب بھی دی تھی۔ منڈیوں کے کام میں علاقائی میلے بھی مدد پہنچاتے تھے جن میں جانوروں کی خرید فروخت بھی ہوتی تھی۔ جانوروں کی ضرورت زراعت کے کاموں، اندرونی آمدورفت اور دودھ وغیرہ کی ضرورتیں پوری کرنے میں بہت اہم تھی۔ بہر حال، اس علاقائی تجارت کی مقدار کا اندازہ کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے لیکن یہ تجارت ملک کی معاشی زندگی میں بہت بنیادی کردار ادا کرتی تھی۔ لیکن اس علاقائی تجارت میں مصروف بیوپاریوں کے لیے اس سے اتنی وافر آمدنی نہیں ہوپاتی تھی کہ یہ کوئی آسان یا افراط کی زندگی گزار سکیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بدنام زمانہ بنیا غالباً ایک رئیس کسان سے بہتر یا اعلیٰ معیار زندگی نہیں رکھ پاتا تھا۔

اس منظر کے دوسرے سرے پر دولت مند تاجر اور سرمایہ کار۔ 'ساہا'، 'مودی'، اور صرّاف ہوتے تھے۔ تجارت سے متعلق ان کے کام ملک کے اندر بڑی مقدار میں اشیاء کی نقل و حمل سے بھی تعلق رکھتے تھے اور بڑے شہروں مین رہنے والے امراء اور روٴسا کے لیے آرام و

آسائش کا سامان پہنچانے سے بھی۔ بڑی مقدار میں اشیاء کی نقل و حمل (آمدورفت) میں غلہ، تیل، گھی، مسالے وغیرہ شامل تھے۔ چنانچہ چاول اور شکر جو بنگال اور بہار میں ضرورت سے زیادہ ہوتے تھے وہ پانی کے جہازوں سے مالابار اور گجرات لے جائے جاتے تھے۔ گیہوں، جو آج کی اصطلاح میں مشرقی اتر پردیش، اودھ، کڑا (یعنی الہ آباد) میں فاضل ہوتا تھا وہاں سے دہلی کے علاقے میں لایا جاتا تھا لیکن زمین پر بڑی مقدار میں اشیاء کی نقل و حمل کافی مشکل کام تھا اور اسی لیے وہ زیادہ تر بنجارے ہی انجام دیتے تھے جو اپنے خاندانوں سمیت ہزاروں بیلوں کے ساتھ چلتے تھے۔ غالباً بنجاروں کے کام میں بڑے یا رئیس تاجر۔ 'ساہا' اور 'مودی' سرمایہ لگاتے تھے، بہر حال اس سلسلے میں کافی معلومات موجود نہیں ہیں۔ قیمتی لیکن بھاری اور بڑی اشیاء جیسے نفیس کپڑا، گھوڑوں یا بیل گاڑیوں پر لے جایا جاتا تھا۔ ان اشیاء کی نقل و حمل کاروانوں یا ٹانڈاؤں کے ساتھ ہوتی تھی جن کی حفاظت سپاہی کرتے تھے کیونکہ سڑکیں جنگلی جانوروں اور ڈاکوؤں دونوں قسم کے خطروں سے غیر محفوظ تھیں۔

دہلی سے دیوگیر تک محمد بن تغلق کی بنوائی سڑک سے اندازہ ہوتا ہے کہ سڑکوں سے آمدورفت میں بہتری پیدا کرنے کی کتنی ضرورت تھی۔ سڑک کے دونوں طرف پیڑ لگائے گئے اور ہر دو میل (کروہ) پر سرائیں تعمیر کرائی گئیں جن میں کھانے پینے کا سامان موجود رہتا تھا، بنگال میں ایک پشتہ (کنارہ) تیار کیا گیا تاکہ لکھنوتی جانے والی سڑک کا جو حصہ برسات میں زیرِ آب رہتا تھا اس پر سفر آسان ہو جائے۔

دور دراز کے علاقوں کی تجارت میں بڑی مقدار میں اشیاء کی نقل و حمل میں کپڑا سب سے اہم شے ہوتی تھی۔ ہم بنگال اور دیوگیر سے آنے والی ململ یا تنزیب اور گجرات سے آنے والے نفیس کپڑے کا ذکر پہلے ہی کر چکے ہیں۔ گھوڑے۔ غیر ملکی اور ملکی۔ دونوں، درآمد والی اشیاء میں کافی اہمیت کے حامل تھے۔ نیل (انڈیگو)، مسالے، مرہم، دوائیں، چمڑے کی مصنوعات دوسری اہم اشیاء تھیں۔ کشمیر کی شالوں اور قالین کی مانگ دہلی میں تھی۔ اسی طرح خشک میوے بھی آتے تھے۔ شراب دوسرے ملکوں سے درآمد ہوتی تھی اور دوآب کے علاقے میرٹھ اور علی گڑھ میں بھی تیار ہوتی تھی۔

جہاں تک دور دراز کی تجارت میں سرمایہ کاری کا سوال ہے ہُنڈی کا طریقہ کار ہی جاری

رہا ہوگا۔ مودی اور صراف ہی ہنڈی طریقۂ کار میں بنیادی طور پر سرمایہ لگانے والے ذرائع تھے چونکہ آج جیسا بینک کاری نظام موجود نہیں تھا۔ گاؤں کے درجے پر بنیے اور ملکی یا قومی پیمانے پر مودی اور صراف زرعی کاموں اور اس کی تجارت میں سرمایہ کاری کے ذرائع تھے۔ موجودہ دور کے ایک ممتاز مورخ، کے۔ ایم۔ اشرف کے مطابق بڑے قرضوں کے لیے 10 فی صد اور چھوٹے قرضوں یا معمولی رقموں کے لیے 20 فی صد سالانہ سود لیا جاتا تھا۔

(ب) غیر ملکی تجارت:

غیر ملکی تجارت کے سلسلے میں مغربی اشیا کے علاقے سے، جو بحر روم کی ساحلی دنیا تک پھیلا ہوا تھا اور وسطی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا اور چین سے زمینی اور بحری راستوں سے تجارت کی روایت قدیم زمانے سے چلی آرہی تھی، زمینی راستہ درّۂ بولان سے گزر کر ہرات اور درّۂ خیبر سے گزر کر سمرقند اور بخارا تک اور کشمیر کے راستے یارقند اور خوطان ہوتا ہوا آگے چین تک پہنچ جاتا تھا۔ یہ تجارتی سلسلے وسطِ ایشیا کے خانہ بدوش گروہوں۔ جیسے چھٹی اور ساتویں صدی میں ہُن گروہوں کے یلغار، اور تیرھویں صدی میں منگول لہر، وغیرہ کی وجہ سے کبھی کبھی درہم برہم بھی ہو جاتے تھے۔ شاہی خاندانوں کے عروج وزوال سے بھی ان تجارتی راستوں کی حفاظت پر اثر پڑتا تھا۔ بہر حال، تاجر طبقہ بھی ان رکاوٹوں کا عادی ہو کر ان سے کامیابی سے نپٹنے کے لیے پختہ کار ہو گیا تھا۔ دوسری طرف خانہ بدوش گروہوں نے بھی اس تجارت کو جاری رکھنے کی قدر کو سمجھتے ہوئے اس سے محصول حاصل کرنے کو زیادہ سود مند سمجھا۔ اس طرح منگولوں نے صرف تجارت کو ہی کھلا نہ رکھا بلکہ جنگ نہ ہونے کی صورت میں اونٹ، گھوڑے، ہتھیار، باز (شاہین)، سمور اور مُشک وغیرہ کی تجارت میں شامل ہونا شروع کر دیا۔ حالانکہ بلبن کو وسطِ ایشیا سے گھوڑے حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ رکاوٹ عارضی یا وقتی ہی ہوگی کیونکہ علاء الدین خلجی کو ایسی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ منگولوں کی اپنی حکومتیں قایم ہو جانے، اور راستوں کے محفوظ ہو جانے کے بعد چین اور مغربی ایشیا سے تجارت اتنی آسان ہو گئی جیسی اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ اس لیے منگولوں کے ہاتھوں سمرقند و بخارہ جیسے خوشحال شہروں کی بربادی کے اثرات کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جانی چاہیے۔ منگولوں کے بتدریج اسلام قبول کر لینے اور اس سے قریب

ہو جانے کی وجہ سے چودھویں صدی میں تجارت کے مواقع اور بہتر ہو گئے۔ بہر حال زمینی تجارت عام طور پر انہی چیزوں تک محدود رہی جو قیمت میں زیادہ اور وزن یا حجم میں کم ہوتی تھیں جس کی وجہ نقل و حمل پر آنے والی لاگت تھی۔ زمینی تجارت میں گھوڑوں کی درآمد سب سے اہم تھی۔ ہندوستان میں فوج کے لیے عربی، عراقی اور وسط ایشیائی گھوڑوں کی متواتر مانگ موجود تھی کیونکہ سوار فوج جنگ میں بنیادی ہتھیار تھی۔ گھوڑے نام و نمود اور اعلیٰ معیار زندگی کا بھی اظہار کرتے تھے اس لیے ان کی قدر کی جاتی تھی۔ اس طرح گھوڑوں کی خرید و فروخت کا باقاعدہ انتظام حکومت کا ایک اہم یا ترجیحی کام تھا۔ جن دوسری اشیاء کی ہندوستان میں درآمد ہوتی تھی اُن میں اونٹ، سمور، گورے غلام، مخمل، خشک میوے اور شراب شامل تھیں۔ چائے اور ریشم چین سے درآمد کیے جاتے تھے، جبکہ ریشم ایران سے بھی درآمد کیا جاتا تھا کیونکہ شہتوت اور ریشم کے کیڑے وہاں منگولوں نے تیرھویں اور چودھویں صدی میں پہنچا دیے تھے۔ ہندوستان سے برآمد کی جانے والی اشیاء میں سوتی کپڑا، غذائی سامان، جیسے چاول، شکر اور مسالے شامل تھے۔ ہندوستان سے غلاموں کی برآمد بھی ایک متواتر سلسلہ تھی جن کی مانگ اسلامی ملکوں میں کافی زیادہ تھی۔

ہندوستان سے زمینی تجارت کا مرکز ملتان تھا۔ 1241 میں منگولوں کے ہاتھوں لاہور ایسا تباہ ہوا تھا کہ اُسے محمد بن تغلق کے عہد تک دوبارہ مضبوطی حاصل نہیں ہوئی۔ ملتان تمام غیر ملکیوں کی آمد کا بھی مرکز تھا جن میں وہ تاجر بھی شامل تھے جنھیں خراسانی کہا جاتا تھا۔ ان 'خراسانیوں' کی تعداد کا اندازہ کرنا تو مشکل ہے مگر یہ لوگ دولت کے معاملے میں ملتانیوں سے بہر حال کم تھے۔ غیر ملکی تاجر، خصوصاً عرب سمندری تجارت میں گجرات اور مالابار میں زیادہ متحرک نظر آتے تھے۔ ہندوستانی تاجر جن میں ہندو (اگروال، اور مہیشوری) اور جین اور بوہرے شامل تھے، یہ بھی سمندری تجارت میں کافی مشغول تھے اور یہ مغربی اور جنوبی ایشیا میں ہندوستانی تاجروں کی کالونیوں سے تجارت کرتے تھے۔ بنگال، چین اور جنوب مشرقی ملکوں سے تجارت کرتا تھا، جس میں کپڑے کی برآمد اور ریشم اور مسالوں کی درآمد شامل تھیں۔ ماہون نے، جو پندرھویں صدی کی ابتدا میں بنگال آیا تھا، لکھا کہ "ایسے دولت مند افراد کافی بڑی تعداد میں موجود تھے جو جہاز بناتے تھے اور تجارت کرنے دوسرے ملک جاتے تھے۔"

(ب) سماجی زندگی:

1- حکمراں طبقہ (ا) امراء

تیرھویں صدی میں شمالی ہندوستان میں جو سب سے اہم طبقہ اُبھرا وہ حکمراں طبقہ تھا جس میں امراء بھی شامل تھے۔ عام طور پر امراء کو تین درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ 'خان' جو سب سے اعلیٰ درجہ تھا، اور اس کے بعد 'مَلِک' اور 'امیر' آتے تھے۔ بہر حال یہ درجہ واری تقسیم کبھی بہت واضح یا صاف نہیں رہی۔ دربار میں اور اس سے ملحق سب سے نچلے درجے کے عہدوں پر مقرر افراد۔ جیسے 'سر جاندار' (بادشاہ کی ذاتی فوج کے کمانڈر) 'ساقئی خاص' (پانی اور دوسرے مشروبات کے منتظم) اور ان کے ساتھ کے کارکن بھی جو 'سپہ سالار' 'سر خیل' (فوج کے جونیر کمانڈر) وغیرہ ہوتے تھے 'امیر' کے خانے میں آتے تھے۔ بعد میں امیر کا لفظ کچھ آسان سے معنی میں استعمال ہونے لگا اور ہر وہ شخص جو کچھ دولت یا سرکار میں اثر و رسوخ رکھتا تھا امیر کہلایا جانے لگا۔ بہر حال سب سے اہم درجے 'ملک' اور 'خان' کے تھے۔ حکومت کے تمام عہدے اسی زمرے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے پاس ہوتے تھے۔ امراء کی جو فہرستیں منہاج سراج اور برنی نے دی ہیں ان میں صرف 'ملکوں' کا ذکر ہے۔ 'خان' زمرہ اصل میں منگولوں کا اثر تھا کیونکہ ان میں قاآن (خان) 10000 سپاہیوں کا کمانڈر ہوتا تھا۔ دہلی سلطنت میں خان کا لفظ ایک مخصوص اور اعلیٰ حیثیت دینے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ جب بلبن کو اُلغ خان کہا جاتا تھا۔ امراء کو کچھ اور خطابات دے کر ان کی حیثیت میں امتیاز پیدا کیا جاتا تھا' جیسے 'خواجہ جہاں' 'عماد الملک' 'نظام الملک' وغیرہ۔ انھیں کچھ اور مراعات یا حقوق (مراتب) بھی دیے جاتے تھے جیسے مختلف قسم کی خلعتیں، 'تلوار و خنجر' 'نشان (جھنڈا)' 'نوبت' وغیرہ۔ ان کی ہمیشہ بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی چونکہ ان سے حیثیت یا اقتدار اور بادشاہ کی قربت کا احساس ہوتا تھا۔ گھوڑے اور ہاتھی مع مرصع ساز و سامان بھی ان امراء کو مختلف موقعوں پر عطا کئے جاتے تھے۔

کسی خاص وقت میں کسی دربار میں امراء کی تعداد کا صحیح علم نہیں ہے۔ منہاج سراج نے التتمش کے عہد میں 32 ملکوں کی فہرست دی ہے جن میں 8 وسطی ایشیا سے برطرف شدہ حکمراں بھی تھے۔ شاید 'ترکانِ چہل گانی' (چالیس ترک) کی اصطلاح برنی نے صرف چوٹی کے امراء کے

میں یہ پہلی شکست تھی۔

اس طرح 91-990 سے 1015 تک گھمسان لڑائی کا دور تھا جس میں افغانستان اور پھر پنجاب اور ملتان وغیرہ غزنویوں کے ہاتھ آگئے۔ اب ترکوں کے لیے گنگا کے میدان تک پہنچنے کا راستہ کھل گیا تھا۔

(iii) شمالی ہندوستان میں راجپوت حکومت (دس سے بارہویں صدی عیسوی) اور غزنوی۔

دسویں صدی کے وسط نے دو انتہائی طاقتور راجپوت حکومتوں کی تباہی دیکھی جو پچھلی دو صدیوں سے وسطی اور شمالی ہندوستان پر اپنا اقتدار جمائے ہوئے تھیں۔ یہ حکومتیں تھیں گوجر پرتی ہار جس کا دارالسلطنت قنوج تھا اور راشٹر کوٹا جس کا دارالسلطنت منیا کھیت تھا۔ گوجر پرتی ہار سلطنت ہمالیہ کی ترائی سے جنوب میں اُجین تک اور مغرب میں گجرات سے مشرق میں مونگیر تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے گجرات اور مالوا پر اقتدار کے لیے راشٹر کوٹا اور بہار اور مشرقی اترپردیش پر اقتدار کے لیے بنگال کے پال حکمرانوں سے مقابلہ کیا۔ شمال مغرب میں ان کی حکومت تھانیشور تک پھیلی ہوئی تھی۔ دسویں صدی کے آخری نصف حصہ میں اس میں تیزی سے زوال آیا اور یہ صرف موجودہ یوپی تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اسی دوران بہت سی سلطنتیں ابھریں۔ ان میں سب سے نمایاں کالنجر اور مہوبا کے چندیلا یا چندیل، راجستھان میں سانبھری کے چوہان، مالوہ کے پارامار اور گجرات کے چولوکیہ تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کے پاس کئی جاگیردار تھے جو مختلف اوقات میں اپنے سربراہوں کی مدد کرتے تھے لیکن زیادہ تر خود مختار ہونے کی سازش میں لگے رہتے تھے۔ کشمیر ایک بے حد بااثر رانی دِدّا کے زیرِ اثر تھا جس نے چھبیس سال تک حکومت کی یہاں تک کہ اقتدار کے لیے اپنے پوتے تک کو قتل کروادیا۔ شاہیوں کے ساتھ اس کی پرانی دشمنی تھی اس لیے اس نے محمود کے خلاف ان کی جدوجہد میں کوئی مدد کرنے سے احتراز کیا۔ فرشتہ کے قول کے برخلاف نہ ہی کسی دوسرے راجپوت راجا نے محمود کے خلاف اندرپال کی جدوجہد میں اس کی مدد کی۔

پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد محمود نے گنگا کی وادی میں تین مرتبہ معرکہ آرائی کی کوشش کی۔ ان چھاپوں کا مقصد اپنی وسطی ایشیائی مہم کے لیے دولت اکٹھا کرنا تھا اس کے ساتھ ہی

اظہار کے لیے استعمال کی ہے۔ بلبن کے عہد میں اُس نے قاضیوں کے علاوہ 36 ملکوں کی فہرست دی ہے۔ علاء الدین خلجی کے دور میں امراء کی تعداد 48 تک پہنچ گئی جن میں 17 افراد رشتے دار تھے جن میں سلطان کے بیٹے بھی تھے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ اس وقت جب علاء الدین خلجی کی موت کے بعد سلطنت میں ایک دم توسیع نہیں ہوئی ملک میں چوٹی کے امراء یا ملکوں کی تعداد کافی کم تھی اور جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں امراء کے اس چھوٹے سے زمرے میں بھی آپسی کشمکش اور جھگڑے کافی سخت رہے تھے۔ اس کشمکش میں آپسی تعلقات یا نسلی قربت یا فرق بھی اہم کردار ادا کرتے تھے۔ ترک خود کو تمام دوسری نسلوں سے متعلق لوگوں۔۔۔ جیسے تاجکیوں، خلجیوں، افغانوں، ہندوستانیوں وغیرہ سے افضل اور اعلیٰ سمجھتے تھے۔ التمش کی موت کے بعد تاجکیوں کو خارج کر دیا گیا اور اعلیٰ عہدوں پر لگ بھگ ترکوں کا اجارہ یا گرفت قائم ہوگئی۔ خلجیوں کے عروج سے یہ گرفت ٹوٹی۔ پھر خلجیوں اور تغلق کے دور میں ہندوستانی مسلمان آگے بڑھے، مگر محض اپنی ذاتی صلاحیت اور مستعدی کے بل پر۔ پھر بھی غیر ملکی خون یا کسی مشہور و اعلیٰ خاندان کا وراثتی تعلق کافی حد تک سماجی قدر و منزلت کا پیمانہ رہا جس کی مراقش کے سیاح ابن بطوطہ نے بھی تصدیق کی ہے۔

بلند مرتبہ امراء کے سماجی پس منظر کے بارے میں ہمارے پاس کوئی خاص معلومات موجود نہیں ہیں۔ شروع کے دور میں حرکت یا سماجی طور پر منتقلی کی کیفیت کسی حد تک موجود تھی، اور ایک وسیع سماجی پس منظر رکھنے والے وہ افراد جو فوجی سلسلے میں اپنے ساتھ ایک تابعدار جمعیت پیدا کرلینے کی صلاحیت اور طاقت بھی رکھتے تھے، یا جو سلطان کی نظر التفات حاصل کر لیتے تھے، اور اگر اُن کی قسمت ان کا ساتھ دیتی تھی تو وہ 'ملک' تک کے عہدے پر پہنچ سکتے تھے۔ بہت سے امراء نے حقیقت میں اپنی زندگی کی ابتدا غلام کی حیثیت میں کی تھی اور سماجی زینے کے اونچے درجوں پر آہستہ آہستہ چڑھے تھے۔ امراء کے زمرے میں یہ فراخی تیرھویں صدی تک شاہی خاندانوں کے تیز عروج و زوال کی وجہ سے رہی جس کے نتیجے میں پچھلی سلطنت کے دور کے زیادہ تر امراء تبدیلی کی نظر ہو جاتے تھے۔ اسی لیے تیرھویں صدی کے درمیان ہمیں ایسے خاندان مشکل سے نظر آتے ہیں جن کے افراد ایک نسل سے زیادہ کسی اعلا مرتبہ امارت پر باقی رہے ہوں۔

چودھویں صدی میں خلجیوں کے عروج اور پھر تغلق خاندان کے عروج کے ساتھ ساتھ، جنھوں نے لگ بھگ سو سال حکومت کی، امراء اور زمرے کی سماجی بنیاد پھیلی بھی اور زیادہ مضبوط اور مستحکم بھی ہوئی۔ اعلیٰ عہدوں پر ترکی امراء کے اجارے کے ٹوٹنے کے ساتھ طبقۂ امراء میں داخل ہونے کے لیے بھرتی کا میدان بھی وسیع ہوا۔ بہت سے خلجی، افغانی اور ہندوستانی زمرۂ امراء میں شامل ہوئے۔ ترکوں کو نکال باہر کرنے کی کوئی خاص کوشش بھی نہیں کی گئی۔ بہر حال، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا اگر کبھی امیر اپنے اقتدار اور عہدے سے ہٹایا بھی جاتا تھا تو اس کی سماجی حیثیت اور سابقہ اقتدار اس کے ورثاء میں پہنچ جاتا تھا اور ان ورثاء کو یہ یقین ہوتا تھا کہ کھوئی ہوئی طاقت یا اقتدار کی واپسی صرف کسی مناسب وقت اور موقع کی منتظر ہے۔

مذہبی افراد کے ساتھ یہ زمرے وہ حلقہ بناتے تھے جسے عرف عام میں 'اشراف' کا نام دیا جاتا تھا اور انھیں محترم اور قابلِ تعظیم مانا جاتا تھا۔ اُس دور کے اندازِ فکر کے مطابق حکومت پر اس حلقے کے سلسلے میں ایک مخصوص ذمے داری عائد ہوتی تھی، جو صرف ان کی ملازمت سے ہی تعلق نہیں رکھتی تھی بلکہ ان کی بیواؤں کو پنشن دینے اور ان کی غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی کے لیے بھی ذمہ دار تھی۔

عام طور پر 'اہلِ سیف' (جنگجو) اور 'اہلِ قلم (پڑھنے لکھنے والے لوگوں کے درمیان) ایک تقسیم بھی خاصی واضح تھی۔ موخرالذکر کو عدالتی اور تحریری کاموں سے متعلق عہدوں کے لیے چنا جاتا تھا۔ علما بھی اِسی زمرے میں آتے تھے۔ جب تک منحرف یا ضدی قسم کے سرداروں، مقدموں اور کسانوں سے لگان وصول کرنے کے سلسلے میں انتظامیہ کا کام فوجی خدمات کے مترادف یا متوازی تھا، پڑھے لکھے زمرہ کو انتظامیہ سے عام طور پر الگ رکھا جاتا تھا، لیکن اس کے باوجود زور اِسی بات پر دیا جاتا تھا کہ وزیر کو علم والے زمرے سے چنا جانا چاہیے۔ عام طور پر امراء علم والے طبقے کو کچھ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انھیں انتظامی اور سیاسی معاملات کے لیے ناموزوں تصور کرتے تھے۔ چنانچہ علاءالدین خلجی نے قاضی مغیث کے اس مشورے کو کہ منگولوں سے کسی قسم کے معاہدے کی کوشش کی جائے نہ صرف مسترد کیا بلکہ ایک نویسندہ ابن نویسندہ (کلرک) کی حیثیت کا آدمی ہوتے ہوئی فوجی اور سیاسی امور میں مشورہ دینے کے لیے اس کا تحقیر

آمیز انداز میں مذاق بھی اڑایا۔

'اشراف' کے، اس حلقے یا جماعت سے جس سے امراء کا انتخاب ہوتا تھا، اس کے اثر سے امراء کو ایک استحکام تو ضرور نصیب ہوا مگر اس سے مسلم سوسائٹی میں بھی ایک طرح کی درجہ بندی یا طبقہ واریت پیدا ہو گئی۔ 'اشراف' کے مقابلے میں 'اجلاف' یا 'کم اصل' (نچلے درجے) کے لوگوں کا طبقہ ہوتا تھا۔ اس نچلے درجے میں عام شہری اور پیشہ ور لوگ، جیسے جلاہے، کسان، مزدور وغیرہ ہوتے تھے۔ اشراف اور اجلاف کے طبقوں کے درمیان صرف شادی بیاہ ہی ناممکنات میں سے نہیں تھا بلکہ ان میں سماجی تعلقات بھی بہت مشکل سے قائم ہوتے تھے۔ اس قسم کی سماجی درجہ بندی گو کہ مغربی اور وسطِ ایشیا کے مسلمانوں میں کسی قدر پہلے بھی موجود تھی، یہ ہندوستان پہنچ کر۔ جہاں دیرینہ روایت کے تحت ذات پات ورثے میں ملتی تھی۔ اور زیادہ سخت ہو گئی۔

اس گہری سماجی تقسیم سے ہی یہ تصور پیدا اور راسخ ہوا تھا کہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے کا حق صرف 'باعزت' طبقے کے افراد کو حاصل ہے۔ اس لیے جب محمد بن تغلق نے اعلیٰ عہدوں پر، صرف مستعدی اور کارکردگی کی بنیاد پر، 'نچلے' درجے یا 'ذات' سے تعلق رکھنے والے مسلمان یا ہندوؤں۔ جیسے شراب کشید کرنے والے، نائی، باورچی، مالی، دکاندار (بازاری) وغیرہ۔ کا تقرر کیا تو اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں کافی وسیع پیمانے پر مزاحمت کا انداز نظر آیا۔ کچھ مختلف وجوہات کے نتیجے میں اس کا یہ تجربہ ناکام ہوا۔ دوسری طرف فیروز تغلق نے جب اپنے امراء میں صرف 'باعزت' طبقے سے ایسے لوگوں کو مقرر کیا جن کے آباواجداد بادشاہ کی خدمات انجام دے چکے تھے تو اس کی بہت تعریف و توصیف کی گئی اور اعلیٰ طبقے نے اسے بہت پسند کیا۔ فی الحقیقت یہ تعصب صرف 'ہندوستانیوں' کے خلاف نہیں بلکہ پورے نچلے طبقے کے خلاف تھا، خواہ وہ ہندوستانی مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کیفیت کا ثبوت اس بات سے مل جاتا ہے کہ فیروز کا وزیر خانِ جہاں، جو ایک برہمن نو مسلم تھا، اُسے مسلمانوں کے ہر طبقے نے خوشی سے قبول کر لیا تھا۔ اِس کے بالکل برعکس 'بارادوئی' اور 'پرواری' جنھیں غلطی سے نچلے درجے کے نو مسلم تصور کر لیا گیا تھا، اور جو علاءالدین خلجی کے انتقال کے بعد کچھ عرصے کے لیے چوٹی پر پہنچ گئے تھے، ان پر برنی نے بڑی سخت تنقید کی تھی۔

برنی کہتا ہے کہ بلبن کے عہد میں جب امراء کے پاس بظاہر بہت زیادہ نقد روپیہ موجود

نہیں تھا، یہ لوگ جب کوئی مجلس یا عیش و عشرت کی محفل سجانا چاہتے تھے تو اِن کے کارندے روپیہ قرض لینے، ساہوں، اور ملتانیوں، کے پاس دوڑے چلے جاتے تھے، جس کے نتیجے میں ان کے اقطاع سے حاصل ہوئی ساری آمدنی اِن لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی تھی اور سونا چاندی صرف تاجروں کے گھروں میں پایا جاتا تھا۔ علاء الدین خلجی کے برسر اقتدار آنے اور اس کے تحت لگان کے ایک نئے مرکزی نظام کے اُبھرنے سے اس صورتِ حال میں کسی حد تک تبدیلی پیدا ہوئی۔ یہ نظام خلجی حکمرانوں تک باقی رہا۔ اس نئے محصولی نظام میں ترجیح اس بات کو دی جاتی تھی کہ لگان نقد رقم میں ادا کیا جائے۔ اور یہ طریقہ صرف خالصہ علاقوں۔ جن کی آمدنی براہِ راست مرکزی خزانے میں جاتی تھی۔ پر ہی عائد نہیں ہوتا تھا بلکہ اُن علاقوں کے لیے بھی تھا جو 'اقطاع' کے طور پر دیے گئے تھے۔ اس طرح جب ابنِ بطوطہ کو منصف مقرر کیا گیا اور اس کی تنخواہ 5,000 مقرر کی گئی تو اُسے ایسے ڈھائی گاؤں دے کر اس کی ادائیگی کی گئی جن کی سالانہ آمدنی اس رقم کے برابر ہوتی تھی۔ اب ہمیں بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے امراء کا بھی علم ہے۔ چنانچہ ملک کو 50,000 سے 60,000 ٹنکہ تک تنخواہ ملتی تھی۔ امیر کو 30,000 سے 40,000 ٹنکہ کے درمیان اور سپہ سالار کو 20,000 ٹنکہ ملتے تھے۔ فیروز تغلق کے عہد میں تنخواہیں اور زیادہ تھیں۔ چنانچہ خانِ جہاں مقبول کو 13 لاکھ ٹنکے ملتے تھے اور ان کے علاوہ اس کی فوج اور ملازمین کے اخراجات اور اس کے بیٹوں اور دامادوں کے بھتّے (الاؤنس) الگ تھے، دوسرے امراء کو چار سے آٹھ ٹنکے سالانہ تنخواہ ملتی تھی۔

مجموعی طور پر اس کا مطلب یہ تھا کہ دیہی علاقوں سے ہونے والی زائد یا اضافی آمد مرکز میں کچھ اعلیٰ طبقے کے ہاتھوں میں مرکوز ہو رہی تھی۔ بڑی بڑی تنخواہوں کا مطلب صرف یہی نہیں تھا کہ فضول خرچی بڑھ رہی تھی 'اس سے دولت کی ذخیرہ اندوزی کے امکانات بھی بڑھ رہے تھے۔ ملک شاہین جو فیروز کا نائب امیر مجلس تھا، اس نے اپنے بعد ہیرے جواہرات، زیورات اور بیش قیمت خلعتوں کے علاوہ 50 لاکھ ٹنکے چھوڑے۔ عماد الملک بشیر سلطانی نے جو بادشاہ کا غلام رہ چکا تھا، 13 کروڑ ٹنکے اپنی موت کے بعد چھوڑے جن میں سے 9 کروڑ سلطان نے ضبط کر لیے۔ بہر حال ان مثالوں کو معمول نہیں مستثنیات سمجھنا چاہیے۔ بعد کے غیر یقینی حالات میں ایک تحفظ یا سہارا

بن جانے کے علاوہ ایسے خزانوں کی تعداد میں اضافہ اس پیمانے کا بھی اظہار کرتا ہے جس سے ملک میں نقد زر پر مبنی معاشیات ست رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ بہر طور نقد زر پر مبنی معاشیات کے ابھرنے اور مستحکم ہونے سے تجارت اور تاجروں کے حق میں اندازِ فکر میں بھی تبدیلی پیدا ہونے لگی تھی۔ ابن بطوطہ نے دہلی کے سلطان کی ملکیت میں پانی کے جہازوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ایک موقع پر سلطان محمد بن تغلق نے شہاب الدین قزرونی، جو اس کا دوست اور ساتھی تھا اور سمندری تجارت میں بہت پھول پھل رہا تھا اور 'شاہِ تجار' کہلاتا تھا، اُسے تین جہاز سونپ دیے۔ غالباً پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ تاجروں نے انتظامیہ میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے محمد بن تغلق نے کھمبایت شہر کا انچارج شہاب الدین کو مقرر کر دیا تھا۔ اگر ابن بطوطہ کے بیان کو صحیح مان لیا جائے تو سلطان نے اُسے وزیر مقرر کرنے کا بھی وعدہ کر لیا تھا مگر دہلی کی طرف سفر کرتے ہوئے اُسے وزیر خانِ جہاں نے قتل کروا دیا۔

ایسی اطلاعات بھی موجود ہیں کہ عراق کا ابوالحسن عبادی، جو دہلی میں قیام رکھتا تھا، وہ سلطان محمد بن تغلق کے پیسے سے تجارت کرتا تھا اور اس کے لیے عراق اور خراسان سے ہتھیار اور دوسری اشیاء خریدتا تھا۔ ممکن ہے دوسرے امراء نے بھی سلطان کی مثال پر عمل کیا ہو مگر اس کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ دوسری طرف اس کا اظہار زیادہ ہوتا ہے کہ امراء کی سرمایہ کاری زیادہ تر تجارت کی بجائے باغات پر ہوتی تھی جن کی تعداد فیروز کے عہد میں امراء کی خوشحالی میں اضافے کے ساتھ بہت تیزی سے بڑھی۔ بہر طور، امراء کی طرف سے پیداواری سرمایہ کاری کے اُبھرنے میں ابھی کچھ وقت اور درکار تھا اور اِسے اکبر کے عہد کی نومرکزیت کا انتظار تھا۔ ترکی امراء کی تعلیم اور ثقافتی (کلچرل) طرزِ فکر کے بارے میں بہت کم معلومات موجود ہیں۔ ظاہری طور پر وہ ناخواندہ تو نہیں تھے۔ یہاں تک کہ سمرقند و بخارا کے غلاموں کو بازاروں میں دوبارہ بیچنے سے پہلے پڑھنا لکھنا سکھایا جاتا تھا۔ حالانکہ غلاموں میں بہت سے غلام تازہ نو مسلم ہوتے تھے مگر یہ وسطِ ایشیا اور خراسان وغیرہ میں اس وقت کے اسلامی ثقافتی اور مذہبی معمولات سے بخوبی واقف ہوتے تھے۔ بہر حال یہ ایک دیرینہ اور مستحکم امراء طبقے جیسی ثقافتی شان و شوکت مشکل سے ہی اپنا سکتے تھے۔ نہ ان امراء سے ایسی کسی بات کی توقع کی جا سکتی تھی کہ یہ باشعور انداز میں کلچر کے مربّی یا سرپرست

رہے ہوں گے، گو کہ شعراء اور ادیبوں کی سرپرستی امارت اور عظمت کی علامت سمجھی جاتی تھی اور کبھی کبھی انھیں غیر معمولی انعام واکرام سے بھی نوازا جاتا تھا۔ اس صورتِ حال میں امیر خسرو اور ان کے ساتھی امیر حسن سجزی کے منظر عام پر آنے سے تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ تیرھویں صدی کے آخر میں یہ صورتِ حال پیدا ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ ایک نیا ہندو۔ مسلم کلچر اُبھرنا شروع ہوا جس کی نشو ونما میں بہت سے امراء اور صوفیاء نے قابلِ قدر انداز میں حصہ لیا۔ اس طرح ضیاء نخشبی (فوت 1350) نے بہت سے موضوعات پر لکھا جن میں شعر و سخن بھی شامل تھا اور انھوں نے بہت سی سنسکرت تحریروں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

اس طرح ضدی قسم کے جنگجو کی حیثیت سے امراء رفتہ رفتہ کلچر کے مربی اور سرپرست بھی ہوتے چلے گئے۔

(ب) سردار۔ زمینداروں کا منظر عام پر آنا:

حالانکہ راجپوت لگ بھگ پورے شمالی ہندوستان میں حکمرانی کا اقتدار کھو چکے تھے اور اب صرف راجستھان اور اُس کے آس پاس کے علاقوں اور دور افتادہ ہمالیہ کے پہاڑی علاقوں، بندیل کھنڈ وغیرہ میں ہی ان کا کچھ اقتدار باقی تھا، لیکن راجپوت راجہ مرکز کے زیرِ انتظام پنجاب، دوآب، بہار، گجرات وغیرہ کے بڑے بڑے علاقوں پر اب بھی خاصی مضبوط گرفت رکھتے تھے۔ یہ لوگ 'رائے'، 'رانا'، 'راوت وغیرہ کے ناموں سے جانے جاتے تھے۔ ان کے اپنے مسلح فوجی دستے ہوتے تھے اور یہ لوگ عام طور پر دیہی علاقوں میں اپنے چھوٹے قلعوں یا گڑھیوں میں رہتے تھے۔ ان کی تعداد یا ان کی فوجی طاقت کا اندازہ بہت کم موجود ہے، بہر حال یہ دیہی علاقوں کی معاشی اور سماجی زندگی اور وہاں کی سیاسی صورتِ حال میں اہم حیثیت کے حامل تھے۔ حالانکہ اس وقت کے مآخذ انھیں پوری طرح دشمن کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ جن سے مستقل جہاد صرف جائز ہی نہیں لازمی تھا۔ لیکن ایک مستقل دشمنی کا ماحول نہ ترکی سلطانوں کے لیے کوئی پر سکون صورتِ حال تھی نہ خود ان راجاؤں کے لیے۔ ترکی سلطانوں کے حق میں یہی صورتِ حال مناسب تھی کہ یہ اپنے اپنے علاقوں میں اس وقت تک حکومت کرتے رہیں جب تک یہ خراج کے طور پر ایک مقررہ رقم پابندی سے ادا کرتے رہیں اور عام طور پر وفاداری اور تابعداری کا اظہار کرتے رہیں۔

ترک حکمرانوں اور ہندو سرداروں کے درمیان بڑھتے ہوئے سیاسی تعلق کے سلسلے میں شہادتیں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ بتایا جاتا ہے یہ ہندو رائے سو سو کوس کی دوری سے بلبن کے دربار کی شان و شوکت دیکھنے آیا کرتے تھے۔ بنگال میں بلبن کی طغرل پر فتح کے بعد اودھ میں بہت سے لوگ اُسے خوش آمدید کہنے آئے جن میں اس علاقے کے رائے بھی تھے۔ کچھ بعد میں جب فیروز تغلق نے بنگال پر حملہ کیا تو مشرقی اتر پردیش کے رائے اس کے ساتھ جن میں سب سے اہم شخصیت گورکھپور اور چمپارن کے رائے اودے سنگھ کی تھی، اس نے خراج کے بیس لاکھ بھی ادا کیے جو اس پر ادھار تھے۔

ایک اور موقع پر جب بلبن کے ایک بھتیجے ملک چھجو نے، جو کڑا کا گورنر تھا، جلال الدین خلجی کے خلاف بغاوت کی تو وہاں کے مقامی رائے، راوت اور پایک اس کے ساتھ شامل ہو گئے اور "چیونٹیوں اور ٹڈیوں کی طرح اس کے اردگرد منڈلانے لگے۔" جلال الدین خلجی سے مقابلے میں وہ اُس کے ساتھ جمے رہے۔ ملک چھجو کو تو شکست ہوئی۔ مگر اس واقعے کے بعد سے ہندو سردار دربار میں سلطان کے سامنے حاضر رہنے لگے۔ اسی طرح یہ بھی سنا جاتا ہے کہ فیروز تغلق کے عہد میں 'ائی رتھو' جو "دو شاہی چھتروں کا مالک" تھا، رائے مدار (یا بلّار) دیوا، رائے سُمیر، راوت ادھی رام وغیرہ کو دربار میں صرف حاضر ہونے کی ہی اجازت نہیں تھی بلکہ دربار میں بیٹھنے کی بھی اجازت تھی۔

سلطنت عہد میں ان بڑھتے ہوئے سیاسی رشتوں کے باوجود سرداروں کی حیثیت بہت حد تک غیر یقینی ہی تھی۔ دہلی کے سلطانوں کی پالیسی میں ایک حصہ یہ بھی تھا کہ جب بھی ممکن ہو ہندو سرداروں کو بے دخل کر دیا جائے یا مستقل طور پر یہ کوشش جاری رکھی جائے کہ اِن سرداروں کے مقبوضہ علاقوں میں شاہی محصول انتظامیہ کو عائد کر کے ان کی طاقت اور حقوق اور سہولتوں کو متواتر گھٹایا جائے۔ حالانکہ اس طرزِ عمل سے غالباً کسانوں پر پڑنے والے مجموعی بار میں تو تخفیف نہیں ہوئی ہو گی مگر اس سے سرداروں اور دوسرے بچولیوں کے حقوق اور بالائی آمدنی میں غالباً کچھ کمی ضرور آئی ہو گی۔

چودھویں صدی کی ابتدا تک ہمیں 'زمینداروں' کا ذکر بھی بار بار ملنے لگتا ہے۔ یہ

اصطلاح جو ہندوستان سے باہر کہیں استعمال نہیں ہوئی، ایسے ایسے بچولیوں کے لیے متواتر استعمال کی جانے لگی جو موروثی حقوق رکھنے والے تھے۔ امیر خسرو نے اسے سب سے پہلے استعمال کیا۔ کچھ عرصے بعد رفتہ رفتہ یہ اصطلاح خوطوں، مقدموں اور چودھریوں بلکہ ان سابقہ سرداروں کے لیے بھی استعمال ہونے لگی جنھیں اس بات کے لیے مجبور کر دیا گیا تھا کہ وہ ایک متعینہ مجموعی رقم ادا کرنے کے بجائے لگان کے تخمینے کی بنیاد پر مقرر کی جانے والی رقم ادا کریں۔ مغلوں کے عہد میں لفظ 'زمیندار' ان تمام لوگوں کے لیے جو زمین کی موروثی ملکیت رکھتے تھے یا لگان میں موروثی حصہ رکھتے تھے، استعمال ہونے لگا۔ سردار تک بھی اسی زمرے میں شمار کیے جانے لگے۔

ان حقوق یافتہ دیہی لوگوں کے طرزِ زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات موجود ہیں۔ بہر حال ان کے تمول یا دولتمندی کا باقی لوگوں کی غربت سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔

(ii) حکمراں طبقے کے ملحقات: عدالتی اور نچلے درجے پر انتظامیہ کے افسران اور علماء:

حکمراں طبقہ، خصوصاً امراء نچلے درجے کے کارکنوں کی مدد حاصل کیے بغیر کام کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے بہت سے ملازمین، غلام اور دوسرے مصاحبین وغیرہ بھی ہوتے تھے۔ ان کارکنوں کو مجموعی طور پر دو اقسام میں بانٹا جاسکتا ہے۔ عدالتی اور مذہبی کارکن اور دوسرے محصول اور انتظامیہ سے متعلق کارکن۔ اول الذکر میں قاضی اور مفتی ہوتے تھے جو اُن تمام شہروں میں مقرر کیے جاتے تھے جہاں مسلمانوں کی قابلِ ذکر آبادی ہوتی تھی۔ یہ لوگ مسلمانوں کے معاملات میں دیوانی مقدمات فیصل کرتے تھے اور ہندوؤں کے معاملات کو اُن کے روایتی قوانین اور دھرم شاستر کے مطابق فیصلوں کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ یہ فوجداری مقدموں کا بھی فیصلہ کرتے تھے۔ ان کا افسر اعلیٰ قاضی القضاۃ یا سب سے بڑا قاضی ہوتا تھا۔ پایہ تخت اور شاید دوسرے شہروں میں ایک 'داد بک' ہوتا تھا جو بے حساب عاید کیے ہوئے محصولوں کی وقتاً فوقتاً جانچ پڑتال کرتا تھا، اور اُن امیروں پر نگرانی اور گرفت رکھنے کے لیے ذمے دار ہوتا تھا جو محصول کی وصولی کی غرض سے مسلمانوں کی املاک کا سروے کر کے ان کا حساب رکھتے تھے۔ اِن کے علاوہ

محتسب بھی ہوتا تھا جو کوتوال کے ماتحت کام کرتا تھا اور اس پر نگاہ رکھنے کا ذمہ دار ہوتا تھا کہ سلطان اعلانیہ شریعت کے خلاف کام نہ کریں یا روزہ نماز جیسے فرائض کی پابندی سے منہ نہ موڑیں۔ وزن اور ناپ تول کی نگرانی بھی اسی کی ذمے ہوتی تھی۔

یہ سب تنخواہ دار عہدے ہوتے تھے اور جیسے جیسے مسلمان آبادی بڑھی ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ پھر امام اور موذن وغیرہ بھی ہوتے تھے جن کا تقرر مسجدوں میں کیا جاتا تھا۔ مقبروں وغیرہ پر قرآن شریف کی تلاوت کے لیے قاری رکھے جاتے تھے۔ انھیں دوسری تقریبات کے موقعوں پر بھی بلایا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ مذہبی قابلِ احترام لوگوں کو مختلف اسکولوں (مکتبوں) اور کالجوں (مدرسوں) میں مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ سب لوگ دینی یا مذہبی طبقے میں شمار ہوتے تھے اور علماء کہے جاتے تھے۔ علماء کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ عام اصول کے مطابق یہ لوگ مسلم قوانین (شریعت)، منطق اور دینیات وغیرہ میں باقاعدہ تربیت یافتہ ہوتے تھے اور عربی زبان کی بھی کچھ واقفیت رکھتے تھے۔ ان سرکاری طبقوں کے علاوہ بھی مسلم علماء اور دیندار لوگوں کا ایک طبقہ تھا جنھیں حکومت کی طرف سے وظائف اور لگان معاف زمینیں اور دوسرے عطیات دیے جاتے تھے۔

اس وسیع اور غیر منظم قسم کے زمرے کی سماجی بنیاد کے بارے میں معلومات بہت کم موجود ہیں۔ مجموعی طور پر اس زمرے کو وہ طبقہ کیا جاسکتا ہے جسے جدید اصطلاح میں نچلا درمیانی یا درمیانی طبقہ کہا جاتا ہے۔ گو کہ انھیں میں سے کچھ علماء قاضی القضاۃ کے درجے پر بھی پہنچے اور بڑی حد تک ان کا شمار حکمراں طبقے میں ہونے لگا۔ اکثر اوقات شعراء، علماء، مورخ، طبیب اور حکومت کے نچلے درجے کے کارکن۔ عامل (محصول وصولی کارکن) محرر (اکاؤنٹنٹ) وغیرہ بھی اسی سماجی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اسے ہم 'خواندہ' طبقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں اس ملک میں جہاں کی آبادی کا بڑا حصہ ناخواندہ ہو وہاں تعلیم یافتہ لوگ خاص طور پر جو مذہبی معلومات کا بھی دعویٰ رکھتے ہوں انھیں بڑا اعزاز و احترام حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر بھی علماء بحیثیت ایک طبقہ، بااثر اور سمجھدار قسم کے حلقوں میں کسی خاص اہمیت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ بلبن کے بیٹے بغرا خان نے بعد کے دور کے دینی افراد کے متعلق اپنے بیٹے کیقباد کو "لالچی اور چالباز لوگ۔۔۔ جنھیں اس دنیا کے علاوہ آخرت کی کوئی فکر نہیں۔۔۔" کے الفاظ کے ساتھ متنبہ کیا تھا۔ امیر خسرو

نے حکومت میں قاضیوں کے طبقے کو۔۔۔ بے ایمان (بدعنوانیاں کرنے والے)، جاہل اور حکومت میں کسی قسم کی ذمہ دار حیثیت کے لیے نااہل افراد کہا تھا۔ یہ لوگ عام طور پر گستاخ، مغرور، بے حقیقت اور ابن الوقت قسم کے لوگ کہے جاتے تھے جو کسی وقت بھی اپنے اصول و عقائد کو بااقتدار لوگوں کو خوش رکھنے کی خاطر قربان کر سکتے تھے۔ عام طور پر سلطان سیاسی معاملات میں انھیں کسی قسم کا مشورہ دینے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے، اور انھیں صرف عدالتی معاملات کو فیصل کرنے، مذہبی امور اور تعلیم کے سلسلے تک محدود رکھتے تھے۔ اس کے باوجود علماء نے عام مسلمانوں اور حکمراں طبقے کے درمیان ایک عبوری سلسلے یا پُل کا کردار ادا کیا اور مسلمانوں میں ایک اتحاد کا احساس پیدا کیے رہنے میں مدد کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ بہت سے علماء غیر ملکی تھے جنھوں نے یا تو منگولوں کے دباؤ سے بچنے کے لیے ہندوستان میں پناہ لی تھی یا ہندوستان کی خوشحالی نے انھیں یہاں کھینچ بلایا تھا۔ انھیں ہندوستان کے بارے میں بہت کم واقفیت تھی اور انھوں نے ہندوستانی دینی حلقے کے ایک طبقے کے ساتھ مل کر مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تناؤ بنائے رہنے کا کام کیا اور عوام میں جو ایک سماجی بھائی چارہ یا عام ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی اُسے نظر انداز کیا۔

مرکز میں انتظامیہ کے متواتر اُبھرتے ہوئے آئے کار کے لیے اور علاء الدین خلجی کے شروع کیے ہوئے نئے محصولی نظام کو مختلف صوبوں اور شہروں میں عائد کرنے کے لیے بہت بڑی تعداد میں کلرکوں اور دوسرے دفتری کارکنوں کی بھی ضرورت تھی۔ افسروں کے اس زمرے کی سرکاری طاقت، بدعنوانیوں کے امکانات اور ان کی طرف سے کی جانے والی زیادتیوں، اور پھر ان کی اصلاح کے لیے علاء الدین خلجی کے اٹھائے ہوئے متعدد اقدامات وغیرہ کو برنی نے بڑی وضاحت اور مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سرکاری خدمات میں بھرتی ہونے والے اس گروپ کے سماجی پس منظر کی معلومات موجود نہیں ہیں۔ ان میں سے بہت سے افراد ہندوستانی نو مسلم یا علماء طبقے سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ اگر ہم مقدموں اور پٹواریوں کو اس طبقے سے مستثنا کر دیں جو ہندو تھے، اور جو گاؤں میں رہتے تھے تو ان نچلے درجے کے افسروں میں زیادہ تر مسلمان ہوں گے۔ بہر حال لگتا ہے کہ محمد بن تغلق کے عہد تک ہندو بھی اس حلقے میں داخل ہونے لگے تھے کیونکہ یہی وہ حلقہ تھا جس

Ehd-e-Vusta Ka Hindustan, Part I
(Sultanat Sey Mughal Ehed Tak)

By – Prof. Satish Chandra

© قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت	:	جنوری، مارچ 2003 شک 1924
پہلا اڈیشن	:	1100
قیمت	:	121/=
سلسلۂ مطبوعات	:	1056

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی 110006

ان علاقوں کے صوبوں کو غیر مستحکم بنانا بھی تھا تا کہ وہ اس کے خلاف منظم نہ ہوں سکیں۔

1015 کے آخر میں محمود نے غزنی کو چھوڑا اور ہمالیہ کی ترائی میں تیزی سے اترا۔ جاگیر داروں کی مدد سے اس نے دریائے جمنا کو پار کیا اور یوپی (دور حاضر کے بلند شہر) کے مقامی راجہ کو ہرا لیا۔ مذہبی شہر متھرا کی طرف جاتے ہوئے اسے اس علاقے کے ایک اہم راجپوت کالا چوری حکمراں کو کالا دوئم سے مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ ایک زبردست جنگ تھی جس میں راجپوت راجا نے بڑی تعداد میں ہاتھیوں کا استعمال کیا تھا۔ اس کی شکست ایک بار پھر تیز رفتار گھوڑ سواروں کے مقابلے میں سست رفتار فوجیوں کی شکست تھی۔ متھرا اور ورنداون کو لوٹنے کے بعد محمود پرتی ہار حکمراں کے دارالسلطنت قنوج کی طرف بڑھا۔ پرتی ہار حکمراں جو انتہائی کمزور حالت میں تھا اپنی جان بچانے کی خاطر گنگا کے پار چلا گیا۔ قنوج کو پوری طرح تباہ کرنے کے بعد محمود غزنی کے راستہ میں چھوٹی چھوٹی مخالف ریاستوں کو ختم کرتا ہوا غزنی لوٹ آیا۔ گنگا کے میدان میں محمود کی یہ سب سے خاص اور سود مند لوٹ مار تھی۔ اس وقت تک وہ وسطی ایشیا میں اپنے دشمنوں پر بھی فتح پا چکا تھا اور اپنے اقتدار کو ایران تک پھیلا لیا تھا۔ بغداد میں خلیفہ نے اس کی ہندوستانی فتوحات کی اطلاع ملنے پر اس کے وفد کا بہت احترام کے ساتھ استقبال کیا۔

1019 اور 1021 میں گنگا کی وادی میں محمود کے اگلے دو حملوں سے اسے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا ان میں سے پہلا حملہ محمود کے خلاف راجپوتوں کے اتحاد کی ابتدائی کوشش کو توڑنا تھا۔ بندیل کھنڈ کے بااثر چندیل حکمراں کی شہہ پر قنوج کے پرتی ہار حکمراں کو ہٹا دیا گیا تھا کیوں کہ وہ محمود کی مدافعت کرنے میں بری طرح ناکام ہوا تھا۔ گوالیار کے راجپوت حکمراں نے ساتھ دیا اور پنجاب کے معطل شاہی حکمراں ترلوچن پال کی مدد کی۔ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے محمود نے شاہی حکمراں ترلوچن پال اور قنوج کے چندیل حمایتی جس کا نام بھی ترلوچن پال تھا، شکست دی۔ اس کے بعد اس نے چندیل حکمراں وِدّیا دھارا پر حملہ بول دیا جس کے لیے سنا تھا کہ اس نے 145,000 پیدل، 36,000 گھوڑ سوار اور کم از کم 640 ہاتھیوں پر مشتمل ایک فوج میدان میں اتاری تھی لیکن چھپٹ پٹ جھڑپوں کے علاوہ کوئی فیصلہ کن مقابلہ نہیں ہو سکا کیوں کہ دونوں ہی شکست کا سامنا کرنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ 1021 میں محمود نے پھر گوالیار پر

سے اس نے اعلیٰ حیثیتوں کے لیے کچھ تھوڑی سی تعداد میں افراد کا انتخاب کیا تھا۔اس طرح اس وقت تک فارسی داں ہندوؤں کا بھی ایک طبقہ اُبھر آیا تھا۔

(iii) تاجر اور سرمایہ کار طبقے:

ہندوستان میں تجارت کی بڑی پرانی روایت موجود تھی اور یہاں تاجروں اور سرمایہ کاروں کا ایک طبقہ قدیم زمانے سے موجود تھا۔ چنانچہ دھرم شاستروں میں ٹھیکے یا معاہدے، قرض کے لین دین اور خرید و فروخت سب کے لیے قوانین اور ضابطے متعین تھے۔ ویش ذات کے ایک باقاعدہ تاجر طبقے کے روپ میں ابھرنے اور ان کے دوِج (دوبار پیدا ہوئے یا حقوق یافتہ) طبقے میں شمار کیے جانے سے ملک کی سماجی اور معاشی زندگی میں ان کی اعلیٰ حیثیت کا اظہار بخوبی ہوتا ہے۔ بہر حال بڑے بڑے تاجروں (نگر استریشٹن) اور معمولی دکانداروں (بنک) اور معمولی بنجاروں کے درمیان واضح طور پر امتیاز کر لینا بہت ضروری ہے۔ پانچویں صدی میں تصنیف ہوئی کہانیوں (پنچ تنتر) کے مطابق اوّل الذکر زمرہ سماجی اعتبار سے حکمرانوں سے قریب سمجھا جاتا تھا اور شاہی خاندان کے ساتھ یہ لوگ آزادانہ طور پر گھلے ملے رہتے تھے۔ یہ بڑے تاجر صرف بڑے پیمانے یا تھوک کے بیوپار یا دور دراز علاقوں سے تجارت میں ہی حصہ نہیں لیتے تھے، جس میں غیر ملکوں سے تجارت بھی شامل تھی بلکہ یہ لوگ سرمایہ کاری اور روپے پیسے کی تبدیلی یا لین دین کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ یہ تاجر دور دراز کی تجارت کے لیے سرمایہ فراہم کرتے تھے، خطرات اور خدشات کے لیے تحفظ (بیمہ) دیتے تھے اور ہنڈی نظام کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ نقد رقمیں منتقل کرتے تھے۔

شمالی ہندوستان میں ایک مضبوط اور مستحکم مرکزیت پر مبنی حکومت، بنیادی طور پر چاندی کے ٹنکے پر مبنی کرنسی کا نظام و سڑکوں پر بہتر تحفظ اور امن، شہروں کی نشو و نما اور اسلامی دنیا سے ہندوستان کا متعارف ہونا، یہ تمام امور مغربی اور وسطی ایشیا سے ہندوستان کی برّی اور بحری تجارت کے لیے ذمہ دار تھے۔ بحری تجارت زیادہ تر گجرات کے راستے ہوتی تھی۔ اس کی تصدیق اُن متعدد بیانات سے ہوتی ہے جن میں تاجروں اور سرمایہ کاروں کو ملتانی کہا گیا ہے۔ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ پورے قرونِ وسطیٰ میں ملتان بہت اہم تجارتی مرکز تھا، چونکہ درّہ بولان کو پار کر کے

یہ براہِ راست ہرات اور بخارا سے مجڑا ہوا تھا جو "ریشمی سڑک" کا ایسا چوراہا تھا جو مشرق کی طرف سے وسط ایشیا اور چین سے اور مغرب کی طرف سے ایران اور قسطنطنیہ اور لبنان سے جڑا ہوا تھا۔ دریائے سندھ کے ذریعے ملتان مغربی بندرگاہوں سے بھی تعلق رکھتا تھا، ظاہر ہے کہ ملتانیوں کا بڑا حصہ ہندوؤں پر ہی مشتمل تھا۔

ہم برنی کے اس بیان کا ذکر کر چکے ہیں جس میں اس نے اظہار کیا تھا کہ ملتانی اور دہلی کے ساہا امراء کو روپیہ اُدھار دینے کے سلسلے میں اتنے رئیس ہو چکے تھے کہ سونا چاندی صرف انھیں کے گھروں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ برنی نے ملتانیوں اور ساہاؤں کی خوشحالی کو دوسرے انداز سے بھی بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جلال الدین خلجی نے ہندوؤں کے خلاف کوئی اقدام کرنے سے بالکل صاف انکار کر دیا جو دارالسلطنت دہلی میں بھی پوری مذہبی آزادی رکھتے تھے اور اُن میں سے خوشحال لوگ ظاہر ہے ملتانی، بڑے سکون اور عیش کی زندگی گزار رہے تھے اور انھیں اپنے جان و مال کے تحفظ کی کوئی فکر نہیں تھی۔

بیوپاریوں کے ایک اور زمرے کا بھی برنی نے حوالہ دیا ہے۔ یہ تھے دلال۔ یہ دلال اصل میں کمیشن ایجنٹ تھے جو خریداروں اور بیچنے والوں کو ایک دوسرے سے قریب لا کر اس کی فیس لیتے تھے۔ ان کا وجود دہلی میں تجارت میں اضافے کو ظاہر کرتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ مختلف چیزوں کے خریدار، خصوصاً کپڑے کے خریدار، بازاروں پر علاء الدین کی گرفت کے بعد دہلی کی طرف دوڑے چلے آتے تھے۔ برنی ان دلالوں کا ذکر خاص طور پر گھوڑوں کی فروخت پر علاء الدین کی گرفت کے سلسلے میں کرتا ہے۔ اُس نے ان دلالوں کے لیے بڑے سخت لفظ استعمال کیے ہیں، جن میں سے خاصی بڑی تعداد خصوصاً گھوڑوں کے تاجر، مسلمانوں کی ہی تھی۔ انھوں نے خود اپنا ایک مضبوط حلقہ بنا لیا تھا جو بہت پیسے والا تھا جو بعض موقعوں پر سلطان تک کی حکم عدولی کر لیتا تھا اور اس کے احکام کو نظر انداز کر دیتا تھا۔

دہلی میں مسلمان تاجر عام طور پر غیر ملکی عراقی، ایرانی، خراسانی وغیرہ تھے لیکن ان کے ساتھ کچھ مسلمان ملتانیوں کا ذکر بھی مل جاتا ہے۔ چنانچہ حسام الدین اور اس کا باپ اور دادا، جنھیں علاء الدین نے قاضی مقرر کیا تھا وہ ملتان کے ہی بیوپاری تھے۔ ابنِ بطوطہ کے قول کے مطابق

ہندوستان میں تمام غیر ملکی تاجر خراسانی کہلاتے تھے۔ مسلمان تاجروں کا ایک حلقہ افغانیوں کا تھا۔ ان کی خصوصیت کاروان تجارت اور گھوڑوں کی تجارت تھی۔

ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں تاجر فرقوں کی معلومات بہت کم ہیں۔ گجرات میں تجارت کی روایت بہت پختہ اور جمی ہوئی تھی جس میں مقامی اور غیر ملکی تاجر، دونوں فرقے موجود تھے۔ ہم ایک مصری، شہاب الدین قزرونی کا ذکر کر چکے ہیں جو کئی جہازوں کا مالک تھا اور کھمبایت میں رہتا تھا۔ جین، مارواڑی، گجراتی بیے اور بوہرے بھی تجارتی کام میں مصروف تھے جن کا ذکر روایتی اور مقامی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ انہی تاجروں میں سے علاء الدین کے لیے ملک کافور کو حاصل کیا گیا تھا۔

(iv) معیارِ زندگی:

اس دور کے مورخوں نے سلطان کے مُسرفانہ طرزِ زندگی کو بیان کرنے میں بڑی فراخدلی سے کام لیا ہے۔ ان کے محلات، ان کے ساز و سامان، ان کے حرموں میں بہت بڑی تعداد میں عورتوں اور اعزاء کی فضول خرچیاں، اُن کے قیمتی کپڑے اور زیورات، شاہی اصطبل پر زبردست اخراجات اور امراء، شعراء، علماء اور صوفیاء کو دیے جانے والے قیمتی تحفے تحائف کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ طرزِ زندگی ایک مستقل انداز بن گیا تھا اور یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ درباریوں اور رعایا کے ذہنوں پر اس کا اثر پڑتا تھا۔

ہمیں سلطانوں کی انفرادی زندگی کے اس انداز پر اس سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے جتنی آج کے لاأبالی اور شوقین قسم کے نوجوانوں پر توجہ دی جا سکتی ہے۔ لیکن سلطان بہر طور سرپرستی کا مرکز ہوتا تھا اور معاشرے میں سب سے اعلیٰ یا سرپرست (لیڈر) کی حیثیت رکھتا تھا اور معاشرے کے اعلیٰ طبقے کے طرزِ زندگی اور اندازِ فکر پر بڑا گہرا اثر رکھتا تھا۔

ہم تغلق کے دور سے امراء کی بڑھتی ہوئی خوشحالی اور فضول خرچی کو پہلے دیکھ چکے ہیں۔ بہر حال بلبن کے عہد میں، جیسا کہ ذکر ملتا ہے، اس کے رشتے کے بھائی ملک کشلی خان نے ایک موقعے پر اپنے تمام گھوڑے اور 10,000 ٹنکے اپنے شاعروں اور بھانڈوں کو دے دیے تھے۔ بلبن کا ماتحت کوتوال فخر الدین 12,000 قران پڑھنے والوں کو مالی امداد دیا کرتا تھا اور ایک ہزار

لڑکیوں کو ہر سال جہیز دیتا تھا۔ اس نے نہ کبھی ایک لباس کو دوبارہ پہنا نہ ایک بستر پر دوبارہ سویا۔ بلبن کا دیوانِ عرض عماد الملک اپنے دستر خوان (کھانوں) کے لیے مشہور تھا جو پچاس سے ساٹھ قابوں (ڈشوں) پر مشتمل ہوتا تھا جنھیں اس کے کارکنوں اور کلرکوں میں ہر روز تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ میر مقبول، محمد تغلق کا ایک امیر، اپنے ذاتی اخراجات کیلیے ساڑھے تین لاکھ ٹنکے خرچ کیا کرتا تھا۔ فیروز کے وزیر خانِ جہاں کے حرم میں 20,000 عورتیں تھیں۔ امراء کے اسراف کی ان مثالوں کو اِکادُکا نہیں تصور کیا جاسکتا، انھیں پھیلایا جاسکتا ہے۔

امراء کے اس طرزِ زندگی کی مانگوں کو پورا کرنے کے نتیجے میں کچھ مخصوص قسم کی صنعتوں کے ابھرنے کے مواقع پیدا ہوئے۔ ایسی صنعتوں میں کتنے لوگ برسر روزگار تھے یا کتنے لوگ اس سلسلے میں دوسری خدمات انجام دیتے تھے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ لیکن یہ تعداد خاصی بڑی ہوگی چونکہ زیادہ تر امراء اپنی دولت کو جمع کر کے نہیں رکھتے تھے۔ نہ یہ امراء اپنے پیسے کو کسی پیداواری عمل میں سرمایے کے طور پر لگاتے تھے۔ جو کچھ بھی سرمایہ کاری تھی وہ محمد تغلق اور اس سے بھی زیادہ فیروز تغلق کے عہد میں باغات لگانے کی تھی۔ کمتر درجے کے سرکاری کارکنوں، عدالتی کارکنوں، مذہبی کارکنوں اور حکیموں، شاعروں، موسیقاروں اور دوسرے پیشہ وروں کے معیارِ زندگی کے بارے میں بھی واقفیت زیادہ موجود نہیں ہے۔ کچھ بہت مشہور حکیم بہت متمول اور رئیس ہوتے تھے۔ شعرا کا انحصار اس پر تھا کہ انھیں کیسا مربّی یا سرپرست نصیب ہوا ہے۔ چنانچہ امیر خسرو کے والد کو، جس وقت وہ امیر تھے، بلبن کے دربار میں 1,200 ٹنکے سالانہ کا وظیفہ ملتا تھا۔ بلبن کے عارض نے شاہی موسیقاروں کو ایک بار اپنے گھر پر گانے کے لیے 10,000 ٹنکے، 100 گھوڑے اور 320 لباس دیے تھے۔ عام طور پر یہ طبقے نسبتاً آرام کی زندگی گزارتے تھے مگر فضول خرچی یا اسراف کی زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔

جہاں تک شہر کی عام آبادی کا سوال ہے اُن کے معیارِ زندگی کا انحصار عام طور پر قیمتوں اور اُن کی تنخواہوں پر ہی تھا۔ علاء الدین خلجی سے پہلے قیمتوں کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ بازاروں پر گرفت کے ذریعے علاء الدین نے کھانے کے سستے سامان کی فراہمی کو یقینی بنادیا۔ چنانچہ برنی بتلاتا ہے کہ گیہوں ساڑھے سات جیتل فی من، جو 4 جیتل فی من، اور اچھے قسم کا چاول 5 جیتل فی من

کے حساب سے بکتا تھا۔ بہر حال اگر ضروریات زندگی کی قیمتیں کم تھیں تو تنخواہیں بھی کم تھیں۔ علاء الدین کے عہد میں کاریگر کی تنخواہ 2 یا 3 جیتل یومیہ تھی جس کا مطلب ہے صرف ڈیڑھ یا 2 ٹنکے[1] مہینہ۔ برنی لکھتا ہے کہ 6 جیتل کی روٹی اور دَم پخت گوشت، یعنی صرف زندگی گزارنے برابر غذا، سات آٹھ لوگوں کے لیے کافی ہوتی تھی۔ ذاتی ملازموں کی تنخواہ 10 سے 12 ٹنکے سالانہ ہوتی تھی۔ ایک گھوڑسوار سپاہی کی تنخواہ جو علاء الدین نے 234 ٹنکے سالانہ یا لگ بھگ 20 ٹنکے مہینہ مقرر کی تھی، اتنی تھی کہ اس میں ایک سپاہی اور اس کا گھوڑا ڈھنگ سے زندگی گزار سکتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ علاء الدین کی موت کے بعد، قیمتوں پر کنٹرول کا نظام بگڑ کر ختم ہو گیا اور قیمتیں بہت تیزی سے بڑھیں اور ان کے ساتھ ساتھ تنخواہیں چار گنا بڑھ گئیں۔ بہر حال ان اعداد کا بالکل صحیح صحیح حساب نہیں لگایا جاسکتا۔ ابنِ بطوطہ کی دی ہوئی قیمتوں کا تجزیہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قیمتیں ڈیڑھ گنی سے زیادہ بڑھیں۔ تنخواہیں بھی اسی تناسب سے بڑھی ہوں گی۔ فیروز کے عہد کے شروع میں قیمتیں اور تنخواہیں اور زیادہ تھیں۔ عفیف کے بیان کے مطابق، سلطان کی کسی قسم کی کوشش کے بغیر قیمتیں خود بخود علاء الدین دور کی حد تک نیچے آگئیں۔ بہر حال تنخواہیں پھر بھی اونچی رہیں۔ خوردنی اشیاء کی قیمتوں میں اُتار چڑھاؤ بہتر فصل کی وجہ سے تھا یا زراعت میں توسیع کی وجہ سے، یا بین الاقوامی سطح پر چاندی کی قلت کی وجہ سے۔ یہ مسئلہ اب بھی مورخوں کے درمیان زیرِ بحث ہے۔

(V) شہر اور شہری زندگی: کاریگر اور غلام

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ دسویں صدی سے شمالی ہندوستان میں شہروں میں نو آبادکاری شروع ہو گئی تھی۔ ترکی مرکزیت کے تحت اس رجحان میں تیرھویں صدی سے اور تیزی آئی اور اس کے ساتھ ہی شہری بنیاد رکھنے والا ایک حکمراں طبقہ بھی اُبھرا جس کا معیارِ زندگی اونچا تھا۔ دہلی کے علاوہ جسے ابنِ بطوطہ نے اسلامی دنیا کے مشرقی حصے کا سب سے بڑا شہر کہا ہے، ہمارے پاس ایسی روایتیں بھی ہیں کہ دولت آباد (یوگیری) بھی دہلی جتنا بڑا شہر تھا۔ اس دور میں جو دوسرے شہر ہندوستان میں مشہور تھے وہ ملتان، لاہور، کڑا (آج کے الہ آباد کے نزدیک) لکھنوتی اور کھمبایت تھے۔

---

(1) شمالی ہندوستان میں 48 جیتل کا ایک ٹنکہ ہوتا تھا۔ علاء الدین کے زمانے کا من آج کے 16 کلوگرام کے برابر ہوتا تھا۔

کسی شہر کی معاشی زندگی پر وہاں کے امراء، اُن کے ملازمین و متوسلین، تاجروں اور دکان داروں کا سب سے زیادہ اثر ہوتا تھا۔ شہر کی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ملازمین، غلاموں، سپاہیوں، کاریگروں اور کچھ دوسرے گروپوں جیسے پھیری والے، موسیقار، نٹ، خود اپنے کاروبار یا روزگار والے لوگ اور فقیروں وغیرہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ ان مختلف گروپوں کی ساخت کی معلومات لگ بھگ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یعنی ان کے طرزِ زندگی، سماجی پس منظر کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شہر ہی وہ جگہ تھے جہاں مختلف پس منظر اور نسلی اعتبار سے الگ الگ طرح کے لوگ، غلام، دستکار اور فنکار، وغیرہ ایک جگہ ساتھ ساتھ رہتے تھے اور سماجی لین دین کے مواقع حاصل کرتے تھے۔ شہر میں داخلہ کی مکمل دیکھ بھال کوتوال کرتا تھا جو صرف شہر میں امن و امان اور تحفظ کا ہی ذمے دار نہیں تھا بلکہ بازاروں پر پوری گرفت، بدنام قسم کے اڈوں (جوا خانے اور طوائفوں کے کوٹھے وغیرہ) پر کڑی نگاہ رکھنا بھی اسی کی ذمے داری ہوتی تھی۔ پچھلی روایت کے مطابق ہم پیشہ لوگ عام طور پر ایک ہی علاقہ (محلے) میں رہتے تھے جسے حفاظت کے خیال سے رات کو مقفل کردیا جاتا تھا۔ شہروں کا جغرافیائی روپ لگ بھگ ایک طے شدہ انداز پر ہوتا تھا جس میں ایک علیحدہ حصہ بادشاہ اور امراء کی رہائش کا ہوتا تھا دوسری طرف مہتر، چمڑے کا کام کرنے والوں اور فقیروں کی رہائش شہر کے باہری حصے میں رکھی جاتی تھی لیکن یہ ہوتی شہر کی فصیل کے اندر ہی تھی۔ دہلی میں فقیروں کی آبادی بھی بہت کافی تھی جو امراء اور رؤسا کے یہاں خیرات کے لیے چکر لگاتے رہتے تھے۔ ان کا دوسرا ٹھکانا مزارات اور صوفی سنتوں کی خانقاہیں، مٹھ اور تکیے وغیرہ ہوتے تھے۔ عام لوگوں کی طرح یہ بھی ہتھیار باندھتے تھے، اور کبھی کبھی امن و امان کے لیے بھی خطرہ کھڑا کردیتے تھے۔

شہر دستکاریوں اور حرفوں کا بھی مرکز ہوتے تھے۔ بُنائی، رنگائی، چھپائی، کڑھائی وغیرہ وغیرہ۔ شاہی کارخانوں میں بھی بڑی تعداد میں کاریگر ملازم ہوتے تھے جو سونے چاندی کے کارچوبی کام اور ریشمی کڑھائی کے کاموں میں لگے ہوتے تھے۔ لیکن زیادہ تر کاریگر اور دستکار اپنے گھر پر ہی کام کرتے تھے اور ذات کی بنیاد پر گلڈ کے نظام میں منظم ہوتے تھے۔ پھر بھی سارے مخصوص حرفے اور دستکاریاں شہروں میں محدود نہیں تھے۔ جنوبی ہندوستان اور گجرات میں بہت سے گاؤں

اور قصبوں میں کچھ خاص قسم کے سوتی کپڑے کی تیاری کا کام ہوتا تھا۔ اس طرح قرونِ وسطیٰ کے یوروپ کے برخلاف ہم حرفوں اور دستکاریوں کو ہندوستان میں شہروں اور دیہات کے درمیان کسی سخت قسم کی تقسیم میں مقید نہیں کر سکتے۔ شہروں اور دیہی علاقوں کے درمیان حرفے اور دستکاری کا یہ رشتہ کاریگروں کے دیہی علاقوں سے شہروں کی طرف حرکت یا آنے جانے کا سلسلہ بھی جاری رکھتا تھا۔

غلام:

شہری آبادی میں ایک بڑا حصہ غلاموں یا گھریلو ملازمین کا بھی ہوتا تھا۔ غلامی کا سلسلہ ہندوستان، مغربی ایشیا اور یوروپ میں طویل عرصے سے چلا آرہا تھا۔ مختلف قسم کے غلاموں-وہ غلام جو کسی کے اپنے گھر میں پیدا ہوا ہو، خریدا ہوا ہو، کسی اور طرح یا ورثے میں حاصل ہوا ہو، ان تمام مختلف حیثیتوں کو ہندو شاستروں میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ غلامی کو عربوں اور پھر ترکوں نے بھی اپنا لیا۔ غلام حاصل کرنے کا سب سے عام طریقہ جنگوں میں قید کرنے کا تھا۔ مہابھارت تک میں جنگی قیدی کو غلام بنالینا معمولی یا عام طریقہ مانا گیا ہے۔ ترک اپنی جنگوں میں ہندوستان اور اس سے باہر اس طریقے پر بڑے پیمانے پر عمل کرتے تھے۔ غلاموں کی خرید فروخت کے بازار مغربی ایشیا اور ہندوستان دونوں جگہ موجود تھے۔ ترک، قاف کے رہنے والے (کاکیشیائی)، یونانی اور ہندوستانی غلاموں کی قدر زیادہ تھی اور اسی لیے اُن کی مانگ بھی زیادہ تھی۔ کچھ کم تعداد میں غلام افریقہ، خاص طور پر حبش سے بھی درآمد کیے جاتے تھے۔ غلام زیادہ تر گھریلو کام، مصاحبی یا ساتھ رکھے جانے کے لیے یا اُن کی کسی خاص تربیت یا صلاحیت کی وجہ سے خریدے جاتے تھے۔ تربیت یافتہ غلام یا خوبصورت لڑکے اور خوبصورت لڑکیاں کبھی کبھی بہت زیادہ قیمت میں بکتے تھے۔ تربیت یافتہ غلاموں کی بہت قدر کی جاتی تھی اور بعض بعض موقعوں پر یہ ترقی کر کے بڑی بڑی اعلیٰ حیثیتوں تک پہنچ گئے، جیسے قطب الدین ایبک کے غلام۔

غلام پکڑنے کا کام مغربی ایشیا اور وسط ایشیا میں بڑے پیمانے پر ہوتا تھا۔ غلام پکڑ کر انھیں نو مسلم بنانا، وسط ایشیا میں خاص طور پر غازیوں کے سپرد ہوتا تھا۔ شروع کے ترک بادشاہوں، جیسے قطب الدین ایبک نے اس سلسلے کو ہندوستان میں بھی جاری رکھا۔ چنانچہ جب

1195 میں گجرات پر حملہ کیا تو اُس نے 20,000 لوگوں کو پکڑ کر غلام بنالیا اور اگلے 50,000 کو کالنجر کے حملے میں غلام بنایا گیا۔ لیکن ایسی وسیع پیانے کی کسی غلام سازی کی مہم کا ذکر بلبن اور علاء الدین خلجی کے حملوں میں نہیں ملتا۔ پھر بھی مالِ غنیمت میں غلام بھی ایک مال مانے جاتے تھے۔ زیادہ تر جنگ میں پکڑے ہوئے قیدیوں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ صرف کچھ چُنے ہوئے لوگوں کو غلام بنا کر لے آیا جاتا تھا۔ لیکن دیہی علاقوں میں چلائی گئی ٹھنڈا کرنے (Pacification) کی مہموں میں بڑی تعداد میں مرد، عورت اور بچے غلام بنائے گئے تھے اور انھیں دہلی کے غلام بازاروں میں بیچا گیا تھا۔ غلاموں کی خرید فروخت کچھ ایسا معمولی قسم کا عمل تھا کہ برنی نے کنیزوں اور خوبصورت لڑکوں کی قیمت کا مویشیوں کی قیمت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ بہر حال وسط ایشیا کے دستور کے برخلاف جہاں گرفتار شدہ ترکی غلام فوجی استعمال میں آتے تھے دہلی میں بیچنے جانے والے غلام عام طور پر گھریلو خدمات میں استعمال کیے جاتے تھے۔ یہ چیز اتنی عام تھی کہ کوئی کلرک اگر غلام رکھتا تھا تو یہ بات کوئی غیر معمولی یا حیرتناک نہیں مانی جاتی تھی۔ عام طور پر غلاموں کو دستکاری کی نہ تربیت دی جاتی تھی نہ انھیں اس کام میں استعمال کیا جاتا تھا لیکن کنیزوں کو سوت کاتنے کے کام میں ضرور لگایا جاتا تھا اور یہ ذکر بھی موجود ہے کہ صوفی سنت تک غلاموں کی کمائی پر زندگی گزارتے تھے۔

فیروز تغلق کے یہاں اس عمل سے کچھ انحراف ملتا ہے۔ اس نے اپنے بڑے امراء کو حکم دیا تھا کہ وہ صرف جنگ میں غلام بنائیں اور اُن میں سے جو بہترین ہوں انھیں سلطان کی خدمت کے لیے بھیجیں۔ ماتحت سرداروں کو بھی ان احکام کی پابندی ضروری تھی۔ اس طرح سے 1,80,000 غلام جمع کیے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ کو مذہبی مطالعے کے لیے چنا گیا تھا، ان میں سے 12,000 کو دستکاری کی تربیت دی گئی تھی اور مختلف پرگنوں میں پھیلا دیا گیا تھا۔ اس سے تربیت یافتہ کاریگروں اور دستکاروں کی زبردست کمی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ غلاموں سے ایک مسلم محافظ دستہ، بھی منظم کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ غلاموں کے دستے نے فیروز کے انتقال کے بعد بادشاہ گر بننے کی کوشش کی مگر انھیں شکست دے کر منتشر کر دیا گیا۔

حالانکہ گھریلو غلامی مغلوں کے دور میں بھی جاری رہی لیکن غلاموں نے صنعتی پیداوار یا فوج میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ غلامی کا طریقہ غیر انسانی

عمل تو تھا ہی اس سے آزادانہ مزدوری کی حیثیت میں بھی کمی آتی تھی اور تنخواہیں بھی گرتی تھیں۔

(vi) عورتیں، ذات پات، سماجی دستور اور رسم و رواج:

اس دور میں ہندو سماج کی ساخت میں مشکل سے ہی کوئی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ اُس دور کے سمرتی لکھنے والے بھی برہمنوں کو وہی اعلیٰ حیثیت دیتے تھے لیکن ساتھ ہی اس طبقے کے نااہل افراد کی اتنی ہی سختی سے مذمت بھی کرتے تھے۔ ایک طرزِ فکر کے مطابق برہمنوں کو صرف تباہی و بربادی یا غیر معمولی حالات میں ہی زراعتی کاموں میں شریک ہونے کی اجازت نہیں تھی بلکہ عام زمانے میں بھی اس کی اجازت تھی کیونکہ 'کالی یگ' میں ہون، پوجا وغیرہ کے کاموں سے انھیں زندگی گزارنے کے برابر پیسہ نہیں مل پاتا تھا۔

سمرتی لکھنے والے اب بھی اسی بات پر مصر تھے کہ بروں کو سزا دینا اور اچھوں کو جزا دینا چھتریوں کا ہی فرض ہے اور اسی طرح لوگوں کے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھانے کا کام بھی انھیں کا ہے۔ شودروں کے فرائض، پیشے اور ممنوعات بھی لگ بھگ پہلے ہی کی طرح دُہرائے گئے تھے۔ یوں تو شودروں کا سب سے پہلا فرض دوسری ذاتوں کی خدمت کرنا ہی تھا مگر انھیں تمام پیشے اختیار کرنے کی اجازت ہو گئی تھی۔ یہ لوگ صرف شراب اور گوشت کا کاروبار نہیں کر سکتے تھے۔ ویدوں کے مطالعے یا انھیں دہرانے کی ممانعت کو اب بھی دوہرایا گیا تھا مگر پرانوں کو سننے پر پابندی نہیں تھی۔ کچھ لکھنے والے اس حد تک آگے بڑھے ہوئے تھے کہ ان کے مطابق صرف شودر کے ہاتھ کے کھانے کا ہی پرہیز نہیں بلکہ ایک گھر میں اس کے ساتھ رہنا، ایک چارپائی پر بیٹھنا یہاں تک کہ کسی قابل شودر سے مذہبی تعلیم حاصل کرنے سے بھی بچنا ضروری ہے۔ بہر حال یہ ایک آخری حد کا تصور مانا جانا چاہیے لیکن ذات باہر کے لوگوں اور چنڈالوں سے میل جول رکھنے پر سب سے سخت پابندی تھی۔

ہندو معاشرے میں عورتوں کی حیثیت میں بھی بہت کم تبدیلی آئی تھی۔ لڑکیوں کی کم عمری میں شادی، اور شوہر کی خدمت اور اس کی پوری تابعداری بیوی کا سب سے اہم فریضہ مانا جانا اور ایسے تمام قواعد و ضوابط بدستور موجود تھے۔ شادی کی منسوخی (طلاق) کی اجازت بالکل آخری حد پر تھی جیسے چھوڑ کر چلا جانا، گھناؤنی بیماری وغیرہ۔ مگر تمام لکھنے والے اس سے متفق نہیں تھے۔

کالی یگ میں بیوہ کی شادی کا شمار بھی ممنوعات میں سے تھا بظاہر یہ اوپر کی تین ذاتوں پر عائد ہوتا تھا۔ جہاں تک ستی کا سوال ہے کچھ لکھنے والے اسے پورے شدومد سے منظور کرتے ہیں لیکن کچھ دوسرے صرف بعض حالات میں اس کی اجازت دیتے ہیں۔ سیاحوں کی خاصی بڑی تعداد نے ملک کے مختلف حصوں میں اس کی موجودگی کا ذکر بھی کیا ہے۔ ابنِ بطوطہ نے بڑے بھیانک سے انداز میں ڈھول کی کان پھاڑ دینے والی آواز کے ساتھ ایک عورت کے اپنے شوہر کی چتا پر جلنے کا منظر بیان کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق ستی کے لیے سلطان سے اجازت لینی پڑتی تھی۔

ملکیت میں مفسرین نے ایسے شوہر کی ملکیت میں بیوہ کے حق کو تسلیم کیا ہے جس کے کوئی اولادِ نرینہ نہ ہو، بشرطیکہ ملکیت مشترکہ نہ ہو، یعنی پہلے تقسیم ہو چکی ہو۔ بیوہ اس ملکیت کی صرف نگہبان یا متولی ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کو فروخت کر دینے کا حق بھی رکھتی تھی۔ اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ عورتوں کے ملکیت کے حقوق میں کچھ بہتری پیدا ہوئی تھی۔

اس دور میں عورتوں کو الگ رکھنے اور غیر لوگوں کے سامنے گھونگھٹ کر لینے کی مانگ، یعنی پردہ کا دستور اونچی ذات کے لوگوں میں عام ہوتا چلا گیا۔ عورتوں کو مردوں کی نگاہ بازیوں سے دور رکھنے کے لیے انھیں علیحدہ رکھنے کا دستور اونچی ذات کے ہندوؤں میں موجود تھا اور قدیم ایران اور یونان وغیرہ میں بھی یہ طریقہ رائج تھا۔ عربوں اور ترکوں نے بھی اسے اپنا لیا تھا اور وہ اسے اپنے ساتھ ہندوستان لائے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی یہ پورے ہندوستان، خصوصاً شمالی ہندوستان میں پھیل گیا۔ پردے کے رواج کو اس خوف سے بھی منسوب کیا گیا ہے کہ ہندو عورتوں کو حملہ آور نہ پکڑ لیں۔ جارحیت کے کسی دور میں عورتوں کو جنگ میں فتح کے انعام کے طور پر حاصل کر لینے کا تصور ہمیشہ موجود رہا ہے۔ پردے کے رواج کے پھیلنے میں شاید سب سے اہم حصہ سماجی ہی ہے۔ یہ سماج میں اونچی ذات کے اظہار کی ایک علامت بن گیا اور وہ تمام لوگ جو خود کو باعزت ظاہر کرنا چاہتے تھے وہ اسے اپنا لیتے تھے۔ اس کے لیے مذہبی جواز بھی تلاش کر لیے گئے۔ جو بھی وجہیں رہی ہوں اس رواج نے عورتوں پر خراب اثر ہی مرتب کیا اور اس سے مردوں پر اُن کا انحصار اور بڑھ گیا۔

سلطنت دور میں مسلم معاشرہ نسلی اور علاقائی اعتبار سے بھی بٹا ہوا رہا۔ ہم اس میں کافی گہری معاشی نابرابری بھی دیکھ چکے ہیں۔ ترک، ایرانی، افغانی اور ہندوستانی مسلمان مشکل سے ہی

چڑھائی کی لیکن کالنجر کے قریب چندیل حکمراں سے لڑائی کرنے سے احتراز کیا کیوں کہ اس نے برائے نام خراج دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔

اپنے معرکوں کی وجہ سے محمود غزنوی کی حکومت پنجاب سے آگے تو نہ بڑھ سکی لیکن گنگا کے دو آب کے بالائی علاقے کو ایک قسم کا غیر جانب دار علاقہ بنانے میں وہ کامیاب ہوا جہاں کوئی بھی طاقتور بادشاہ اپنا اقتدار قائم کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ان حملوں نے چندیل حکمرانوں کو اس علاقہ میں اپنا اثر بڑھانے سے روک دیا اور شاہیوں کی ان کوششوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جو وہ اپنے کھوئے ہوئے علاقے کو حاصل کرنے کے لیے کرتے رہتے تھے۔

راجستھان سے سومناتھ تک، 1025 میں محمود کے آخری حملے کی کہانی اتنی مشہور ہے کہ اس کو یہاں تفصیل سے بیان کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس مہم نے ایک بار پھر ترکوں کی اس صلاحیت کا مظاہرہ کیا کہ وہ اجنبی اور مخالف علاقوں میں بھی تیزی سے حرکت کر سکتے تھے۔ انھوں نے اس ہمت، جوش اور مہم جوئی کا مظاہرہ کیا جو اس وقت کے ترکی خانہ قبیلوں میں بھی کم ہی پائی جاتی تھی۔ اس میں مال و زر حاصل کرنے کی خواہش شامل تھی اور غازی بننے کا وہ جذبہ بھی کارفرما تھا جس کی بدولت وہ اسلام دشمنی کے خلاف ہر جنگ کے لیے تیار تھے۔

محمود غزنوی کی جنگی صلاحیتوں میں مشکل سے ہی کوئی اختلاف رائے رکھتا ہوگا۔ وہ ایک جری سپاہی تھا اور مغربی اور وسطی ایشیا میں سب سے بڑی حکومت بنائی تھی۔ ہندوستان سے حاصل کی ہوئی دولت سے اس نے اپنے دارالسلطنت غزنی کو شاندار عمارتوں سے سجایا، عالموں اور فردوسی جیسے شاعروں کی سرپرستی کی اور سامانی بادشاہوں کے دور میں شروع ہوئے، ایرانی نشاۃ ثانیہ کو آگے بڑھایا لیکن اس نے کوئی ادارہ ایسا نہیں بنایا جو اس کے بعد تک قائم رہتا۔ اس کے علاوہ غزنی سے باہر اس کی حکومت جابرانہ تھی اسی لیے غزنوی تاریخ داں عطبی نے خراسان کے حوالے سے جو کہ ایران کا مشرقی حصہ اور ایرانی نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ ہے، لکھا کہ۔۔۔ "وہاں کے معاملات کی خصوصیت یہ تھی کہ وہاں سوائے ٹیکس کے اور کچھ نہ تھا۔ ان ٹیکسوں نے عام لوگوں کو اتنا نچوڑ کر رکھ دیا تھا کہ اب ان کے پاس کچھ باقی نہ بچا۔ بغیر کسی اصلاحی یا تعمیری کام کے ٹیکس لگانے کے نئے نئے طریقے نکالے گئے۔" اس لیے "چند سالوں بعد ہی خراسان میں اور لینے کے لیے کچھ نہیں بچا۔" چونکہ اس

ایک دوسرے کے یہاں شادی کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان طبقوں میں بھی ہندوؤں جیسی کچھ ذات پات جیسی علیحدگی پیدا ہو گئی تھی۔ نچلی ذاتوں سے آنے والے نومسلموں سے بھی فرق یا تعصب برتا جاتا تھا۔

ہندو اور مسلم اعلیٰ طبقے کے لوگ بھی ایک دوسرے سے زیادہ تعلقات نہیں رکھتے تھے اس کی کچھ وجہ تو موخرالذکر (مسلمانوں) میں ایک احساسِ برتری کی موجودگی تھی اور کسی حد تک آپسی شادیوں اور ساتھ مل کر کھانے پینے پر مذہبی پابندیاں تھیں۔ اعلیٰ ذات کے لوگ مسلمانوں کے سلسلے میں بھی وہی پابندیاں عائد کرتے تھے جو شودروں سے متعلق تھیں۔ مگر یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ذات پات کی پابندیوں نے مسلمانوں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور شودروں کے درمیان سماجی قسم کے لین دین کو بالکل ہی بند نہیں کیا تھا۔ اکثر اوقات مسلمان فوجوں میں ہندو سپاہی بھرتی کیے جاتے تھے۔ زیادہ تر امراء اپنے ذاتی امور کے منتظموں کی حیثیت سے ہندو افراد کا تقرر کرتے تھے۔ علاقائی انتظامیہ کا پورا آلۂ کار لگ بھگ پورا کا پورا ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہی رہا۔ اس طرح ان حلقوں میں آپسی تعلق یا لین دین کے بہت سے مواقع موجود تھے۔ یہ تصور کہ یہ دونوں مذہبی فرقے بالکل اپنے اندر محدود اور بند تھے اور ایک دوسرے کے معاملات سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتے تھے نہ حقیقت پر مبنی ہے نہ یہ قابلِ عمل ہے۔ اور پھر اس وقت جو مواد موجود ہے اس سے اس قسم کے تصور کی تصدیق بھی نہیں ہوتی ہے۔ مفادات کے ٹکراؤ، سماجی اور ثقافتی تصورات کے اختلاف اور رسم ورواج اور عقائد کے فرق سے تناؤ ضرور پیدا ہوتے تھے جس کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنے اور ثقافتی اشتراک کی رفتار سست ہو جاتی تھی۔

■■■

-10-

وجے نگر اور بہمنی عہدِ حکومت میں جنوبی ہندوستان میں سیاست، حکومت، معاشرہ اور معاشی حالات

(1350 تا 1565)

دہلی سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی وجے نگر اور بہمنی سلطنتوں کا عروج شروع ہوا جن کا اقتدار وندھیاچل کے جنوب میں ہندوستان پر لگ بھگ 200 سال سے زیادہ رہا۔ گو کہ یہ سلطنتیں متواتر ایک دوسرے سے لڑتی رہیں مگر ان کی اپنی اپنی حدودِ سلطنت میں امن وامان اور قانون برقرار رہا۔ یہ حکومتیں مستحکم تھیں، جس کے نتیجے میں یہاں تجارت اور بیوپار پوری طرح پھلے پھولے۔ بہت سے حکمرانوں نے زراعت کی طرف توجہ دی اور دارالحکومت اور دوسرے بڑے شہر آباد کرائے اور ان میں شاندار عمارتیں بنوائیں۔ کئی حکمراں فن اور کلچر کے بھی بڑے سرپرست گزرے۔

اس طرح چودھویں صدی کے درمیانی عرصے سے شمالی ہندوستان کے برخلاف جنوب میں دو وسیع سلطنتیں ابھریں اور اتنے عرصے برسرِ اقتدار رہیں۔ پندرھویں صدی کے آخر میں بہمنی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے اور کچھ عرصے بعد 1565 میں تالی کوٹا کی جنگ میں وجے نگر سلطنت کی شکست کے بعد اس کے انتشار سے ایک نئی صورتِ حال پیدا ہوئی۔ یہی وہ وقت بھی تھا جب ہندوستان کی سرحدوں میں ایک یوروپی طاقت، پرتگالی، ایشیا کے منظر نامے میں داخل ہوئے اور انھوں نے اپنی بہتر اور ترقی یافتہ بحری طاقت کے بل پر سمندر پر اور اس کے آس پاس کے سرحدی علاقوں پر اپنا تسلط جما کر بحری تجارت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔

(ا) وجے نگر سلطنت۔ کیفیت اور بہمنی سلطنت سے ٹکراؤ:

مورخوں میں وجے نگر سلطنت کی ابتدا کے بارے میں اتفاق نہیں ہے۔ اس سلطنت کے قیام میں ہری ہر اور اس کے بھائی بکا نے جو اہم کردار ادا کیا اُسے تو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے

لیکن اس خاندان کی اس سے پہلے کی تاریخ واضح نہیں ہے۔عام روایات کے مطابق یہ دو بھائی پانچ بھائیوں کے ایک خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور وارنگل کے کاکتیاؤں کے جاگیردار رہ چکے تھے۔اس کے بعد انھوں نے آج کے کرناٹکا میں کامپلی کے حکمرانوں کے یہاں خدمات انجام دیں جہاں یہ آہستہ آہستہ وزیروں کے عہدوں تک ترقی کر گئے۔پھر جب ایک مسلم باغی کو پناہ دینے کے سلسلے میں محمد بن تغلق نے کامپلی پر حملہ کر کے اُسے فتح کیا تو یہ دونوں بھائی گرفتار ہوئے اور قیدیوں کی طرح دہلی بھیج دیے گئے۔یہاں یہ مسلمان ہو گئے۔کچھ دن بعد کامپلی میں ترک حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی اور اسے فرو کرنے کے لیے ان دونوں بھائیوں کو ہی کامپلی بھیجا گیا۔یہاں پہنچ کر انھوں نے اسلام چھوڑ کر پھر اپنا پرانا مذہب اختیار کیا اور خود بھی بغاوت میں شامل ہو گئے۔ بہر طور، موجودہ دور کے بہت سے مورخ اس روایتی بیان کو تسلیم نہیں کرتے۔اُن کے مطابق، ان کی وارنگل میں خدمات انجام دینے کی بھی بہت کم شہادت موجود ہے اور نہ اس کے بعد قید ہونے اور مذہب کی تبدیلی کی۔ان کے مطابق ہری ہر اور بکا کرناٹکا کے اُن 75 نائکوں میں سے تھے جنھوں نے ترک قبضے کے خلاف بغاوت کی تھی اور یہ شیو بھکتوں کے ایک مضبوط اور طاقتور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔یہ مورخ اس بات کو بھی نہیں مانتے کہ اس خاندان کا آندھرا سے کوئی پہلے تعلق موجود تھا۔ بہر حال اس سلسلے کے اختلاف سے قطع نظر، ہمارے لیے جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ وجے نگر کے حکمرانوں نے اپنے انتظامیہ ڈھانچے کی تشکیل میں صرف تامل کے چولا حکمرانوں کی روایات کو ہی نہیں اپنایا بلکہ تیلگو اور کنڈا کے کاکتیا اور ہوئے سالا حکمرانوں کی روایات اور طریقہ کار کو بھی اپنایا۔اس طرح یہ صرف صوبائی حکمراں یا سربراہ نہیں تھے بلکہ ان کی حیثیت پورے جنوبی ہندوستان کے ایک نمائندے کی تھی۔

جنوبی ہندوستان میں تغلق حکومت کے خاتمے سے بڑی پیچیدہ سی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔میسور کے ہوئے سالا جیسے کچھ باقی ماندہ حکمراں کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہے اور کچھ نئی چھوٹی چھوٹی فرمانروائیاں اُبھر آئیں۔ان میں سب سے اہم مدورائی کے سلطان، وارنگل کے والیما حکمراں اور تلنگانا کے ریڈی تھے۔کچھ عرصے بعد وجے نگر کے شمال کی طرف بہمنی سلطنت قائم ہوئی۔یہ فرمانروا متواتر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے یا جب جب ضرورت محسوس

ہوتی تھی کسی کے ساتھ صلح کر کے مل جاتے تھے۔ چنانچہ مدورائی کے سلطان کے خلاف جنگ میں ہوئے سالا کے حکمراں بلاّل سوم کو شکست ہوئی اور 1342 میں اسے قتل کر دیا گیا۔ ان حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہری ہر اور اس کے بھائیوں نے اپنے علاقے کی توسیع کی مہم شروع کر دی اور جلدی ہی ہوئے سالا کی پوری سلطنت ان کے قبضے میں آگئی۔ اس کے بعد مدورائی کی سلطنت سے ان کی طویل کشمکش کا سلسلہ شروع ہو گیا اور آخر 1377 تک مدورائی کی سلطنت بھی بالکل ختم ہو گئی۔ وجے نگر کی حکومت اب جنوب میں رامیشورم تک پہنچ گئی جس میں کیرالہ کے کچھ وہ حصے شامل تھے جو پہلے مدورائی سلطنت کے حصے تھے۔ اس سے پہلے ہری ہر تنگ بھدرا کے کنارے اپنا نیا دارالسلطنت وجے نگر قائم کر چکا تھا۔ لیکن دوسری روایت یہ ہے کہ یہ شہر اس کے بھائی بکا نے قائم کیا تھا جو 1365 میں اپنے بھائی کا جانشین ہوا تھا۔ بکا نے 1377 تک حکومت کی۔

وجے نگر کو شمال میں ابھرتی ہوئی بہمنی سلطنت کا سامنا کرنا تھا جس کے بادشاہوں کو کبھی کبھی وارنگل کے والیما حکمرانوں کی اور تلنگانہ کے رایا حکمرانوں کی حمایت بھی حاصل ہو جاتی تھی جو وجے نگر کی ابھرتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ رہتے تھے اور بہمنی سلطنت کو ایک توازان برقرار رکھنے والی طاقت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

بہمنی سلطنت کو ایک افغان امیر علاء الدین حسن نے 1347 میں قائم کیا تھا جس کا خاندان علاء الدین خلجی کی خدمات انجام دینے میں اُبھرا تھا۔ فرشتہ کی سترھویں صدی میں بیان کی ہوئی روایت کے مطابق حسن ایک برہمن گنگو کی خدمات انجام دیتے ہوئے منظر عام پر آیا اور اسی لیے وہ حسن گنگو کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بہر حال اس کا یہ بیان کہاں تک صحیح ہے اس کا علم نہیں ہے۔ تخت نشینی کے بعد علاء الدین نے اپنے خاندان کو باحیثیت اور باوقار بنانے کی غرض سے اس کی جڑیں ایرانی ہیرو اسفندیار اور بہمن سے جوڑنے کی کوشش کی اور اپنے نام کے آگے "بہمن شاہ" کا لقب اختیار کر لیا۔ اسی لقب کی وجہ سے یہ سلطنت بہمنی کہلائی جانے لگی۔

بہمنی سلطانوں اور وجے نگر کے حکمرانوں کے مفادات تین بالکل مختلف اور واضح علاقوں میں ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ تنگ بھدرا دوآب میں کرشنا، گوداوری ڈیلٹا میں اور مراٹھواڑا میدانی علاقے میں۔ تنگ بھدرا دوآب کرشنا اور تنگ بھدرا دریاؤں کے درمیان واقع

علاقے میں ہے۔ اپنی دولت اور معاشی ذرائع کی وجہ سے یہ پہلے بھی مغربی علاقے کے چالوکیا حکمرانوں اور چولا خاندان کے حکمرانوں کے درمیان جھگڑے کی جڑ رہا تھا، اس کے بعد یہ یادو حکمرانوں اور ہوئے سالا حکمرانوں کے درمیان بنائے مخاصمت رہا۔ کرشنا گوداوری کے تھالے پر قبضہ قائم رکھنے کی جدوجہد جو بہت زرخیز علاقہ تھا اور اس میں کئی بندرگاہوں کی موجودگی کی وجہ سے اس پورے وسیع علاقے کی غیر ملکی تجارت پر بھی یہیں سے گرفت رکھی جاتی تھی، کبھی کبھی تنگ بھدرا دو آب علاقے کے لیے جدوجہد سے مجڑ جاتی تھی۔ اسی وجہ سے اس علاقے کے حکمراں اپنی حفاظت کی غرض سے کبھی بہمنی سلطانوں سے مل جاتے تھے اور کبھی وجے نگر کے حکمرانوں سے جہاں تک مراٹھا علاقے پر قبضے کا سوال تھا یہ جھگڑا کونکن علاقے اور ان علاقوں سے تعلق رکھتا تھا جو کونکن تک پہنچنے کا راستہ تھے۔ کونکن سمندر اور مغربی گھاٹ کے درمیان ایک پتلی سی پٹی کا علاقہ ہے۔ اس کی سب سے اہم بندرگاہ گوا، جنوبی ہندوستان کی حکومتوں کے لیے بے حد اہمیت کی حامل تھی۔

بہمنی اور وجے نگر کی سلطنتوں کے درمیان فوجی جھڑپیں ان دونوں سلطنتوں کے قیام کے دوران لگ بھگ پورے عرصے جاری رہیں۔ ان کے اثرات متعدد رخوں میں نظر آتے تھے۔ ان سے دونوں سلطنتوں کے فوجی روپ کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ان جنگوں کو مذہبی رنگ بھی دے دیا جاتا تھا۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ مختلف سلطنتوں کا گٹھ جوڑ مذہبی سے زیادہ سیکولر انداز پر ہی ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ خود کو ہندو مفادات کا محافظ کہتے تھے مگر وجے نگر حکمرانوں نے مسلمان گھوڑ سواروں کا ایک دستہ رکھنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں کہ اس سے پہلے ان کی جنگ ہوئے سالا ہندو حکمرانوں سے رہی تھی۔ بعد میں اڑیسہ کے گج پتی حکمرانوں نے وجے نگر پر حملہ کر کے اس کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا، جس کے نتیجے میں بہمنی۔ وجے نگر کا آپسی معاہدہ اور ساتھ ہو گیا اور دونوں نے مل کر گجپتی حکمرانوں کا مقابلہ کیا۔ بہت عرصے تک وارنگل کے حکمراں بھی وجے نگر سے مقابلے کے لیے بہمنی حکمراں کے ساتھ ملے رہے۔

مگر اس کشمکش کا مذہبی پہلو بھی پوری طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی وجہ سے وجے نگر اور بہمنی حکمرانوں کے درمیان جنگوں میں تلخی کچھ اور بڑھ جاتی تھی، جس کے نتیجے میں جنگ کے علاقوں میں تباہی و بربادی بھی زیادہ ہوتی تھی اور ان خاص علاقوں اور اس کے گردو

نواح میں جان و مال کا خاصا شدید نقصان بھی ہوتا تھا۔ دونوں اپنے دشمن کے علاقوں کو لوٹتے تھے اور شہر اور گاؤوں کو پھونک دیتے تھے۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر انھیں غلام بنا کر بیچ دیتے تھے اور مذہب کے نام پر کتنے ہی بربریت کے مظاہرے کرتے تھے۔

تنگ بھدرا دوآب کے لیے سب سے پہلی جنگ 1356 میں ہوئی جب بہمنی فوجوں نے رائے چور پر حملہ کر کے اسے اپنے قبضے میں کر لیا، مگر اگلے سال ہی ہری ہر نے اسے چھین کر پھر اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔ ان دونوں کے درمیان یہ جھڑپیں متواتر ایک سائیکل کے سے انداز میں جاری رہیں۔ اس طرح 1367 میں بکّا نے وارنگل کے حکمراں سے مل کر ان علاقوں کو واپس لینے کا منصوبہ بنایا جو پہلے بہمنی سلطنت نے اپنے قبضے میں کر لیے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے جب بکّا (اوّل) نے تنگ بھدرا دوآب کے نزاعی علاقے کے چھوٹے سے قلعے پر حملہ کیا تو وہاں کے پورے محافظی دستے کو قتل کر دیا، صرف ایک آدمی بچا۔ جب اس واقعے کی اطلاع بہمنی سلطان کو ملی تو وہ بھڑک اٹھا اور یہ عہد کر کے اس طرح بڑھا کہ جب تک ایک لاکھ ہندو نہ قتل کر دے گا اپنی تلوار کو میان میں نہ رکھے گا۔ برسات کے موسم اور وجے نگر کی فوجوں کی مزاحمت کے باوجود اس نے تنگ بھدرا دریا کو پار کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی بہمنی سلطان بذاتِ خود وجے نگر کی سرحد میں داخل ہوا تھا۔ اس جنگ کے نتیجے کے متعلق کئی طرح کے بیان ملتے ہیں۔ فارسی مآخذوں کے مطابق وجے نگر کے حکمراں کو شکست ہوئی اور اسے جنگلوں میں روپوش ہونا پڑا۔ ان جنگوں میں دونوں فریقوں کی طرف سے توپوں کے استعمال کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔ بہر طور پر بہمنی سلطان فیصلہ کن فتح حاصل نہ کر پایا اور یہ جنگ مہینوں تک کھنچتی رہی جس کے دوران بڑے پیمانے پر مرد، عورت بچے قتل ہوئے۔ آخر میں کسی نہ کسی طرح ایک ڈھیلا سا معاہدہ کیا گیا، جس کی رو سے پچھلی صورتِ حال کو بحال کیا گیا اور نتیجے میں دوآب کے دونوں فریق حصے دار قرار دیے گئے۔ ایک غیر واضح وعدہ یہ بھی کیا گیا کہ آئندہ جنگوں میں کوئی غیر مسلح اور بے یار و مددگار قسم کے لوگوں کو قتل نہیں کرے گا۔ بہر حال، آنے والی جنگوں میں اس معاہدہ کا مشکل سے ہی کوئی اثر نظر آیا۔

جنوب میں مدورائی کے سلطان کے خاتمے میں وجے نگر کے حکمراں ہری ہر (دوم) (1377 تا 1404) کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ اُس نے شمالی مشرق اور مغرب میں آگے بڑھنے کی

پالیسی بنائی۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں شمالی مشرقی حصے میں بہت سی چھوٹی ہندو فرمانروائیاں تھیں۔ ان کے شمال میں اڑیسہ کا حکمراں اور دوسری طرف بہمنی سلطان، اس علاقے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ حالانکہ وارنگل کے حکمراں نے دہلی کے خلاف جدوجہد میں حسن گنگو کی مدد کی تھی لیکن اس کے جانشینوں نے وارنگل پر حملہ کر کے کولاس کا مضبوط قلعہ اور گولکنڈہ کا پہاڑی قلعہ اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ اس وقت وجے نگر جنوب میں اتنا پھنسا ہوا تھا کہ اس کی طرف سے کوئی مداخلت نہ ہوئی۔ بہمنی سلطان نے گولکنڈہ کو اپنی سلطنت کی حد مقرر کر دیا اور یہ وعدہ بھی کیا کہ نہ وہ خود، نہ اس کے جانشین، وارنگل کے اور کسی علاقے میں مداخلت کریں گے۔ اس معاہدے پر اعتماد کی مہر لگانے کے لیے وارنگل کے حکمراں نے بہمنی سلطان کو قیمتی ہیرے جواہرات سے مرصع ایک تخت بھی نذر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تخت اصل میں محمد بن تغلق کو پیش کرنے کے لیے تیار کرایا گیا تھا۔ بہمنی سلطنت اور وارنگل کا یہ معاہدہ اور میل جول پچاس برس سے زیادہ برقرار رہا۔ تنگ بھدرا دوآب پر وجے نگر کی طرف سے حملہ نہ ہونے اور بہمنی سلطنت کی اس علاقے میں بڑھتی ہوئی طاقت اور جارحیت کو نہ روک سکنے کا ایک اہم سبب یہ معاہدہ ہی تھا۔

عہدِ وسطیٰ کے مورخوں نے بہمنی اور وجے نگر کے حکمرانوں کی جنگوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بہر حال یہ ہمارے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ دونوں فریقوں کی پوزیشن کم و بیش ایک سی ہی رہی۔ جنگوں میں کبھی ایک کا پلڑا بھاری ہو جاتا تھا کبھی دوسرے کا۔ ہری ہر دوم نے بہمنی اور وارنگل کی ملی جلی طاقت کا بھی مقابلہ کیا اور اپنی پوزیشن برقرار رکھی۔ اس کی سب سے اہم فتح یہ تھی کہ اس نے مغرب میں بہمنی سلطنت سے بیلگام اور گوا چھین لیا۔ اس نے سری لنکا کے شمالی حصے کی طرف بھی ایک مہم روانہ کی۔

کچھ عرصے کی سیاسی کشمکش کے بعد ہری ہر دوم کے بعد دیوارایا (22-1404) تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں بھی شروع میں تنگ بھدرا دوآب کے لیے ایک اور جنگ ہوئی۔ اس میں بہمنی سلطان فیروز شاہ کے ہاتھوں اسے شکست ہوئی اور اسے دس لاکھ ٹن، موتی اور ہاتھی تاوان کے طور پر ادا کرنے پڑے۔ اُسے سلطان سے اپنی لڑکی کی شادی بھی کرنی پڑی اور جس کے جہیز میں دوآب میں بانکاپور کا علاقہ دیا گیا تاکہ آئندہ اس سلسلے میں کوئی قضیہ یا تناؤ پیدا نہ ہو۔ یہ شادی بڑی

دھوم دھام اور شان و شوکت کے مظاہرے کے ساتھ ہوئی۔ جب فیروز شاہ بہمنی بارات لے کر وجے نگر کے پاس پہنچا تو دیوارایا خود پوری شان و شوکت سے شہر کے باہر آکر اس سے ملا۔ شہر کے دروازے سے محل تک، دس کلو میٹر کے پورے راستے پر طلائی، مخمل اور ساٹن کے کپڑے اور دوسری قیمتی چیزیں بچھائی گئیں۔ دونوں بادشاہ شہر کے مرکزی حصے سے اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ساتھ ساتھ چلے۔ دیوارایا کے رشتے دار سواروں کے دستے کے ساتھ پیدل دونوں بادشاہوں سے آگے آگے چلے اور شادی کی تقریبات تین دن چلیں۔

حقیقت میں جنوبی ہند میں یہ پہلی سیاسی شادی نہیں تھی۔ اس سے پہلے گونڈوانا کے کھیرلا علاقے کا فرمانروا امن و امان حاصل کرنے کی غرض سے فیروز شاہ بہمنی سے ہی اپنی لڑکی کی شادی کر چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہزادی فیروز شاہ کی سب سے منظور نظر ملکہ تھی۔ بہر حال یہ شادیاں بھی امن و امان کو برقرار نہ رکھ سکیں۔ کرشنا گوداوری تھالے کے مسئلے نے وجے نگر، بہمنی سلطنت اور اڑیسہ کے درمیان دوبارہ اختلافات کھڑے کر دیے۔ ریڈی سلطنت میں اختلال پیدا ہونے کے بعد دیوارایا اور وارنگل کے حکمراں نے اس سلطنت کو آپس میں بانٹ لینے کا معاہدہ کر لیا۔ بہمنی طاقت سے وارنگل کی علیحدگی نے دکن میں اقتدار کے توازن میں پھر تبدیلی پیدا کر دی۔ نتیجے میں دیوارایا کو ایک موقع مل گیا اور اس نے فیروز شاہ بہمنی کو تباہ کن شکست دے کر اپنی مرکزی حکومت کو دریائے کرشنا کے دہانے تک بڑھا لیا۔

بہر حال، دیوارایا نے امن و امان کے دور کے کاموں کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس نے تنگ بھدرا پر ایک باندھ تعمیر کیا جس کی مدد سے اس نے ایک نہر شہر تک پہنچائی اور یہاں کی پانی کی قلت کے مسئلے کو حل کیا۔ اس سے آس پاس کے علاقوں کی آبپاشی بھی ہوتی تھی، چونکہ پتہ چلتا ہے کہ اس نہر سے اس کے محصول میں 3,50,000 پرداؤ کا اضافہ ہوا۔ اس نے دریائے ہری درا پر آبپاشی کے لیے ایک بند تعمیر کیا۔

کچھ دن کی سیاسی کشمکش کے بعد دیوارایا (دوم) (46-1425) تخت نشین ہوا جو اس خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ مانا جاتا ہے۔ اپنی فوج کو مضبوط بنانے کے لیے اس نے اس میں زیادہ تعداد میں مسلمانوں کو داخل کیا۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق دیوارایا (دوم) نے محسوس کیا کہ بہمنی

فوج کی بالادستی ان کے زیادہ مضبوط اور توانا گھوڑوں اور بہت بڑی تعداد میں بہت اچھے تیر اندازوں کی وجہ سے ہے۔اس لیے اس نے 2000 مسلمانوں کی فہرست تیار کی، ان کو جاگیریں دیں اور اپنے تمام ہندو سپاہیوں اور افسروں کو ہدایت کی کہ وہ ان سے تیر اندازی کا فن سیکھیں۔ وجے نگر کی سلطنت نے مسلمانوں کی بھرتی کوئی نئی نہیں تھی، کیونکہ دیوارایا (اول) کے لیے بیان کیا جاتا ہے کہ فرشتہ کا بیان ہے کہ دیوارایا (دوم) نے 60,000 ہندو ماہر تیر انداز، 80,000 گھوڑ سوار اور 2,00,000 کی پیدل فوج جمع کی تھی۔ یہ شمار مبالغہ آمیز ہو سکتا ہے۔ بہر حال ایک بڑی سوار فوج رکھنے سے حکومت کے مالی ذرائع پر کافی بوجھ پڑنا یقینی ہے کیونکہ اچھے گھوڑے صرف درآمد کے ذریعے حاصل ہوتے تھے اور عرب، جن کی اس تجارت پر گرفت تھی، ان سے گھوڑوں کی زیادہ قیمت لیتے تھے۔

اپنی نئی فوج کے ساتھ دیوارایا دوم نے 1443 میں تنگ بھدرا دریا پار کیا اور مدکل اور بانکاپور وغیرہ کے ان علاقوں کو پھر حاصل کرنے کی کوشش کی جو کرشنا دریا کے جنوب میں تھے اور گزشتہ زمانے میں بہمنیوں کے قبضے میں پہنچ گئے تھے۔ تین سخت جنگوں کے بعد فریقین پھر پچھلی ہی حالت پر برقرار رکھنے کے لیے ہی تیار ہوئے۔

سولھویں صدی کے ایک پرتگالی مورخ کا بیان ہے کہ کوئلون، سری لنکا، پولی کاٹ، پیگو، تیناسیرم (برما) اور ملایا کے فرمانروا دیوارایا (دوم) کو خراج دیتے تھے۔ بہر طور اس میں شبہ ہے کہ وجے نگر کے حکمراں سمندر میں بھی اتنے طاقتور تھے کہ پیگو اور تناسیرم علاقوں سے پابندی سے خراج وصول کر لیتے ہوں۔ شاید اس کے بیان سے یہ مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان جگہوں کے حکمراں وجے نگر سے تعلق قائم رکھتے تھے اور ان کی رضا خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تحفے تحائف بھیجتے تھے۔ سری لنکا پر بہر طور کئی بار حملہ ہوا تھا جو ایک مضبوط بحری فوج کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔

لائق حکمرانوں کے یکے بعد دیگرے سلسلے کے ساتھ وجے نگر کی حکومت پندرھویں صدی کے پہلے نصف حصے میں سب سے مضبوط اور خوشحال سلطنت کے روپ میں ابھری۔ بہت سے سیاح جو اس دور میں وجے نگر آئے انھوں نے اس شہر اور ملک کا بڑا تفصیلی بیان چھوڑا ہے۔ اٹلی

کاسیاح، نکولو کونٹی، جو 1420 میں یہاں آیا اس نے اس شہر کے لیے لکھا ہے کہ "شہر کا محیط 60 میل ہے۔ اس کی دیواریں پہاڑوں تک ملادی گئی ہیں اور پوری وادی کو نیچے تک گھیرے ہوئے ہیں۔۔۔ اس شہر میں نوے ہزار لوگ اسلحہ اٹھانے کے قابل موجود ہیں۔ ان کا بادشاہ ہندوستان کے تمام بادشاہوں میں سب سے طاقتور حکمراں ہے۔" فرشتہ کا بھی بیان ہے کہ "بہمنی خاندان کے شاہزادے صرف بہادری میں اُن سے بالادست تھے ورنہ طاقت واقتدار، دولت اور ملک کی وسعت میں بیجانگر (وجے نگر) کے رایااُن سے بہت آگے تھے۔"

عبدالرزاق جس نے ہندوستان اور اس سے باہر بہت سفر کیا تھا اور دیوارایادوم کے دربار میں سفیر تھا، اس نے لکھا تھا: "اس موخرالذکر بادشاہ کے زیرِ حکومت علاقے میں تین سو بندرگاہیں ہیں، جن میں سے ہر ایک کالی کٹ کے برابر ہے اور خشکی میں اس کی حدودِ سلطنت تین مہینے کی مسافت کے برابر ہیں۔" تمام سیاح اس بات پر متفق ہیں کہ ملک پوری طرح گنجان آباد تھا اور اُن میں بہت سے شہر اور گاؤں تھے۔ عبدالرزاق کا بیان ہے کہ "دیہی علاقے کا بڑا حصہ بہت اچھا مزروعہ اور بہت زرخیز ہے۔ فوج کی تعداد گیارہ لاکھ ہے۔"

عبدالرزاق وجے نگر کو اپنی آنکھوں سے دیکھے اور کانوں سے سنے شہروں میں سب سے اچھے شہروں میں ایک مانتا ہے۔ شہر کا حال بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ "اِسے اس انداز سے بنایا گیا ہے کہ سات گڑھیاں اور اتنی ہی دیواریں ایک دوسرے کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ہرات شہر کے بازار کا دس گنا حصہ اس کا رقبہ ہے۔" محل سے شروع کر کے اس میں چار بازار تھے "جو بے حد لمبے اور چوڑے تھے۔" ہندوستانی دستور کے مطابق لوگ اپنی ذات یا پیشے والوں کے ساتھ شہر کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ مسلمان بھی اپنے مقررہ حصے میں زندگی گزارتے تھے۔ بازاروں اور بادشاہ کے محل میں بھی "نہریں اور بہتے ہوئے چشمے دیکھے جاسکتے تھے جن کے پتھر گھسے ہوئے اور چکنے ہوتے تھے۔" اس کے بعد کا ایک اور سیاح کہتا ہے کہ یہ شہر روم سے بھی بڑا تھا، جبکہ روم اس وقت مغربی دنیا کے سب سے بڑے شہروں میں ایک شہر تھا۔

وجے نگر کے بادشاہوں کی دولت کی بھی بہت شہرت تھی۔ عبدالرزاق نے اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے کہ "بادشاہ کے محل میں کئی لمبی لمبی کولکیاں ہیں جو ٹھوس سونے چاندی

کے تھن پر پانی ڈال دیا گیا تھا اس لیے نہ تو کوئی دودھ کی دھار تھی اور نہ ہی چکنائی کا شائبہ۔"

اسی لیے اپنے سیاسی کارناموں اور فوجی کامیابیوں کے باوجود ہندوستان میں محمود ایک لٹیرے کے نام سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔ ہندوستان سے باہر بھی وہ اپنے ہم عصروں میں نیک نامی حاصل نہیں کر سکا۔ اس کو اور سنجر کو اسلام کے مجاہد کا رنگ دینے کا کام بعد کے تاریخ دانوں کا ہے۔

1030 میں محمود غزنوی کے انتقال کے بعد سے بارہویں صدی کے آخر میں غوری حملہ آوروں تک کا درمیانی ڈیڑھ سو سال کا عرصہ شمالی ہندوستان میں مسلسل تبدیلیوں اور انتشار کا دور گزرا ہے۔ اس علاقے کے فرماں رواں راجپوتوں میں مسلسل مہلک جنگی جھڑپیں ہوتی رہیں مگر ان میں سے کوئی بھی سربرآوردہ طاقت کی شکل میں نہیں ابھر سکا۔ قنوج پر محمود کے حملے کے بعد چھوٹی چھوٹی جاگیرداری طاقتوں کے ابھرنے سے پرتی ہار کی طاقت ختم ہو گئی۔ صرف گیارہویں صدی کے آخری دور میں راجاؤں کا ایک خاندان گہدوال دوآب میں ابھرا جس کی راجدھانی بنارس تھی۔ اس خاندان کے راجہ بنگال کے پال حکمرانوں اور دہلی کے تومر راجاؤں سے مسلسل لڑتے رہے۔

راجاؤں کا ایک دوسرا سلسلہ، جو چوہان کہلاتے تھے، راجستھان میں ابھرا جس کی نمائندگی بعد میں مشہور پرتھوی راج چوہان نے کی۔ چوہان گجرات کے چالوکیہ اور مالوہ کے پرمار راجاؤں سے مسلسل لڑتے رہے۔ ایک اور طاقتور شاہی سلسلہ کھجراؤ کے چندیلاؤں کا تھا جس کے دشمن مالوہ کے پرمار اور بنارس کے گہدوال دونوں ہی تھے، حالانکہ گہدوالوں نے قنوج کو تاخت و تاراج کیا اور دہلی پر اپنی اقتدار قائم کیا۔ اس کے باوجود کہ مغربی اور وسطی ایشیا میں غزنویوں کی طاقت محمود کے انتقال کے بعد تیزی سے کم ہو رہی تھی، راجپوت ریاستیں انفرادی طور پر یا مشترکہ طور پر غزنوی فوجوں کو پنجاب سے باہر نکال دینے میں یا تو باہم متحد ہونا نہیں چاہتی تھیں یا ہو نہیں سکیں۔ دوسری طرف محمود کے جانشین دوآب میں بنارس تک کمزور حملے کرنے کی کوششوں میں کامیاب ہوتے رہے۔ نتیجہ کے طور پر جیسا کہ سی۔ ای۔ بوس ورتھ کہتا ہے "ہندوستان کے مندروں کی دولت غزنی پہنچتی رہی۔ سونے چاندی کی آمد غزنوی سلطنت کی معاشی حیثیت کو بحال اور وہاں کے سکّہ کو بہتر بناتی رہی۔"

سے بھری ہوئی ہیں۔" دولت جمع کرنا بادشاہوں کی دیرینہ روایت تھی، لیکن یہ ذخیرہ کی ہوئی دولت بازار میں گردش نہیں کرتی تھی اور بسا اوقات غیر ملکی حملوں کا سبب بھی بنتی تھی۔

وجے نگر حکومت کس طرز کی تھی اس سلسلے میں بھی مورخین میں کافی بحث مباحثہ نظر آتا ہے۔ نیل کنٹھ شاستری اسے عسکری یا جنگی ریاست سے قریب ترین کہتے ہیں۔ اُن کا یہ خیال وجے نگر کے ایک حکمراں کے اس نظریے پر مبنی ہے کہ کسی سلطنت کی آمدنی کو چار حصوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے: ایک حصہ مختلف قسم کے کاموں میں دو حصے، یعنی نصف، جنگ میں اور بقیہ کو غیر معمولی صورتِ حال کے لیے محفوظ رکھنا چاہیئے۔ اُس نے 'امارم' سسٹم پر بھی زور دیا ہے۔ امارم رکھنے والے 'نایک' کو، جسے زمین کا ایک حصہ دے دیا جاتا تھا، ایک مقررہ تعداد سپاہیوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کی رکھنی ہوتی تھی جو حکمراں کی خدمات کے لیے ہوتے تھے اور نایک کو بادشاہ سے وفادار رہنے کا عہد کرنا پڑتا تھا۔

وجے نگر بھی اسی حد تک عسکری ریاست تھی جتنی اور دوسری ریاستیں جنھیں ہر لمحے جنگ کے لیے تیار رہنا پڑتا تھا۔ اپنے مسلم مخالفوں سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہنے کی بڑی وجہ یہ حقیقت تھی کہ انھوں نے صرف سواروں کی جنگ کے انداز کو ہی نہیں اپنایا تھا بلکہ، جیسا کہ ہم نے دیکھا، انھوں نے اپنی فوج میں ایک بڑی تعداد مسلم گھوڑ سوار تیر اندازوں کی بھی رکھی تھی۔ وجے نگر کے حکمراں ایک کافی بڑی باقاعدہ فوج مستقل طور پر تیار رکھتے تھے، جسے نقد تنخواہ دی جاتی تھی۔ اس طرح پرانے دستور طریقوں کو اپنائے رہنے کے ساتھ ساتھ وجے نگر کے حکمراں نے کچھ نئے طریقوں کو بھی اپنانے کی کوشش کی تھی۔

اس سلسلے میں بھی اختلاف رائے ہے کہ آیا وجے نگر حکومت نیم خود مختار قسم کے فوجی سرداروں اور کچھ علاقائی سرداروں 'نایکوں' کا ایک نیم منظم قسم کا گٹھ جوڑ تھی یا دہلی سلطنت کے ماڈل پر ایک باقاعدہ مرکزی حکومت والی ریاست تھی۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جنوب کے امارم نظام کو ہم کسی طرح ترکی کے 'اقطاع' نظام کے برابر نہیں رکھ سکتے۔ نایک اپنے حکمراں کی خدمت میں غلاموں یا ماتحتوں کے روپ میں نہیں ابھرے تھے جس صورت میں حکمراں کو پورا اختیار ہوتا تھا کہ وہ جہاں اور جب چاہے انھیں منتقل کردے یا بالکل معزول کردے۔ نایک

اپنے تمام اختیار اور طاقت کے ساتھ موروثی حق رکھتے ہوئے اپنے علاقے کے مالک و مختار ہوتے تھے۔ گو کہ وہ اپنے حکمراں کی وفاداری اور خدمت انجام دینے کا وعدہ کرتے تھے، کیونکہ حکمراں اُن کی حیثیت کو قانونی جواز بخشتا تھا لیکن وہ اپنا داخلی انتظامیہ خود چلاتے تھے اور اپنی آمدنی کا صرف ایک حصہ حکمراں کو ادا کرتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وجے نگر حکومت میں 200 نایک تھے۔ حکمراں اُن پر گرفت رکھنے کی کوشش کرتا تھا مگر انھیں معزول یا برخواست نہیں کر سکتا تھا۔ جنوب اور مغربی، کچھ دور افتادہ علاقوں میں چند علاقائی حکمراں بھی تھے جنھوں نے وجے نگر کی فرمانروائی کی بالادستی (سوزرینٹی) تو قبول کر لی تھی مگر اپنے علاقے پر انھیں کی حکومت برقرار تھی۔ اس طرح وہ علاقہ جس پر وجے نگر کے حکمراں براہِ راست حکومت کرتے تھے پوری سلطنت کے مقابلے میں یقیناً بہت چھوٹا رہا ہوگا۔ حکومت کے انتظامیہ کو چلانے کے لیے وزیروں کی ایک روایتی کاؤنسل کے علاوہ جس کا سربراہ 'پرادھنی' کہلاتا تھا، ایک مرکزی دفتر یا سکریٹریٹ بھی ہوتا تھا جس میں بہت بڑی تعداد میں کلرک (کایستھ) کام کرتے تھے۔ عبدالرزاق کے بیان کے مطابق حکمراں کے محل کے پاس ایک دیوان خانہ تھا جو بہت وسیع و عریض تھا اور چہل ستون (چالیس کھمبا) ہال جیسا لگتا تھا، اور اس میں سرکاری ریکارڈس رکھے جاتے تھے اور یہیں کارکن یا کلرک بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ بہر طور حکومت کے انتظامیہ کے طریقہ کار کے بارے اور اس علاقے کی وسعت کے بارے میں بہت کم معلومات موجود ہیں جو براہِ راست مرکز کے زیرِ انتظام تھا۔

وجے نگر حکومت کو (ہندو) قدامت پرستی اور کٹرپن کا گڑھ بھی کہا گیا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس کے حکمراں اپنی توجہ اور بہت سا وقت مندروں اور مٹھوں کی تعمیر اور مرمت میں صرف کرتے تھے اور خود کو ویدوں کے محافظ اور ان کی راہ پر چلنے والے کہلائے جانے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ یہ برہمنوں پر خصوصی نظر کرم رکھتے تھے جنھیں صرف لگان معاف زمینیں ہی نہیں دی جاتی تھیں بلکہ انھیں قلعوں اور فوجوں کا کمانڈر بھی مقرر کیا جاتا تھا۔ برہمنوں کو دی جانے والی ذمے داریاں اور اُن کا اہم سیاسی کردار فی الحقیقت حکمرانوں کی مذہبی تحریک و جذبات پر مبنی نہیں ہوتے تھے بلکہ اصل میں انھیں طاقتور کنٹر نایکوں کی طاقت کے خلاف ایک توازن قائم رکھنے کے سلسلے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ بادشاہ مذہبی معاملات میں تنگ نظر نہیں ہوتے تھے۔ حالانکہ

بنیادی طور پر یہ شیو بھگت تھے مگر یہ دوسرے ہندو فرقوں سے کسی قسم کی تفریق و امتیاز نہیں برتتے تھے۔انھوں نے جین دھرم کی بھی سرپرستی کی۔ عیسائی مشنریاں جو جنوبی ہندوستان میں قائم ہو گئی تھیں انھیں کام کرنے اور ہندوؤں کا مذہب تبدیل کرانے کی بھی آزادی تھی۔ مسلمان سپاہی جو فوج میں بھرتی کیے گئے تھے انھیں نماز ادا کرنے کی اجازت تھی اور عام طور پر ہندو مسلمان سپاہیوں میں اچھے تعلقات رہتے تھے۔اس سلسلے میں ناروا داری کے جس بدترین واقعے کی مثال دی جاسکتی ہے وہ یہ تھا کہ 1469 میں وجے نگر کے حکمراں ملک ارجن رانا نے اُس شدید غصے میں کہ بھٹکھال کے تاجروں نے گھوڑے بہمنی حکمراں کے ہاتھ بیچ دیے تھے، شہر کی ساری مسلم آبادی کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کا حکم دے دیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ 10,000 مسلمان قتل کیے گئے اور بچے کھچے لوگ گوا کی طرف بھاگ گئے۔اس کی اس غلطی اور جرم کا بہمنی حکمراں کی طرف سے ردِ عمل اس صورت میں ہوا کہ بیلگام اور اس کے اطراف کا علاقہ وجے نگر کی حکومت کے ہاتھ سے نکل گیا۔

(ii) بہمنی سلطنت۔عروج و انتشار:

ہم بہمنی سلطنت کے ظہور میں آنے اور وجے نگر سلطنت کے دیوارایا (دوم) کی موت (1446) تک کے ٹکراؤ کو پہلے دیکھ چکے ہیں۔اس عرصے میں بہمنی سلطنت میں سب سے ممتاز اور یادگار شخصیت فیروز شاہ بہمنی (1422-1397) کی تھی۔وہ مذہبی علوم، تفسیر قرآن، اصولِ فقہہ وغیرہ کی بہت اچھی معلومات رکھتا تھا اور اُسے منطق اور قدرتی سائنس نباتیات (باٹنی)، علم الاشکال (جیومیٹری) وغیرہ کا بھی بہت شوق تھا۔وہ بہت اعلیٰ درجہ کا خوش نویس اور شاعر بھی تھا اور کبھی کبھی فی البدیہہ اشعار بھی کہتا تھا۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق اُسے صرف فارسی، عربی اور ترکی زبانوں پر ہی مہارت حاصل نہیں تھی بلکہ تیلگو، کنڑ اور مراٹھی پر بھی بہت اچھی دستگاہ تھی۔اُس کے حرم میں بہت سے ملکوں اور علاقوں سے آئی ہوئی متعدد بیویاں تھیں، جن میں کئی ہندو بیویاں بھی تھیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ہر ایک سے اُسی کے علاقے کی زبان میں گفتگو کرتا تھا۔

فیروز شاہ بہمنی نے پورے عزم سے طے کر لیا تھا کہ وہ دکن کو ہندوستانی ثقافت (کلچر) کا مرکز بنادے گا۔اس میں دہلی سلطنت کے زوال نے بھی اس کی کچھ مدد کی کیونکہ بہت سے علماء اور فضلاء نے دہلی سے دکن کی طرف ہجرت کر لی تھی۔ بادشاہ نے ایران اور عراق سے بھی عالموں کو

ادھر آنے کی دعوت دی۔ فیروز شاہ عام طور پر آدھی رات تک اپنا وقت مذہبی افراد، شعراء، تاریخ پڑھ کر سنانے والوں اور بہترین علماء اور حاضر جواب قسم کے لوگوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ اُس نے جدید اور قدیم دونوں انجیلوں (نیو اینڈ اولڈ ٹیسٹامنٹ) کا مطالعہ بھی کیا تھا اور وہ تمام مذاہب کے بنیادی اصول و ضوابط کا احترام کرتا تھا۔ فرشتہ کہتا ہے کہ وہ پکا مسلمان تھا مگر اس میں صرف دو کمزوریاں تھیں: شراب پیتا تھا اور موسیقی سنتا تھا۔

فیروز شاہ بہمنی کا سب سے یادگار کام انتظامیہ میں بڑی تعداد میں ہندوؤں کو شامل کرنا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے دور سے انتظامیہ میں دکنی برہمن اکثریت اور اہمیت میں آگئے۔ دکنی ہندوؤں نے باہر سے آنے والے آفاقیوں یا غریبوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے خلاف بھی ایک توازن پیدا کیا۔ مغربی ایشیا سے آنے والے غیر ملکیوں میں خاصی بڑی تعداد ایرانیوں کی تھی جن کے اثر سے ایرانی کلچر اور شیعہ مسلک سلطنت میں عام ہوا۔ بہمنی حکمراں مذہبی معاملات میں روادار تھے اور حالانکہ اُن میں سے زیادہ تر سنی عقیدہ کے پیرو تھے مگر انھوں شیعیت کو کبھی دبانے یا کچلنے کی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح بہمنی سلطنت کے ابتدائی دور میں جزیہ بھی ہندوؤں پر عائد نہیں کیا گیا۔ بعد کے دور میں بھی جزیے کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اگر بہمنی آخری دور میں کبھی وصول بھی کیا گیا تو اسے زمینی لگان (خراج) کے ایک حصے کے طور پر کیا گیا۔ فیروز شاہ بہمنی نے علم فلکیات (آسٹرونومی) کی بھی سرپرستی کی اور دولت آباد کے پاس ایک رصدگاہ بنوائی۔ اس نے اپنی سلطنت کی بندرگاہوں۔ چول اور دابھول۔ کی طرف خصوصی توجہ دی جو خلیج فارس اور بحر احمر سے آنے والے تجارتی جہازوں کی توجہ کا مرکز تھے اور ساری دنیا سے آنے والے عیش و آرام کے سامان یہاں پہنچاتے تھے۔

فیروز بہمنی نے کھیرلا کے گونڈ راجہ نرسنگھ رائے کو شکست دے کر برار کی طرف اپنی سلطنت کی توسیع کا سلسلہ شروع کیا۔ رائے نے فیروز شاہ کو 40 ہاتھی 5 من سونا اور 50 من چاندی کے تحائف پیش کیے۔ رائے کی ایک لڑکی کی شادی بھی فیروز سے ہوئی اور کھیرلا کو پھر نرسنگھ کو واپس کر کے سلطنت کا امیر بنا دیا گیا۔ شاہی خلعتیں عطا ہوئیں جن میں ایک کڑھی ہوئی ٹوپی بھی شامل تھی۔ فیروز شادہ بہمنی کی دیوارایا (اول) کی لڑکی سے شادی اور بعد میں وجے نگر سے جنگوں کا

ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ کرشنا گوداوری تھالے پر تسلط کی کشمکش بہر صورت متواتر جاری رہی۔ 1419 میں بہمنی سلطنت کو ایک دھکا اُس وقت لگا جب دیوارایا اول نے فیروز شاہ کو شکست دی۔ اس شکست نے فیروز کے اقتدار کو بھی کمزور کیا اور اُسے اپنے بھائی احمد شاہ (اول) کے حق میں حکومت سے دست بردار ہونا پڑا۔ احمد شاہ (اول) مشہور صوفی گیسو دراز سے اتنا وابستہ تھا کہ اسے ولی کہا جاتا تھا۔ بہر حال خود احمد شاہ ہندوؤں میں بھی اتنا ہی سنت مانا جاتا تھا کہ اُس کا عرس ابھی کچھ عرصے پہلے تک بھی ہر سال منایا جاتا تھا۔ احمد شاہ نے بھی جنوبی ہندوستان کے مشرقی ساحلی حصے پر تسلط کی جدوجہد جاری رکھی۔ وہ یہ بات کبھی نہ بھلا سکا کہ آخری دو جنگوں میں جن میں بہمنی سلطان کو شکست ہوئی تھی، ان میں وارنگل کے حکمراں نے وجے نگر کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ اس کا بدلہ لینے کے لیے اس نے وارنگل پر حملہ کیا اور وہاں کے حکمراں کو جنگ میں ہرا کر قتل کیا اور اس کے علاقے کا ایک بڑا حصہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس نئے حصے پر پوری طرح تسلط اور انتظام قائم کرنے کی غرض سے اُس نے اپنا دارالسلطنت گلبرگہ سے بیدر منتقل کر لیا۔ اس کے بعد یہ مالوہ، گونڈوانہ اور کونکن کی طرف متوجہ ہوا۔

محمود گاواں کا دور (1463 تا 1482):

پندرھویں صدی کا دوسرا نصف حصہ جنوب میں بہمنی سلطنت کے رفتہ رفتہ عروج کا دور تھا اور جنوب میں یہ سب سے مضبوط طاقت تھی۔ یہ صورت اسی وقت نظر آنے لگی تھی جس وقت احمد شاہ نے وارنگل کو فتح کیا تھا جس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب طاقت کا توازن بہمنی سلطنت کی طرف جھک رہا ہے۔ دیوارایا (دوم) کی موت کے بعد وجے نگر میں جانشینی کے لیے کچھ کشمکش ہوئی جس سے اڑیسہ کے گجپتی حکمرانوں کو اپنی طاقت بڑھانے اور اس علاقے پر اثرانداز ہونے کا موقع مل گیا۔ بہمنوں نے بھی اس موقعے کو جنوب میں اپنی طاقت کو مضبوط کرنے اور شمال کی طرف برار اور خاندیش کی طرف توسیع کرنے اور مغرب میں کونکن کی طرف بڑھنے میں استعمال کیا اس طرح اب ان کا آمنا سامنا مالوہ اور گجرات سے ہو گیا۔

اس عرصے میں آفاقیوں (باہر سے نئے آنے والوں) اور دکنیوں (پرانے آنے والوں) کے درمیان کشمکش بڑھی جس سے بہمنی سلطنت کے داخلی انتظامیہ میں کچھ اختلال پیدا ہوا یہاں

تک کہ محمود گاواں نے طاقت سنبھالی اور اپنا تسلط جمایا۔ محمود گاواں کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بہت زیادہ معلومات موجود نہیں ہیں۔ ایرانی نسل کا یہ شخص سب سے پہلے 1456 میں اس وقت منظر عام پر آیا جب اسے سلطنت پر قابض سلطان کے خلاف ایک دعوے دار سے نپٹنے کے لیے ایک فوج کا سردار مقرر کیا گیا۔ محمود گاواں کا حکمراں سے تعارف کرایا گیا اور رفتہ رفتہ اس کا اثر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ جب 1461 میں سلطان کا انتقال ہوا اور ایک کم عمر شخص کو اس کا جانشین مقرر کیا گیا تو محمود گاواں کو اس اعلیٰ کاؤنسل کا ممبر بنایا گیا جسے سلطنت کے امور وانتظام چلانے تھے۔ اس عرصے میں مالوہ کے حکمراں کے متواتر حملوں کے نتیجے میں اس کاؤنسل کو ختم کر دیا گیا اور 1463 میں ایک نئے شاہزادے کو تخت پر بٹھایا گیا جس نے محمود گاواں کو وکیل سلطنت (وزیرِ اعظم) مقرر کیا اور اسے خواجہ جہاں اور ملک التجار کے لقب عطا کیے۔ حالانکہ محمود گاواں کبھی تاجر نہیں رہا تھا مگر یہ خطاب اس سے پہلے کے حکمرانوں نے اپنے ممتاز امراء کو دیا تھا۔

محمود گاواں بیس سال تک امورِ سلطنت پر چھایا رہا۔ اس عرصے میں محمود گاواں نے مشرق اور مغرب دونوں طرف اپنے علاقے میں توسیع کی کوشش کی۔ مشرق میں اس کا سامنا اڑیسہ کے گج پتی حکمراں سے ہوا۔ اس سلسلے میں اس نے گج پتی کو کورومنڈل ساحل سے بے دخل کرنے کے لیے وجے نگر کے حکمراں سے گٹھ جوڑ کیا۔ اڑیسہ کے ساحلی علاقے میں اُس نے اور بھی کچھ حصے فتح کیے۔

محمود گاواں کا سب سے اہم فوجی کارنامہ یا سلطنت کو دین یہ تھی کہ اُس نے مغربی ساحلی علاقہ پر قبضہ کیا جس میں دابھول اور گوا بھی شامل تھے۔ ان بندرگاہوں کے ہاتھ سے نکل جانے سے وجے نگر کو یقیناً زبردست دھکا لگا۔ بہمنی سلطنت کی گوا اور دابھول پر گرفت نے ان کے لیے ایران، عراق وغیرہ سے تجارت کے اور زیادہ مواقع فراہم کیے۔ داخلی تجارت اور صنعتی پیداوار بھی بڑھی۔

محمود گاواں نے سلطنت کی شمالی سرحدوں کو بھی مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ احمد شاہ (اول) کے دور سے ہی مالوہ کی سلطنت جس پر خلجی حکمرانوں کا راج تھا، گونڈوانہ برار اور کونکن کے علاقوں پر قبضے کے لیے لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ اس کشمکش میں بہمنی سلطانوں نے کوشش کر کے گجرات کے حکمرانوں کی مدد حاصل کر لی تھی۔ کافی طویل کشمکش کے بعد یہ معاہدہ ہوا تھا کہ گونڈوانہ میں کھیر لا مالوہ کے حصے میں جائے گا اور برار بہمنی سلطانوں کے پاس رہے گا۔ لیکن مالوہ کے حکمراں

برار پر ہمیشہ نگاہ جمائے رہتے تھے۔ محمود گاواں کو برار کے لیے مالوہ کے حکمراں محمود خلجی سے کئی سنگین جنگیں لڑنی پڑیں۔ بہر حال وہ اس سلسلے میں غلبہ حاصل کر لینے میں گجرات کی بھرپور مدد کی وجہ سے ہی کامیاب ہو سکا۔

اس سے یہ بات بہ آسانی دیکھی جاسکتی ہے کہ جنوب میں اقتدار کی کشمکش میں مذہبی خطوط پر تقسیم کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ سیاسی اور عسکری دباؤ اور ضرورتیں، اور تجارت اور کاروبار پر گرفت حاصل کر لینا ان اختلافات یا جنگوں کے لیے زیادہ ذمے دار تھے۔ دوسری بات یہ کہ شمالی ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے درمیان آپسی کشمکش، اور دوسری طرف جنوبی ریاستوں کی کشمکش، یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق بھی نہیں تھیں۔ مغرب میں مالوہ اور گجرات بھی دکن کی آپسی معاملات میں کھینچ لیے گئے تھے اور ادھر مشرق میں اڑیسہ بنگال سے الجھا رہتا تھا۔ وہ کورومنڈل کے ساحلی علاقے کو بھی للچائی نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔

بہمنی سلطنت کی مشرق اور مغرب کی طرف توسیع کے نتیجے میں وجے نگر سے ٹکراؤ دوبارہ شروع ہو گیا۔ مگر اس وقت تک وجے نگر کی طاقت بہمنی سلطنت سے مقابلے کے قابل نہیں رہی تھی۔ محمود گاواں نے صرف تنگ بھدرا دوآب کو ہی اپنے علاقے میں شامل نہیں کر لیا بلکہ وجے نگر کے علاقے میں دور تک اندر گھستا چلا گیا اور جنوب میں کانچی تک پہنچ گیا۔

محمود گاواں نے بہت سی داخلی اصلاحات بھی کیں۔ ان کاموں میں کچھ امراء کی طاقت پر کسی قدر بندش لگانے سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح پرانے صوبوں (طرف) کو اور چھوٹا کر کے چار سے آٹھ کر دیا گیا اور ہر قلعے کے گورنر کو اب براہِ راست سلطان مقرر کرنے لگا۔ ہر امیر کی تنخواہ اور اُس کے فرائض متعین کر دیے گئے۔ 500 سواروں کا دستہ رکھنے کے لیے امیر کو 1,00,000 ہن سالانہ تنخواہ ملتی تھی۔ تنخواہ کی ادائیگی نقد بھی ہو سکتی تھی یا جاگیر دے کر بھی۔ جنھیں جاگیر کے ذریعے ادائیگی ہوتی تھی انھیں لگان وصولی کے اخراجات کی چھوٹ دی جاتی تھی۔ ہر صوبے میں ایک قطعہ زمین (خالصہ) الگ کر دیا جاتا تھا جس کی آمدنی خاص سلطان کے لیے ہوتی تھی۔ زمین کو ناپ کر اُس پر کاشتکار سے مقررہ لگان وصول کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔

محمود گاواں فنونِ لطیفہ کا بھی بہت بڑا سرپرست تھا۔ اُس نے اپنے دار السلطنت بیدر

میں ایک عالیشان مدرسہ بھی تعمیر کروایا۔ یہ خوبصورت عمارت جسے رنگین ٹائلوں سے سجایا گیا تھا تین منزلہ تعمیر تھی اور اس میں ایک ہزار استاد اور شاگرد رہتے تھے جنھیں کھانا اور کپڑے مفت دیے جاتے تھے۔ ایران اور عراق کے کچھ بہت ممتاز علماء و فضلاء کو بھی محمود گاواں مدرسے میں بلاتا تھا۔

امراء کی آپسی کشمکش اور نزاع، بہمنی سلطنت کو درپیش مشکل ترین مسائل میں سے ایک تھا۔ امراء نئے آنے والوں اور پرانے امراء دکنی اور آفاقیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ نئے امیر کی حیثیت سے محمود گاواں کو دکنی امراء کا اعتماد اور تعاون حاصل کر لینے میں کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑا حالانکہ اس نے عام دوستی اور مصالحت کی پالیسی اپنائی مگر پارٹی بندی اور کھینچ تان بہر حال پوری طرح ختم نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس کے مخالفین نے نوعمر سلطان کے اتنے کان بھرے کہ آخر اُس نے 1482 میں محمود کو قتل کروادیا۔ اس وقت محمود گاواں کی عمر ستر سال تھی۔ ان دونوں پارٹیوں کے درمیان نزاع اب اور سخت ہو گئے۔ کئی گورنروں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور پھر جلدی ہی بہمنی سلطنت پانچ فرمانروائیوں میں تقسیم ہو گئی۔ گولکنڈہ، بیجاپور، احمد نگر، براراور بیدر۔ ان میں سے احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ نے سترھویں صدی میں دکن کے مغل سلطنت میں ضم ہو جانے تک دکن کی سیاست میں کافی اہم کردار ادا کیا۔

بہمنی سلطنت نے شمال اور جنوب کے درمیان ایک ثقافتی رشتے یا پُل کا کردار بھی ادا کیا۔ مغربی ایشیا کے کچھ اہم ممالک، جن میں ایران اور ترکی بھی شامل تھے، ان سے بھی بہمنی سلطنت کا تعلق قائم رہا۔ جو کلچر یہاں اُبھرا وہ شمالی ہندوستان کے کلچر کے مقابلے میں اپنی کچھ علیحدہ اور ممتاز خصوصیات رکھتا تھا۔ یہ ثقافتی روایتیں بہمنی سلطنت کی جانشین سلطنتوں میں جاری و ساری رہیں اور انھوں نے اُس عہد کے مغل کلچر پر بھی اپنا اثر چھوڑا۔

(iii) وجے نگر کا نقطۂ عروج اور انتشار:

جیسا پہلے بیان کیا جا چکا ہے دیوارایا (دوم) کے انتقال کے بعد سلطنت میں کچھ عرصے کشمکش اور اختلال رہا۔ تخت سلطنت کے دعوے کے درمیان خانہ جنگیاں شروع ہوئیں۔ بہت سی جاگیریں اس دوران خود مختار ہو گئیں۔ رایا کا اقتدار و حکومت سکڑ کر صرف کرناٹکا اور مغربی آندھرا کے کچھ حصوں تک باقی رہ گیا۔ کچھ عرصے بعد تختِ سلطنت کو بادشاہ کے وزیر سالووا نے چھین

لیا۔اس طرح پہلے شاہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ سالووا نے داخلی امن وامان قائم کر کے ایک نئے شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی لیکن یہ سلطنت بھی زیادہ عرصے باقی نہیں رہی۔ اس کے بعد ایک نئے خاندان (جسے تلووا کہا جاتا ہے) کی بنیاد کرشنا دیوارایا (30-1509) نے رکھی، جو خود ہی اس خاندان کی سب سے بڑی شخصیت تھا۔ کچھ مورخوں نے تو اسے وجے نگر کے تمام حکمرانوں میں سب سے بڑا مانا ہے۔ کرشنا دیوا کو صرف اندرونِ ملک ہی امن وامان اور استحکام نہیں قائم کرنا تھا بلکہ اسے وجے نگر کے دیرینہ مخالفوں اور دشمنوں کو بھی بھگتنا تھا۔ ان میں بہمنی سلطنت کی جانشین حکومتیں اور اڑیسہ بھی شامل تھے۔ اڑیسہ نے وجے نگر کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے پرتگالیوں کی طرف بھی نگاہ کرنی تھی جن کی طاقت رفتہ رفتہ اس علاقے میں مضبوط ہوتی جارہی تھی۔ پرتگالی اپنی بحری بالادستی کو وجے نگر کی چھوٹی چھوٹی ساحلی ریاستوں کو ڈرادھمکا کر اُن سے سیاسی اور معاشی فائدے حاصل کرنے میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ یہ رایا کی غیر جانب داری کو خریدنے کی بھی کوشش کر چکے تھے جس کے بدلے میں انھوں نے بیجاپور کے قبضے سے گوا کو آزاد کرانے اور گھوڑوں کی سپلائی کا مکمل اجارہ دے دینے کی بھی پیش کش کی تھی۔

سات سال تک چلنے والے جنگوں کے سلسلے میں کرشنا دیوا (اول) نے اڑیسہ کے حکمراں کو دریائے کرشنا تک کے تمام علاقے وجے نگر کو واپس کر دینے پر مجبور کر دیا۔ اتنی مضبوطی حاصل کر لینے کے بعد کرشنا دیوا نے تنگ بھدرا دوآب کی واپسی کی جدوجہد کو پھر شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں دو پرانے حریفوں۔ بیجاپور اور اڑیسہ۔ میں ضرورت کے تحت ایک معاہدہ اور گٹھ جوڑ بھی ہوا۔ کرشنا دیوا نے اس مہم کے لیے بڑی زبردست تیاریاں کیں۔ اس جنگ کو اس نے سب سے پہلے رائچور اور مدکل پر یلغار سے شروع کیا۔ اس جنگ میں بیجاپور کے حکمر کو 1520 میں بری طرح شکست ہوئی۔ اُسے دریائے کرشنا کے دوسری طرف دھکیل دیا گیا اور وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا سکا۔ وجے نگر کی فوجیں مغرب میں بیلگام بھی پہنچیں۔ بیجاپور پر قبضہ کیا اور کئی دن تک اُسے لوٹا اور معاہدے سے پہلے گلبرگہ کو تباہ کیا۔

اس طرح کرشنا دیوا کے دور میں وجے نگر جنوب کی سب سے مضبوط طاقت بن گئی۔

بہر طور، اپنی پرانی رنجشوں اور دشمنیوں کو بدلا لینے کے شوق میں جنوب کی طاقتوں نے عام طور پر

اُس خطرے کی طرف سے آنکھیں بند رکھیں جو ان کو اور ان کی تجارت کو پرتگال کی ابھرتی ہوئی طاقت سے پہنچنے والا تھا۔ چولا خاندان اور شروع کے وجے نگر کے حکمرانوں کے برخلاف انھوں نے بحری فوج کی نشو ونما پر بہت کم توجہ دی۔

اس دور میں وجے نگر کے حالات کو بہت سے غیر ملکی سیاحوں نے بیان کیا ہے۔ اٹلی کے پائس نے، جس نے کرشنا دیوا کے دربار میں کئی سال گزارے تھے، کرشنا دیوا کی شخصیت کی بڑی شاندار تصویر کھینچی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ "وہ ایک عظیم حکمراں ہے اور کافی عدل و انصاف والا انسان ہے، اُن چند اوقات کے علاوہ جب اس پر غیظ و غضب کے دورے پڑیں" اُسے اپنی رعایا سے محبت تھی اور اپنے عوام کی خوشحالی کی خواہش اور لگن اس کے یہاں ایک مثالی حیثیت رکھتی تھی۔

کرشنا دیوا عظیم معمار بھی تھا۔ اُس نے وجے نگر کے پاس ایک شہر تعمیر کرایا اور ایک بہت بڑا تالاب کھدوایا جو آبپاشی کے کام بھی آتا تھا۔ یہ تیلگو اور سنسکرت میں خداداد غیر معمولی قابلیت کا عالم تھا۔ اُس کی بہت سی تحریروں میں اب صرف ایک تیلگو تحریر، ملکی سیاست پر، اور سنسکرت میں ایک ڈرامہ موجود ہیں۔ تیلگو ادب میں اس کے عہد سے ایک نیا دور شروع ہوا جس میں سنسکرت کی نقل کے بجائے تیلگو میں آزادانہ تحریریں تخلیق ہونی شروع ہوئیں۔ اس نے تیلگو، کنڑ اور تامل شاعروں کی سرپرستی کی۔ باربوسا، پائس اور نونیز جیسے غیر ملکی سیاح اس کے انتظامیہ کی چستی اور اس کی سلطنت کی خوشحالی کا بھی کافی ذکر کرتے ہیں۔ اُس کا اہم ترین کارنامہ اپنے دور میں عوام میں رواداری اور آپسی میل جول کا ماحول پیدا کرنا تھا جو اس کے دور میں عام تھا۔ باربوسا کا قول ہے: "بادشاہ نے اتنی آزادی دی ہوئی ہے کہ کوئی شخص خواہ کسی بھی عقیدے کا ہو، اپنے عقائد کے مطابق زندگی گزار سکتا ہے اور جہاں چاہے آزادی سے آجاسکتا ہے۔ نہ اُسے کسی کی ناراضگی یا ناخوشگواری برداشت کرنی ہوتی ہے اور نہ کوئی اس سے یہ سوال کرتا ہے کہ وہ عیسائی ہے، یہودی ہے، مور ہے یا کافر ہے۔" باربوسا نے کرشنا دیوا کے عدل و انصاف اور اس کے دور میں مساوات کی بھی تعریف کی ہے۔

کرشنا دیوا کی موت کے بعد اُس کے عزیزوں میں جانشینی کے لیے کھینچ تان شروع ہوگئی کیونکہ اس کے سارے لڑکے کم عمر تھے۔ آخر سدا شوارایا 1543 میں تخت نشین ہوا جس نے

اس تمام غارتگری کے باوجود غزنوی ہندوستان میں اپنے علاقوں کو وسعت دینے میں ناکام رہے۔ یہ عمل غوریوں کے عروج اور مغربی و وسطی ایشیا کی سیاست میں نئے موڑ سے دوبارہ شروع ہوا۔

(iv) غوریوں کا عروج اور ہندوستان میں پیش قدمی:

غزنوی اور سلجوق سلطنتوں کے درمیان پہاڑی سلسلوں کے بیچ ایک چھوٹے اور بالکل علیحدہ مقام میں غوریوں کی طاقت کا عروج شروع ہوا جو ایک غیر۔معمولی اور غیر متوقع واقعہ تھا۔ یہ علاقہ اتنا الگ تھلگ تھا کہ گیارہویں صدی تک یہ بستی مسلمان فرماں رواؤں سے گھری رہی اور اس بستی کے لوگوں نے اس وقت اسلام قبول کیا جب بارھویں صدی کے ابتدائی دور میں محمود نے یہاں حملہ کیا اور غوریوں کو اسلام کی تعلیم دینے کے لیے استادوں کو یہاں چھوڑا۔ اس کے باوجود یہ سمجھا جاتا ہے کہ کفر یعنی بدھ مذہب کا ایک مسلک مہایان، یہاں صدی کے آخر تک جاری رہا۔

شنسبانی نے، جو ابتدا سے ہی غور کے بہت سے خاندانوں میں سے ایک خاندان تھا اسلام کو اس علاقے میں مضبوطی سے قائم کرنے میں اہم رول ادا کیا اور سختی کی پالیسی اپناتے ہوئے اپنے آپ کو سب سے بڑی طاقت بنالیا۔ بارہویں صدی کے وسط تک وہ اپنے آپ کو اتنا مضبوط سمجھنے لگے کہ جب ہرات کے گورنر نے سلجوقی حکمراں سنجر کے خلاف بغاوت کی تو وہ بھی دخل اندازی کرنے لگے۔ غزنویوں کو خطرہ محسوس ہوا اور بہرام شاہ نے غور حکمراں علاؤالدین حسین شاہ کے بھائی کو گرفتار کرلیا اور اس کو زہر دلوادیا۔ بدلے میں علاؤالدین شاہ نے بہرام شاہ کو شکست دی اور غزنی پر قبضہ کرلیا۔ سات دن تک شہر میں تباہی اور غارت گری چلتی رہی اور نفیس اور بہترین عمارتیں تباہ ہوگئیں۔ اس کی وجہ سے علاؤالدین حسین شاہ کو جہاں سوز، یعنی 'دنیا کو جلانے والا' کا خطاب ملا۔ غزنویوں کا خاتمہ ہوا اور اسلامی دنیا کے رُخ پر غوری خاندان ایک مضبوط طاقت بن کر ابھرا۔ غوریوں نے سلجوقیوں سے معاون ہونے پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ انہیں کی طرح 'السطان المعظم' کا خطاب حاصل کیا۔

اپنے سابق حکمرانوں کی طرح غوری سلجوقیوں سے خراسان اور مرو کے خوشحال علاقوں پر قبضہ کے لیے برابر لڑتے رہے۔ غزنویوں کی طرح غوری بھی ٹیکس وصول کرنے کی وجہ

1567 تک حکومت کی۔ مگر اقتدار کی اصلی طاقت مجلسِ ارباب ثلاثہ (تین افراد کی کمیٹی) کے ہاتھوں میں تھی اور ان میں بھی راما راجا سب سے اعلیٰ حیثیت کا مالک تھا۔ راما راجا اپنی حکومت کے مفاد میں مختلف مسلمان حکمرانوں کو ایک دوسرے سے الجھائے رکھنے میں کامیاب رہا۔ اُس نے پرتگالیوں سے ایک ایسا بیوپاری معاہدہ کیا کہ اس کے تحت بیجاپور کو گھوڑوں کی سپلائی بالکل رُک گئی۔ جنگوں کے ایک متواتر سلسلے میں اُس نے بیجاپور کے حکمراں کو مکمل شکست دی اور گول کنڈہ اور احمد نگر کے حکمرانوں کو بھی بری طرح ہرایا۔ ایسا لگتا ہے کہ راما راجا کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ اِن تینوں ریاستوں کی طاقت میں ایک ایسا توازن بنائے رکھے جس کا فائدہ وجے نگر کو رہے۔ بالآخران تینوں طاقتوں نے مل کر 1565 میں تالی کوٹا کے پاس بَنی ہٹی کے مقام پر بیجاپور کو شکستِ فاش دی۔ اِسے جنگِ تالی کوٹا، یا 'راکھشسا تنگاڈی' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں 1,00,000 ہندو قتل ہوئے۔ وجے نگر بُری طرح لوٹا اور تباہ کیا گیا اور کھنڈر کر کے چھوڑ دیا گیا۔

بَنی ہٹی جنگ کو عام طور پر وجے نگر کے عظیم دور کے خاتمے کی علامت مانا جاتا ہے حالانکہ یہ حکومت لگ بھگ سو سال تک کسی نہ کسی طرح کھنچتی رہی لیکن اس کی سرحدیں متواتر سکڑتی چلی گئیں اور رایا جنوبی ہندوستان کے سیاسی معاملات میں کوئی قابلِ ذکر حیثیت کے مالک نہ رہے۔

وجے نگر کے حکمرانوں میں بادشاہ کی حیثیت کافی اعلیٰ تصور کی جاتی تھی۔ سیاست پر اپنی کتاب میں کرشنا دیو ارایا نے بادشاہ کو مشورہ دیا ہے کہ "بڑی احتیاط اور اپنی طاقت کے مطابق ہمیں (حق) کی حفاظت اور (بدی) کی سرزنش کا کام انجام دینا چاہیے اور جو کچھ تم دیکھو یا سنو اس کی طرف سے کبھی لاپرواہی نہ برتو۔" اُس نے بادشاہ پر یہ ذمے داری بھی عائد کی تھی کہ "اپنی رعایا پر میانہ روی سے محصول عائد کرو۔"

وجے نگر سلطنت میں بادشاہ کے وزیروں کی ایک کاؤنسل ہوتی تھی جس میں سلطنت کے بڑے بڑے امراء شامل ہوتے تھے۔ پوری سلطنت 'راجیہ' یا 'منڈلم' (صوبوں) میں تقسیم تھی، ان کے نیچے 'ناڈو' (ضلع) ہوتے تھے، 'استھل' (تعلقہ یا سب ڈسٹرکٹ) اور 'گرام' (گاؤں) ہوتے تھے۔ بہر حال، چولا دور کی دیہی 'اپنی حکومت' کی روایت وجے نگر دور میں خاصی کمزور ہو گئی۔

موروثی نائکوں کے اُبھرنے سے اِن دیہی حکومتوں کی تحریک اور آزادی سلب ہوگئی۔

وجے نگر سلطنت میں کسانوں کی حالت کے بارے میں اتفاق نہیں ہے کیونکہ زیادہ تر سیاحوں کو اس علاقے کی دیہی حالت کی کوئی خاص واقفیت نہیں تھی اور انھوں نے اپنے بیانات میں اس کا ذکر بہت معمولی انداز میں کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہی فرض کیا جاسکتا ہے کہ اُن کی عام حالت پہلے جیسی ہی تھی اور اس میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اُن کے گھر وہی چھپر کے ہوتے تھے جس میں چھوٹا سا دروازہ ہوتا تھا۔ وہ عام طور پر ننگے پیر چلتے پھرتے تھے اور کمر سے اوپر کچھ نہیں پہنتے تھے۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ کبھی کبھی قیمتی جوتے پہن لیتے تھے اور سر پر پگڑی باندھتے تھے مگر یہ لوگ بھی کمر سے اوپر کا حصہ نہیں ڈھکتے تھے۔ ہر طبقے کے لوگوں کو زیور پہننے کا شوق تھا اور وہ انھیں "اپنے کانوں، گردن اور بازوؤں پر" پہنتے تھے۔

اس بات کا بھی بہت کم اندازہ ہے کہ کسانوں کو اپنی فصل کی پیداوار کا کتنا حصہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ ایک کتبے کے مطابق محصولوں کی شرحیں حسبِ ذیل تھیں:۔

سردیوں میں ہونے والے کورووائی (ایک قسم کا چاول) کا ایک تہائی حصہ،

تل، راگی اور گھوڑے کے دانے کا ایک چوتھائی حصہ،

باجرہ اور خشک زمینوں میں اگائی جانے والی فصلوں کا چھٹا حصہ،

اس طرح مختلف قسم کی فصلوں کے لیے شرحیں مختلف ہوتی تھیں۔ زمین، طریقۂ زراعت اور آبپاشی کے ذریعوں کی بنیاد پر بھی لگان مختلف ہوتا تھا۔

لگان کے علاوہ بھی اور کئی طرح کے محصول ہوتے تھے جیسے اِملاک ٹیکس، پیداوار پر بکری ٹیکس، پیشوں کا ٹیکس، فوجی اخراجات کے لیے ادائیگی (جنگ کے دوران)، شادی پر ٹیکس وغیرہ۔ سولھویں صدی کا سیاح نکیتن کہتا ہے: "زمین لوگوں سے بھری پُری ہے مگر دیہی علاقوں میں لوگ بہت پریشان اور بدحال ہیں جبکہ امراء عیش و عشرت میں مگن ہیں اور بے حد خوشحال ہیں۔"

وجے نگر حکومت میں تجارت اور زراعت دونوں پھلی پھولیں۔ جیسے جیسے دیہی 'اپنی حکومت' کا زوال ہوا تو ہر علاقے میں ایک طاقتور زمرہ ابھرا جس نے اپنی اس مضبوط حیثیت کو زیادہ اور بہتر آبپاشی کے ذرائع حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا اور زیادہ ادائیگی کر کے زراعت کو ترقی

دی۔ بہت سے مندر جنھیں لگان معاف گاؤں ملے ہوئے تھے، انھوں نے بھی اپنے ذرائع کو اِسی کام میں استعمال کیا۔

وجے نگر حکومت کے دور میں شہری زندگی کی نشو و نما ہوئی اور تجارت پھلی پھولی۔ مندروں کے ارد گرد کئی شہر اُبھر آئے۔ مندر بہت بڑے بڑے تھے اور یاتریوں کو 'پرسادم' کے لیے کھانے پینے کے سامان، دیوی دیوتاؤں کے لیے 'بھوگ' اور پجاریوں کی ضرورتوں کا سامان فراہم کرنا ضروری تھا۔ مندروں کے پاس بہت دولت تھی اور یہ ملک کی اندرونی اور بحری دونوں تجارتوں میں حصہ لیتے تھے۔

اس طرح، متواتر جنگوں کے سلسلے کے باوجود، چودھویں اور سولھویں صدی کے درمیان جنوبی ہندوستان میں تجارت اور مدنیت (شہری زندگی) میں ترقی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ زراعت بھی پھلی پھولی۔ اس کا اثر اس دور کی ثقافتی زندگی کی ترقی میں بھی محسوس ہوا۔

■■■

-11-

ہندوستان کے سمندری علاقوں پر پرتگالیوں کی گرفت اور اس کے معاشی اور سیاسی اثرات

1498 میں کالی کٹ کی بندرگاہ پر واسکوڈی گاما کے تین جہازوں کے، دو گجراتی پائلٹوں[1] کی رہنمائی میں، لنگرانداز ہونے کو عام طور پر دنیا کی تاریخ میں۔۔۔ خاص طور پر ایشیا اور یوروپ کے درمیان تعلقات کے سلسلے میں ایک نئے باب کی ابتدا کہا جاتا ہے۔ گو کہ ایشیا اور یوروپ کے بیوپاری رشتے نامعلوم قدیم عرصے سے چلے آرہے تھے لیکن دونوں کے درمیان براہِ راست بحری تعلق قائم ہو جانا نہ صرف ایک دیرینہ خواب کا پورا ہونا تھا۔ جیسا کہ یونانی مورخ ہیروڈوٹس بتاتا ہے، فونیقیوں نے لگ بھگ چھٹی صدی قبلِ مسیح میں ہی افریقہ کا چکر لگالیا تھا۔ یہ اِن دونوں علاقوں کے درمیان تجارت میں زبردست ترقی کی بھی خبر دے رہا تھا۔ بہر حال، یہ مقصد پرتگالیوں کے ذہن میں متعدد مقاصد میں سے صرف ایک تھا۔ پرتگالیوں کو احساس تھا کہ ہندوستان تک بحری راستہ کھل جانے سے مسلمان عرب اور ترکوں کو زبردست جھٹکا لگتا، جو عیسائیت کے دیرینہ دشمن تھے اور ترکوں کی فوجی اور بحری طاقت کے مضبوط ہونے سے یوروپ کے لیے ایک نیا خطرہ پیدا کر رہے تھے۔ ہندوستان سے ایک براہِ راست بحری سلسلہ اُس اجارے کو توڑ رہا تھا جو عرب اور ترک، مشرقی اشیاء خصوصاً مسالوں کی تجارت میں لگ بھگ مکمل طور پر حاصل کیے ہوئے تھے۔ اُنھیں ایک موہوم سی امید یہ بھی تھی کہ اُن کی افریقہ کی یہ تلاش یا واقفیت انھیں اُس روایتی راہب جون، بادشاہت سے جوڑ دے گی جس کے نتیجے میں یہ مسلمانوں پر دو سمتوں سے حملہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس طرح بیوپاری اور مذہبی مفادات ایک دوسرے کو مدد بھی دے رہے تھے اور جواز بھی فراہم کر رہے تھے۔

ہندوستان کے لیے بحری راستے کی تلاش کی ایک کوشش جینوا کی طرف سے رومی دور

(1) بعض مورخین نے پائلٹ کا نام عبدالماجد بتایا ہے لیکن عبدالماجد ایک مشہور عرب جغرافیہ داں تھا اور اس جہاز پر پائلٹ کے طور پر اس کے موجود ہونے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا اس کے علاوہ واسکوڈی گاما نے بھی اس کا نام نہیں لیا ہے۔

کے بعد بھی کی گئی تھی۔ 1291 میں ایک جینو آئی، اگو لینوڈی ویوالڈو، دو بادبانی (Galley) جہاز لے کر ہندوستان کا سمندری راستہ تلاش کرنے نکلا تھا، مگر اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ اس کے بعد اس مہم میں پرتگال نے پہل کی۔ 1418 سے پرتگال کا حکمراں ڈوم ہنریک جسے 'ہنری جہازراں' کہا جاتا تھا، ہر سال دو تین جہاز افریقہ کے مغربی ساحل کی تلاش اور چھان بین کے لیے بھیجتا تھا۔ 1443 اور 1482 کے درمیان، کانگو دریا کے دہانے تک پرتگال کے افریقہ پر قبضے سے، پرتگال کو ہاتھی دانت، غلاموں اور 'سونا ریت' کی تجارت کا موقع مل گیا تھا اور اُس کا لالچ اور بھوک اور بڑھ گئی تھی۔ افریقہ کی جنوبی نوک کا بحری راستے سے چکر لگا کر میگالن نے ہندوستان کا بحری راستہ کھول دیا۔ لیکن اس کام کو دس سال بعد واسکوڈی گاما نے پورا کیا۔

شروع میں ہی یہ بات صاف کر دینی ضروری ہے کہ یوروپیوں کے اپنے کچھ مقاصد تھے اور ہندوستان کے لیے اُن کی بحری راستے کی کھوج اس لیے نہیں تھی کہ عرب اور تُرک یوروپ سے مشرقی اشیاء کی تجارت میں کسی طرح رکاوٹ پیدا کرتے تھے یا اُن سے کچھ زیادہ یا اضافی محصول (ایکسائز) وصول کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے عروج کے بعد سے عرب، دنیا کے سب سے اہم تاجر کے روپ میں اُبھر آئے تھے اور دور دراز کے سفروں میں انھیں زیادہ خصوصیت اور مہارت حاصل تھی۔ اِن کے تاجروں کے جہاز رانوں اور جغرافیہ دانوں نے بحرِ روم اور ایشیا کے درمیان تجارت کے سلسلے کو پہلے سے بہت زیادہ قریب کر دیا تھا اور ایشیا میں مغربی ایشیا، ہندوستان، مشرقی افریقہ جنوب مشرقی ایشیا اور چین کے درمیان تجارت بہت تیز اور زیادہ ہو گئی تھی۔

اِسی طرح ترک بھی تجارت سے کسی قسم کی بددِلی یا ذہنی رکاوٹ محسوس نہیں کرتے تھے، مشرقی (اورینٹ) تجارت خلیج فارس سے شروع ہو کر ہُرمُز اور بصرہ کے راستے بحرِ روم کے مشرقی حصے لیوانٹ تک ہوتی تھی اور بحر احمر سے شروع ہو کر جدہ سے قاہرہ ہوتی ہوئی مصر میں اسکندریہ تک اس کا سلسلہ چلتا تھا۔ بحر اسود کی بندرگاہوں تک پہنچنے کے لیے برّی (زمینی) راستے بھی تھے۔ ظاہر ہے عرب اور ترک حکمرانوں کے لیے تجارتی اشیاء پر درآمد محصول (کسٹم ڈیوٹی) منافع حاصل کرنے کا ایک قابلِ قدر ذریعہ تھا۔ اس لیے وہ اس تجارت کی حفاظت اور اس کی بہتری کے بہر صورت خواہشمند ہوں گے۔ 'بے دینوں' یعنی مسلمانوں سے تجارت پر پوپ کی لگائی ہوئی

پابندی کے باوجود جینوآ اور وینس کے تاجر مشرقی اشیاء کی تجارت کے سلسلے میں برابر مصروف رہے۔ حقیقت میں وینس کے تاجر مصر اور لیوانٹ سے مشرقی اشیاء خرید کر یوروپ میں بیچنے کا اجارہ رکھتے تھے۔ حالانکہ وینس کے لوگوں اور ترکوں میں بہت طویل اور سخت بحری جنگیں ہوئی تھیں مگر اِن میں سے کوئی بھی فریق اس حد تک آگے نہیں بڑھا تھا کہ اس سے کسی کی تجارت کو نقصان پہنچے۔ اس طرح یہ ایک دوسرے کے 'امدادی دشمن' کہے جاسکتے تھے۔ یوروپ میں وینس کے تاجروں کے بنیادی حریف جینوآ کے تاجر تھے۔ جینوآ کے تاجر بھی یوروپ میں مشرقی اشیاء پہنچاتے تھے مگر وینس کے تاجروں نے انھیں پیچھے دھکیل دیا تھا۔ ترکوں کا 1453 میں قسطنطنیہ پر قبضہ جینوآ کے تاجروں کے لیے بڑا شدید جھٹکا تھا کیونکہ بحر اسود کی بندرگاہیں، جو مشرقی اشیاء کا سب سے اہم بازار تھیں، رفتہ رفتہ ان تاجروں کے لیے بند ہوتی چلی گئیں۔ یہ صورتِ حال، اور وینس سے اُن کی دیرینہ رقابت ہی اس کا بنیادی سبب بنیں کہ جینوآ نے ہندوستان کا بحری راستہ تلاش کرنے میں اپنے جہاز رانوں، دولت اور اپنی بحری مہارت سے پرتگال اور اسپین کی بھرپور مدد فراہم کی۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں، کرسٹوفر کولمبس جس نے ہندوستان کا بحری راستہ تلاش کرنے کی کوشش میں 1492 میں امریکہ 'دریافت' کیا (یا بازیافت کیا، کیونکہ نورسمین اور ریڈ انڈینس وہاں پہلے ہی پہنچ چکے تھے) جینوآ کا ہی باشندہ تھا۔ ہندوستان کے لیے بحری راستے کی تلاش کی دلچسپی میں یوروپ کے نشاۃِ ثانیہ نے بھی ترغیب فراہم کی چونکہ اس نے دیرینہ اور فرسودہ تصورات کو چنوتی دی تھی اور جرأت و ہمت کی ایک نئی روح پیدا کی تھی۔ اس کے پس منظر میں گیارھویں صدی کے بعد ہوئی اقتصادی ترقی بھی کارفرما تھی۔ جدید تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ خوشحالی اور عام ترقی کے ساتھ یوروپ کے لوگوں کی غذائی عادات اور طریقوں میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی تھی اور گوشت کا استعمال بڑھا تھا۔ چارے کی قلّت کی وجہ سے سردیوں میں یوروپ میں بڑی تعداد میں مویشی کاٹے جاتے تھے اور اُن کا گوشت نمک لگا کر محفوظ کیا جاتا تھا۔ اِس نمک لگے گوشت کو بہتر اور زیادہ لذیذ کرنے کے لیے مشرقی مسالوں کی مانگ اب بڑھ رہی تھی۔

مشرق سے تجارت میں جینوآ کے تاجروں کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا اظہار تیرھویں صدی کے بعد بحر ہند میں اِن کی زیادہ موجودگی سے ہوتا ہے۔ وینس کے نکولو کونٹی اور باربوسا اور

روسی نکیتین اُن لوگوں میں سے صرف چند نام ہیں جو بحر ہند میں سفر کر کے اس دور میں ہندوستان پہنچے۔ ہندوستان کے لیے کسی بحری راستے کی تلاش میں پوپ کی دلچسپی اس وقت نظر آئی جب 1453 میں اس نے پرتگال کو اُن تمام علاقوں کے "دائمی" (قبضے) کا ایک فرمان جاری کر دیا جو پرتگال افریقہ کے راس امید سے آگے "ہندوستان تک "دریافت" کر لے، بشرطیکہ وہ اُن علاقوں کے "کافروں" کو عیسائی بنا لے۔ غور کیا جائے تو اس سے اس حقیقت کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اس اُبھرتے ہوئے بہترین کاروبار میں دوسری عیسائی طاقتوں کو الگ تھلگ یا مستثنا کیا جا رہا تھا۔

(i) پرتگالیوں کی آمد سے پہلے ایشیا میں بحری تجارت کا پھیلاؤ:

ہندوستانی اور ایشیائی تجارت اور اقتصادیات پر پُرتگالیوں کے اثر کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے، پرتگالیوں کی آمد سے پہلے ایشیائی بحری تجارت کی ماہیت، پھیلاؤ، اس کی ساخت وغیرہ کو مختصراً سمجھ لینا ضروری ہے۔ یہ اس لیے خاص طور پر بہت ضروری ہے کہ یوروپی نوآبادیاتی تسلط کے دوران ایشیا کی تجارت اور اقتصادیات، اور اِن میں یوروپی تاجروں کے کردار کے بارے میں بہت سے بے بنیاد اور غلط تصورات پھیلائے گئے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے میں ایشیائی اور یوروپی محققین کی تحقیق کی روشنی میں ان میں سے بہت سے تصورات کو یا تو بالکل مسترد کیا جانا چاہیے یا کم سے کم اِن میں کچھ ترمیم کی جانی چاہیے۔ نوآبادیاتی دور کے خاتمے پر ابھرنے والے کچھ نئے نظریات اور تصورات کے تحت خود ان کی تحقیقات میں بھی کسی قدر تجدید یا ترمیم ہوئی ہے۔ ان جدید تحقیقات پر ان علاقوں کی اقتصادی ترقی، ان کی اپنی اصلی جڑیں تلاش کر لینے کی کوشش، اور نوآبادیوں کے آپسی رشتوں نے بھی اثر ڈالا ہے۔

سب سے پہلا اور سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اِن نئی تحقیقات نے یہ ظاہر کیا ہے کہ مغرب میں جدید صنعتی سرمایہ داری دور سے پہلے ایشیا اور یوروپ کی اپنی داخلی تجارت یا بیوپاری ساخت میں کوئی بنیادی فرق نہیں تھا۔ چنانچہ ایشیا اور یوروپ دونوں جگہوں کے تاجر اُن بازاروں کے بارے میں پوری جانکاری حاصل کر لینا چاہتے تھے جہاں وہ اپنا کاروبار چلاتے تھے۔ ایشیا کے بڑے تاجر اپنے طرزِ فکر میں حیرت ناک حد تک لچک رکھتے تھے۔ وہ ہر اس چیز کی تجارت کرنے کے لیے تیار تھے جس سے اچھے منافع کی امید کی جا سکتی تھی۔ اس کی وجہ سے تجارت میں آج جیسی

تخصیص (اسپیشلائزیشن) بہت کم تھی لیکن تھوک کے بیوپاریوں اور خردہ بیوپاریوں میں فرق بالکل واضح تھا۔ بڑے تاجر جو بڑی منڈیوں یا دور دراز علاقوں کی تجارت میں بہت زیادہ متحرک تھے وہ داخلی اور بیرونی دونوں قسم کی تجارتوں میں حصہ لے سکتے تھے۔ یہ بینک کار، ساہوکار، اور انشیورنس ایجنٹ، کچھ بھی ہو سکتے تھے۔ ان میں سے کچھ کے پاس خود اپنے جہاز بھی تھے، گو کہ زمینی تجارت اور بحری تجارت دونوں میں اشیاء کی نقل و حمل (لانا لے جانا) ایک علیحدہ پیشہ بھی تھا۔ مختلف علاقوں اور مختلف بندرگاہوں کے درمیان تجارت کا ایک بالکل مقررہ اور پختہ انداز بن گیا تھا، جو ہواؤں کی سمت و رفتار، بحری لہروں اور فاصلوں پر مبنی تھا۔ اس طرح بحر احمر اور خلیج فارس سے شروع ہوئے سفر گجرات یا مالابار کی بندرگاہوں سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ شمال مشرق کی بندرگاہوں کے لیے تجارتی سامان گجرات، کورومنڈل اور مالابار کی بندرگاہوں سے بھیجا جاتا تھا۔ چین کے جہاز اور چینی جنک (چپٹے تلے کا بادبانی جہاز) اور بڑے بڑے سمندروں میں سفر کرنے والے جہاز پہلے بھی مالابار آچکے تھے۔ لیکن مِنگ خاندان کے حکمرانوں کی عائد کردہ غیر ملکی تجارت پر روک کے بعد چینی تاجر جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔

اتنے دور دراز فاصلوں کے بحری سفروں کے لیے جہازرانی کی اچھی صلاحیت اور مہارت اور تجربہ بھی بہت ضروری تھا جس میں ایشیائی جہازراں۔ عرب، ہندوستانی، ملائی اور چینی ملاح- کسی سے کم نہیں تھے۔ جہازوں کے کپتانوں (ناخداؤں) کا بڑا اعلیٰ رتبہ تھا۔ انھیں بہت اونچی تنخواہیں ملتی تھیں اور اُن چیزوں کے منافع میں جو وہ لاتے لے جاتے تھے اِن کا بھی کچھ حصہ ہوتا تھا۔ جہاز بہت سے چھوٹے تاجروں کو بھی اپنے ساتھ لگائے رہتے تھے جن کے لیے 'پھیری والے' (پیڈلرس) کا لفظ مناسب طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال بڑے تاجر اس زمرے میں شمار نہیں کیے جاتے تھے۔ ظاہر ہے یہ اپنے تجارتی مرکز پر ہی مقیم رہتے تھے۔ اپنے بیوپاری کاموں کو آگے بڑھانے میں ایشیائی تاجر بھی، یوروپی تاجروں کی طرح خاندانی اثر و رسوخ، فرقے واری تعلق و مفادات پر مبنی ایسوسی ایشنوں اور علاقائی تعلقات وغیرہ کا سہارا لیتے تھے۔ چنانچہ ہمیں 'کریمی' نام کے تاجروں کی ایسوسی ایشن کا ذکر ملتا ہے جو یمن کے علاقے عدن میں قائم تھی اور اس کی کارگزاری کا دائرہ چین تک پھیلا ہوا تھا۔ برما کے تاجروں کی اپنی ایک الگ ایسوسی ایشن تھی، اِسی

طرح ہندوستانیوں کی بھی تھی۔ چنانچہ جنوبی ہند کے تاجروں کی انجمن یا ایسوسی ایشن 'منی رام' نام کی تھی جو طویل عرصے تک داخلی اور بیرونی تجارت میں برسرکار رہی۔

ہمارے پاس ایشیا کے بڑے دولتمند تاجر خاندانوں کے متعلق معلومات زیادہ نہیں ہیں، چونکہ یہ ریکارڈس کبھی قومی آرکائیوز تک نہیں پہنچ پاتے۔ پھر بھی کچھ دولتمند تاجروں کا ذکر سننے میں آتا ہے جیسے ایران کے 'رامِسٹ' جنھوں نے لگ بھگ 1100 عیسوی میں بیوپاری کام کو عدن سے ہندوستان اور چین تک منظم کیا؛ یا جمال الدین ابراہیم تیپے نے تیرھویں صدی کے دوران سو جہازوں کا ایک بیڑا تیار کیا جو جنوبی ہندوستان اور مشرقِ بعید تک سفر کرتا تھا۔ گجرات میں وستوپال اور تیج پال کے نام بھی کافی مشہور ہیں۔ تامل ناڈو اور بنگال میں 'چیٹی' اور مالابار میں 'مار کار' میں بہت دولتمند تاجر تھے۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ اس دور میں ایشیا کی تجارت یوروپ کی تجارت سے بہت زیادہ تھی، آج کے کچھ مورخین کا اندازہ ہے کہ یہ یوروپ کی تجارت کا دس گنا تھی۔ اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ اس وقت دنیا کے کچھ سب سے دولت مند تاجر ایشیا کے ہی تھے۔ پھر بھی ایک عرصے تک کچھ یوروپی مورخ انھیں 'پھیری والے' (پیڈلرس) کہتے رہے اور اسے خود ہمارے مورخین تسلیم بھی کرتے رہے۔ بہرحال، یہ 'شاہِ تجار' قسم کے تاجر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے، جو چیز اہم ہے وہ فی الحقیقت ایشیا میں تجارت کی مقدار ہے یا یہ بات کہ تجارت کا سلسلہ ایشیا کے کن کن فرقوں میں پھیلا ہوا تھا، ان کے بیوپاری کاموں میں کتنا تنوع اور وسعت تھی، اُن کی بیوپاری صلاحیت کتنی مضبوط اور یقینی تھی، اور اُن کے مالی اور بحری ذرائع کتنے مستحکم اور قابلِ اعتماد تھے، اور یہ بھی کہ یوروپی تاجروں کے بالکل برخلاف ایشیائی تاجر سیاسی یا فوجی اعتبار سے اپنی حکومتوں پر بالکل انحصار نہیں رکھتے تھے۔ ایک اور غلط تصور جو اس سلسلے میں پیدا کیا گیا وہ یہ تھا کہ مشرقی تجارت تو صرف "شاندار غیر اہم قسم کی چیزوں" یعنی عیش و آرام کی اشیاء میں محدود تھی۔ یہ بات یوروپ سے تجارت کے لیے تو صحیح ہو سکتی ہے کیونکہ وہ خاص طور پر چین سے ریشم اور عقیق، مسالوں والے جزیروں اور ہندوستان سے مسالے، اور مشرقِ وسطیٰ سے کچھ اقسام کے کپڑے درآمد کرتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بحرِ ہند کے علاقے میں جن چیزوں کا لین دین ہوتا تھا اُن میں عیش و آرام کی اشیاء جیسے مسالے، گھوڑے، ریشم، چینی مٹی کے برتن، عود و لوبان، ہاتھی

دانت، شیشہ، زیورات اور تراشے ہوئے قیمتی پتھر اور غلام وغیرہ کے ساتھ ضروریاتِ زندگی کی اشیاء جیسے نمک، شکر، اناج اور کپڑے بھی شامل تھے۔ ضروریات زندگی کے اشیاء کی تجارت اس لیے بھی ضروری تھی کہ جنوب مشرقی ایشیا کے جزیرے جیسے علاقوں میں چاول اور کپڑے کی پیداوار بہت محدود تھی۔ نمک، شکر اور غلے کی ضرورت مشرقِ وسطیٰ میں تھی۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ آج کے جدید جہازوں سے پہلے کے تجارتی جہاز اس وقت تک بحری سفر کر ہی نہیں سکتے تھے جب تک اُن میں کم قیمت مگر وزنی سامان ایسا موجود نہ ہو جسے جہاز کو متوازن رکھنے کے لیے اس کے پیندے میں بھرا جا سکے۔ چنانچہ جو چیزیں ہندوستان یا چین لائی جاتی تھیں اُن میں بھاری چیزیں، جیسے کھجور، شکر، عمارتی سامان اور لکڑی بھی شامل ہوتی تھیں۔ جغرافیہ اور موسمی عام حالات بھی اشیاء کے نقل و حمل اور تجارت کی سمتوں کو متعین کرتے تھے۔ اس طرح مشرق وسطیٰ سے آنے والے جہاز ہندوستانی بندرگاہوں پر مانسون شروع ہونے سے پہلے پہنچتے تھے۔ یہاں اشیاء کا جہازوں میں پھیر بدل ہوتا تھا اور دوسرے جہازوں میں بھر کر انھیں جنوب مشرقی ملکوں اور چین کی طرف روانہ کیا جاتا تھا۔ جہازوں میں اشیاء کے پھیر بدل کے لیے ملاّ کا ایک دوسرا اہم مقام تھا۔ چینی جاوا سماترا سے آگے نہیں بڑھتے تھے لیکن ہندوستانی اور عرب چین تک پہنچ کر تجارت کرتے تھے۔ اس طرح تجارت میں اشیاء کی اقسام کی وسعت اور ان اشیاء کی مقدار دونوں جدید دنیا سے پہلے کے حالات میں کافی اہم کہی جا سکتی ہیں۔

ایک تیسری غلط بیانی یہ ہے کہ ایشیائی جہاز کھلے سمندر میں لمبے سفر نہیں کر سکتے تھے چونکہ ان کے جہاز نازک ہوتے تھے اور ایشیائی ملاحوں کے پاس سمندری سفر کی ضروری صلاحیتیں یا تکنیک موجود نہیں تھیں۔ آج کی تحقیقات سے اظہار ہوتا ہے کہ یہ تصورات بالکل بے بنیاد تھے۔ یہ ہندوستانی ہی تھے جنھوں نے گجرات سے عدن تک کے بحری سفر، اور بحر ہند میں جنوب مشرقی ایشیا اور مشرقی افریقہ تک سفر شروع کیے تھے۔ چنانچہ جب واسکوڈی گاما نے مشرقی افریقہ میں مالندی سے کالی کٹ کا سفر کیا تو اُسے وہاں چار ہندوستانی نظر آئے۔ پرتگالی کو ولہان عرب جہازوں پر سفر پہلے ہی کر چکا تھا جس راستے پر بعد میں واسکوڈی گاما گزرا۔ یہ بھی دکھایا جا چکا ہے کہ نازک بادبانی کشتیاں بھی سمندری لہروں (کرنٹس) کے سہارے مالے جزیرہ نما سے ماریشس تک سفر

سے ناپسندیدہ تھے اور وہاں اپنا اقتدار جمانے میں دشواری محسوس کرتے تھے۔ یہ اور سلجوقی اور ماوراء النہر کے ترک قبیلوں سے متواتر ٹکراؤ ایسے عوامل تھے، جنہوں نے غوریوں کو ہندوستان کی طرف آنے پر مجبور کر دیا۔

1163 میں غیاث الدین محمد غور میں تخت نشین ہوا۔ ترکی قبائلی روایت کے تحت اس نے اپنے چھوٹے بھائی معزالدین محمد کو غزنی کا حکمراں بنا دیا۔ اس تقسیم نے ایک بھائی معزالدین کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنی تمام تر طاقت ہندوستان کو فتح کرنے میں صرف کر سکے اور بڑے بھائی غیاث الدین محمد نے اپنی توجہ مغربی اور وسطی ایشیا کی پریشانیوں پر مرکوز کر دی۔

اسی دوران شمالی ہندوستان میں چوہان ایک طرف گجرات اور دوسری طرف دہلی اور متھرا کی طرف اپنے اقتدار کو وسعت دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ویسے انہیں محمود غزنوی کے جانشینوں کے حملوں کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ ممتاز چوہان حکمراں شاید وگراہ راج تھا جس نے چتوڑ فتح کیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس نے 1151 میں تومر حکمرانوں سے دہلی جیت لی تھی اور اپنا اثر شوالک تک پھیلا لیا تھا یعنی وہ پہاڑی سلسلہ جو دہلی سے ہانسی تک پھیلا ہوا ہے اور جس پر تومر اور غزنویوں کے درمیان ہمیشہ تنازعہ رہتا تھا، اگرچہ بعد میں تومروں کو جاگیرداروں کی حیثیت سے حکومت کرتے رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وگراہ راج شاعروں اور دانش وروں کی سرپرستی کیا کرتا تھا۔ خود اس نے سنسکرت میں ایک ڈرامہ لکھا تھا۔ اس نے بہت سے عالیشان مندر تعمیر کروائے تھے جن میں اجمیر کا سنسکرت کالج اور اَناساگر نام کی جھیل بھی شامل ہے۔

چوہان حکمرانوں میں سب سے مشہور حکمراں پرتھوی راج سوئم تھا جو 1177 میں گیارہ سال کی عمر میں اجمیر کے تخت پر بٹھایا گیا تھا۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ سولہ سال کی عمر میں اس نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور فوراً ہی اس نے راجستھان کی چھوٹی ریاستوں کو اپنی ریاست میں شامل کرنے کی پالیسی پر زور شور کے ساتھ عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں اس کا سب سے مشہور کارنامہ کھجوراہو اور مہوبا کے چندیلوں پر حملہ تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اس علاقے میں چندیلا سب سے مضبوط ریاست کے مالک تھے اور غزنویوں کے خلاف ان کی مزاحمت کی ایک لمبی داستان رہی ہے۔ جس لڑائی میں مشہور سپاہی آلہا اور اودل مہوبا کی حفاظت

کرلیتی تھیں۔ بہر طور، یہ چیز تجارت کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

اس بات کو بھی بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں جہازوں میں کیلیں ٹھوک کر تیار کرنے کے بجائے سلائی سے تیار کرنے کا طریقہ رائج تھا۔ عرب جغرافیہ دانوں کے مطابق جہازوں میں کیلیں ٹھوکنے کا طریقہ دسویں صدی میں خلیج فارس کے علاقے میں شروع ہوا۔ بہر حال، سلے ہوئے جہاز اس کے بعد بھی استعمال ہوتے رہے کیونکہ ان میں زیادہ لچک یا لوچ ہوتا تھا اور ان کی مرمت کا کام بھی نسبتاً آسان تھا۔ خلیج فارس کے اتھلے مگر تیز رفتار پانی میں اس سے فائدہ ہوتا تھا۔ پرتگال کے گاسپر کوریا نے سولھویں صدی کے ابتدائی حصے میں اپنی تحریر میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ہندوستان کے سمندر میں ٹھکے اور سلے دونوں طرح کے جہاز چلتے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ سلے ہوئے جہاز ”اتنے ہی محفوظ رہتے ہیں جتنے ٹھکے ہوئے۔ کچھ دوسرے جہاز بھی جن کے تختے چوڑے سروں والی باریک کیلوں سے جڑے جاتے ہیں۔“ شاید ٹھکے ہوئے جہاز کھلے سمندروں میں سفر کرتے تھے۔

یہ جہاز اپنی جسامت کے اعتبار سے بھی چھوٹے نہیں کہے جا سکتے تھے۔ جب تک پرتگالی وہاں پہنچے ہیں اس علاقے میں کشتیاں 300 اور 400 ٹن سامان ڈھو رہی تھیں اور ان پر کئی بادبان ہوتے تھے۔ ظاہر ہے اُس دور میں اتنے ٹن سامان ڈھونا معمولی بات نہیں تھی۔ حالانکہ چینی 'جنک' (جہاز) جو کئی منزلہ اونچے ہوتے تھے اس دور کے سب سے ترقی یافتہ جہاز ہوتے تھے۔ ہندوستان میں جو جہاز استعمال ہوتے تھے وہ عربی 'بوم' (بادبانی جہاز) جیسے ہوتے تھے۔ اور چونکہ عرب یا ایران میں جہازوں کے لیے لکڑی موجود نہیں تھی اس لیے یہ زیادہ تر گجرات اور مالابار کے علاقے میں ہی بنتے تھے۔ اس طرح ہندوستانی اور عربی جہاز سازی صنعت کی ترقی پر ایک دوسرے کا اثر رہا اور ان کے تجارتی جہاز یوروپی جہازوں سے کسی طرح کمتر یا گھٹیا نہیں تھے۔ پھر جہاں تک بحری سفر کی تکنیک کا سوال ہے چینیوں کے پاس 'ملاحی قطب نما' (میرینرس کمپاس) دسویں صدی سے موجود تھا، مگر یہ بہت وسیع پیمانے پر استعمال نہیں ہوتا تھا۔ عرب اور ہندوستانی ملاح کھلے سمندر میں اپنا مقام ستاروں سے متعین کرتے تھے اور اس سلسلے میں کمپاس کارڈ۔ کمل یا کنول' azimuthal (side-real rose سمت الراسی گلاب) استعمال کرتے تھے۔ بہر حال 'ملاحی قطب نما' شاہی غیر

سند یافتہ راستوں پر جہاز رانی میں بہت کام آتا تھا۔

وہ تاجر جو ایشیا کی سمندری تجارت کو سمندری راستوں سے کرتے تھے، وہ اُن تمام دستوروں اور روایتوں کی سختی سے پابندی کرتے تھے جو رفتہ رفتہ اس علاقے میں طے پا چکی تھیں۔ ان تاجروں میں صرف عرب اور ایرانی ہی نہیں، یہودی، آرمینیائی اور جینو آئی تک ہوتے تھے۔ گجراتی تاجروں اور تامل کے چیٹیوں کے علاوہ جاوا کے تاجر بھی بحری تجارت میں پورے انہماک سے حصہ لیتے تھے۔ ان تاجروں کے جان و مال کی حفاظت ہر علاقے کے حکمراں کرتے تھے اور کچھ بالکل واضح اور طے شدہ بیوپاری قوانین کی پوری پوری پابندی کی جاتی تھی۔ درآمدی محصول عام طور پر مناسب حدوں میں رکھے جاتے تھے۔ گو کہ کبھی کبھی دستور و روایات (کنونشن) کی خلاف ورزی بھی ہو جاتی تھی، مگر ان سے خود اس ملک کو ہی نقصان پہنچتا تھا کیونکہ تجارت میں بہت مقابلہ تھا اور اس صورت میں تاجر اپنا کاروبار وہاں سے ہٹا کر کسی دوسرے علاقے میں لے جاتے تھے۔ دستور کے مطابق حکمراں تجارت پر محصول تو عائد کرتے تھے مگر سمندروں میں اپنا حکم نہیں چلاتے تھے، نہ زمین یا سمندر پر فوجی مداخلت کر کے اپنی تجارت کی توسیع یا غیر معمولی تحفظات دیتے تھے، حالانکہ زمین پر اپنی فوجی مہموں میں وہ اپنے بیوپاری مفادات کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔

ایشیائی جہاز جتنا بھی اسلحہ رکھتے تھے وہ صرف سپاہیوں اور 'ہوائی بان' (راکٹوں) سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا تھا جسے عمان اور جنوب مشرقی ایشیا اور چین کے علاقوں میں موجود بحری قزاقوں سے تحفظ کے لیے ساتھ رکھا جاتا تھا۔ اس روایت سے استثنایا خلاف ورزی خاص طور پر دو صورتوں میں نظر آتی ہے۔ ایک جب چودھویں صدی میں چولا حکمرانوں نے جاوا۔ سماترا کے خلاف بحری مہم بھیجی تھی اور دوسرے جب 1417 سے 1433 کے درمیان چین کے ایڈمیرل چینگ ہونے ایک بہت بڑے بیڑے کے ساتھ، جس میں راکٹ اور ہزاروں سپاہی سوار تھے، مشرقی افریقہ اور جدہ تک سات بحری مہمیں انجام دی تھیں۔ حالانکہ ان جہازوں نے کچھ تجارت بھی کی تھی مگر ان کا بنیادی مقصد چینی طاقت کا مظاہرہ اور اس سارے علاقے کی حکومتوں میں چین سے تجارت کے لیے زیادہ جھکاؤ پیدا کرنا اور چین کے کلچر اور دباؤ کا سکہ بٹھانا تھا۔ مگر ان داخلی وجوہات کے تحت چینیوں نے نہ صرف اس قسم کی مہموں کا سلسلہ منقطع کیا بلکہ پوری غیر ملکی تجارت پر ہی پابندی عائد

کر دی۔ ان دو مثالوں سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اگر حالات مختلف ہوتے تو مسلح جہازوں کی حفاظت کے ساتھ بحری تجارت کی روایت ایشیا میں بھی قائم ہو سکتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، اور ان چینی مہموں نے اتنا کم اثر چھوڑا کہ جن جن ملکوں میں یہ مہمیں پہنچیں بھی وہاں کے مبصرین نے بھی اُن کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

ان تمام وجوہات کی بنا پر بحر ہند کی تاریخ میں چودھویں اور پندرھویں صدی کا دور غیر معمولی طور پر خوشحالی کا دور رہا۔ حالانکہ پندرھویں صدی کے دوسرے نصف حصے تک چینی دربار کے حکم کے تحت چینی تاجروں نے تجارت روک لی تھی اور یمن کے کریمی تاجروں اور یہودیوں نے بھی اپنا بیوپار بند کر دیا تھا، لیکن شاید عرب تاجروں کے مقابلے میں موجود ہوتے ہوئے، اس دور میں "بیوپاری خلاء" پیدا نہیں ہوا تھا، جیسا کہ کچھ تاریخ دانوں کا خیال ہے۔ مغربی بحر ہند کی تجارت میں کوئی عرب اجارہ بھی نہیں تھا،ہاں اس علاقے میں دور دراز کے علاقوں سے تجارت کرنے والوں میں عرب تاجر ہی سب سے دولتمند اور طاقتور ضرور تھے۔

یہی تمام اسباب اس صورت حال کی وضاحت کرتے ہیں کہ پرتگالی، جو ایشیائی اشیاء کی یوروپی تجارت پر قبضہ کرنے آئے تھے وہ ایشیا سے پار علاقے کی تجارت کو اپنی طاقت کے بل پر اپنی گرفت میں نہ لے سکے۔

(ii) پرتگال کا 'ایسٹاڈو ڈا انڈیا':

واسکوڈی گاما کا کالی کٹ کی زمین پر اترتے وقت زامورن نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا اور اُسے مسالوں کی تجارت اور ساحل پر ایک فیکٹری (گودام) بنانے کی اجازت دی۔ جو مسالے وہ یہاں سے لے کر گیا اس کی قیمت کا تخمینہ اس کے پورے سفر پر آئی لاگت کا ساٹھ گنا لگایا گیا ہے۔ مگر اس سے بھی پرتگالی حکمراں مطمئن نہیں ہوا۔ پرتگالی اصل میں یوروپ سے ہونے والی مسالوں کی پوری تجارت پر اجارہ چاہتے تھے اور عرب تاجروں کے جہازوں کی تلاشی کا بھی حق حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس پر لڑائی ہوئی اور اس گودام میں جو پرتگالی رہتے تھے انھیں قتل کر دیا گیا۔ اس کے جواب میں پرتگالی جہازوں نے واپسی کے وقت کالی کٹ پر بمباری کی۔ 1502 میں واسکوڈی گاما 25 جہازوں کے بیڑے کے ساتھ واپس آیا اور مانگ کی کہ زامورن تمام مسلمان

تاجروں کو جو کالی کٹ میں مقیم ہیں، نکال باہر کرے اور آئندہ کسی مسلمان تاجر کو اپنی کسی بندرگاہ پر نہ اترنے دے، نہ اُن سے کسی قسم کے تجارتی تعلقات قائم رکھے۔ زامورن نے ان مانگوں کو یہ کہہ کر نامنظور کر دیا کہ کالی کٹ کی بندرگاہ ہر شخص کے لیے کھلی ہوئی ہے اور یہ بات ناممکن ہوگی کہ کسی کو یہاں تجارت سے روکا جائے خواہ وہ مسلمان ہو یا کوئی بھی ہو۔ گامانے اس کا جواب کالی کٹ پر ایک شدید حملہ کے ردپ میں دیا۔ اور اس کے بعد مالابار کی تجارت پر بالادستی رکھنے کے لیے پرتگالیوں نے کوچین، کوئیلون وغیرہ کے ساحل پر بہت سے قلعے بنا لیے۔

اس سلسلے میں اصل میں جو مسئلہ اُبھر رہا تھا وہ مختلف فلسفوں یا اندازِ فکر کا تھا کہ تجارت اور حکومت کے درمیان کیا رشتہ ہونا چاہیے۔ ایشیائی دستور کھلی تجارت کا تھا۔ اس میں تجارت کو حکومت کی حمایت اور پشت پناہی تو حاصل ہوتی ہے لیکن اسے بڑھانے یا اس کے تحفظ کے لیے بحری فوج کی طاقت استعمال نہیں کی جاتی۔ چین میں بھی صورتِ حال یہی تھی جہاں دربار نے ہمیشہ بیرونی تجارت پر پوری گرفت رکھی تھی اور درآمد ہونے والی اشیاء کو "خراج" تصور کیا تھا۔ دوسری طرف بحرِ روم کے علاقے (میڈیٹرینین) کی روایت، جو پرتگالی اپنے ساتھ لائے تھے اس میں تجارت بری اور بحری جنگ کا ایک مجموعہ تھی۔ یہ طرزِ فکر ایشیائی تاجروں کے لیے بھی اور اس علاقے کی اُن چھوٹی چھوٹی ریاستوں۔ کالی کٹ، کوچین وغیرہ کے لیے بھی بے حد پریشان کن تھا جو یوروپ کی کچھ شہری ریاستوں کی طرح زیادہ تر تجارت کی بنیاد پر ہی زندہ تھیں لیکن وہ کھلی تجارت کا دستور اپنائے ہوئے تھیں جس میں بری یا بحری فوج استعمال نہیں ہوتی۔

پرتگالیوں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت سے مصر کا سلطان بھی چونکا اور اس نے ایک بیڑا تیار کروا کر ہندوستان کی طرف بھیجا۔ اس بیڑے کے ساتھ گجرات کے حکمراں نے بھی کچھ جہاز شامل کیے۔ کالی کٹ کے زامورن نے اور اس کے ساتھ بیجاپور اور احمد نگر نے بھی ان کی کچھ مدد کی۔ کچھ ابتدائی فتح کے بعد، جس میں پرتگال کے گورنر کا بیٹا ڈان المیڈا مارا گیا اس متحدہ بیڑے کو 1509 میں پرتگالیوں نے بری طرح شکست دے دی۔ اس بحری فتح کے بعد پرتگالیوں کی بحری طاقت عارضی طور پر بحرِ ہند میں سب سے مضبوط ہو گئی جس نے پرتگالیوں کو خلیج فارس اور بحرِ احمر کی طرف اپنی کارگزاریوں کو بڑھانے کا موقع دے دیا۔

اس کے کچھ ہی عرصے بعد مشرق کے مقبوضہ علاقوں کا گورنر البقرق مقرر ہوا۔ اس نے ایشیا اور افریقہ کے کچھ خاص اور فوجی اعتبار سے کانٹے کی جگہوں پر قلعے قائم کر کے پورے مشرقی بیوپار پر گرفت رکھنے کی پالیسی بنائی اور اس پر عمل شروع کیا۔ ظاہر ہے اسے ایک مضبوط بحری فوج کے ذریعے ہی عمل میں لایا جاسکتا تھا۔ اپنے نظریے کی حمایت میں اس نے لکھا: "صرف نیوی کی بنیاد پر قائم کوئی ڈومینین (ریاست) باقی نہیں رہ سکتی۔" اگر قلعے نہ ہوں تو "یہ (حکمراں) نہ آپ سے تجارت کریں گے اور نہ آپ سے دوستانہ سلوک رکھیں گے۔"

البقرق نے اس نئی پالیسی کی ابتدا 1510 میں بیجاپور سے چھین کر گوا پر قبضہ کر کے کی۔ گوا کا جزیرہ بہترین قدرتی بندرگاہ اور قلعہ تھا۔ یہ فوجی اعتبار سے بھی بڑے کانٹے کی جگہ پر واقع تھا اور یہاں سے پرتگالی مالابار کی تجارت پر بھی گرفت رکھ سکتے تھے اور دکن کے حکمرانوں کی کارگزاریوں پر بھی نگاہ رکھ سکتے تھے۔ یہ گجرات کی بندرگاہوں سے بھی اتنا قریب تو تھا ہی کہ پرتگالی یہیں سے اُن علاقوں میں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہیں۔ اس طرح گوا مشرق میں پرتگالیوں کی بیوپاری اور سیاسی کارگزاریوں کے لیے بڑا مناسب مرکز تھا۔ پرتگالیوں نے جلدی ہی جزیرے کے سامنے ملک کی بنیادی زمین کے ٹکڑوں پر بھی اپنا قبضہ بڑھا دیا اور بیجاپور کی بندرگاہوں ڈنڈا راجوری اور ڈابھول کی تجارت میں رکاوٹ پیدا کر دی اور ان بندرگاہوں کو لوٹ کر بیجاپور حکومت کی بحری تجارت کو بالکل مفلوج کر دیا۔ آخر عادل شاہ نے پرتگالیوں سے معاہدہ کیا اور گوا کی بندرگاہ انھیں باقاعدہ طور پر سونپ دی۔ گوا کو اپنی کارگزاریوں کا مرکز بنا کر پرتگالیوں نے اپنی طاقت اور بڑھانی شروع کی اور سری لنکا میں کولمبو میں ایک قلعہ بنایا، ایک سماترا میں اچین کے مقام پر اور ایک قلعہ ملاکا بندرگاہ پر بنایا جہاں سے ملایا جزیرہ نما اور سماترا کے درمیان پتلی سی آبنائے میں داخل ہونے اور باہر نکلنے پر گرفت رکھی جاتی تھی۔ پرتگالیوں نے بحر احمر کے دہانے پر سقوترا کے جزیرے پر قبضہ کر کے اپنا ایک پڑاؤ بنایا اور عدن کا محاصرہ کر لیا۔ بہر حال، واسکوڈی گاما عدن پر قبضہ نہ کر سکا جو اس علاقے میں اس کی واحد ناکامی تھی۔ لیکن اُس نے ہُرمز کے حکمراں کو مجبور کر کے ایک قلعہ اس مقام پر بنایا جہاں سے خلیج فارس میں داخلے پر گرفت رکھی جاتی تھی۔

اس عرصے میں پرتگالیوں کا سب سے بڑا مقصد دیو اور کیمبے کے قلعوں پر قبضہ کرنا تھا جو

بحر احمر سے گجرات کی تجارت کے مرکز تھے۔ پرتگالیوں نے 21-1520 میں دیو پر قبضہ کرنے کے لیے دو بار حملہ کیا مگر دونوں بار انھیں وہاں کے گورنر احمد ایاز نے شکست دی۔

اس دور میں سلیمان کے عہد میں عثمانی ترک اپنی تاریخ کے سب سے شاندار دور سے گزر رہے تھے۔ وہ یورپ پر حملہ کرنے کے لیے پر تولے بیٹھے تھے اور اپنی ایشیائی فتوحات کو بھی مکمل کرنا چاہتے تھے۔ 1529 میں ترکوں نے ویانا کا محاصرہ کیا جو پولینڈ کی بروقت مدد سے بچ گیا۔ اس سے پہلے ترکوں نے ایران کو شکست دی تھی اور شام، عرب اور مصر فتح کر چکے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ بحر ہند میں بھی ان کی کارگزاری اور دلچسپی بڑھنی لازمی تھی۔

گجرات کے سلطان نے عثمانی حکمراں کو ان فتوحات کی مبارکباد دینے اور اس سے مدد حاصل کرنے کے لیے ایک سفیر بھیجا، جس کے جواب میں عثمانی حکمراں نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ ان بے دینوں۔ پرتگالیوں۔ سے مقابلہ کیا جائے جنھوں نے عرب کے ساحلوں پر فتنہ پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد سے اِن دونوں ملکوں کے درمیان سفیروں کے آنے جانے اور خطوط کا سلسلہ متواتر جاری رہا۔ 1529 میں پرتگالیوں کو بحر احمر سے نکال باہر کر دینے کے بعد سلیمان رئیس کی کمان میں ترکی کا ایک بہت بڑا بیڑا گجرات کے حکمراں بہادر شاہ کی مدد کے لیے بھیجا گیا۔ بہادر شاہ نے اُس کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا اور ترکی کے دو افسروں کو ہندوستانی نام دے کر انھیں سورت اور دیو کا گورنر مقرر کیا۔ اِن دونوں میں سے رومی خان نے بعد میں توپ خانے کے ماہر کی حیثیت سے بہت نام کمایا۔

1531 میں مقامی افسروں سے سازش کر کے پرتگالیوں نے دمن اور دیو پر حملہ کیا، مگر عثمانی کمانڈر رومی خاں نے پسپا کر دیا۔ پھر بھی پرتگالیوں نے ساحل پر کچھ نیچے چول میں ایک قلعہ بنا ہی لیا۔ بہر حال گجرات۔ ترکی کے اتحاد کے پوری طرح مستحکم ہونے سے پہلے ہی گجرات کے سر پر ایک بڑا خطرہ مغلوں کی طرف سے منڈلانے لگا۔ ہمایوں نے گجرات پر حملہ کیا۔ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے بہادر شاہ نے بسین کا جزیرہ پرتگالیوں کو دے دیا۔ گجرات سے مغلوں کے بے دخل کیے جانے کے بعد گجرات کے حکمراں نے عثمانی سلطان سے دوبارہ مدد چاہی تاکہ پرتگالیوں کو دیو میں گھسنے سے روکا جا سکے۔ لیکن بہادر شاہ 1536 میں پرتگالیوں سے ایک

جھڑپ میں مارا گیا اور اس کے بعد دیو پر دوبارہ قبضہ کر لینے کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔

ترکوں نے پرتگالیوں کے خلاف ہندوستان کے سمندر میں اپنی بحری طاقت کا مظاہرہ 1536 میں کیا۔ اُن کے بیڑے میں 45 گیلیون (خاص طرح کے بادبانی جہاز) تھے جن میں 20,000 لوگ تھے جن میں 7000 'جانثاری' یا سپاہی بھی شامل تھے۔ ملاحوں میں بہت سے اسکندریہ میں موجود وینسی گیلی (جہازوں) سے لا کر اس مہم میں شامل کیے گئے تھے۔ اس بیڑے کی کمان 82 سال کا سلیمان پاشا کر رہا تھا جو سلطان کا سب سے معتمد افسر تھا اور اُسے قاہرہ کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ اس بیڑے نے 1538 میں دیو کا محاصرہ کر لیا۔ بد قسمتی سے ترکی ایڈمیرل نے کچھ گستاخانہ انداز دکھایا جس سے گجرات کے سلطان نے ناخوش ہو کر اپنی حمایت واپس لے لی۔ دو مہینے کے محاصرے کے بعد ترکی بیڑا یہ خبر سن کر واپس ہو گیا کہ دیو کو محاصرے سے آزاد کرانے پرتگال کا ارمادہ بیڑا پہنچ گیا ہے جو ایک خاصی اہم کمک تھی۔

پرتگالیوں کے لیے اگلے دو عشروں تک ترکوں کا خطرہ بہر طور باقی رہا۔ 1531 میں پیری رئیس نے کالی کٹ کے زامورن کی مدد سے مسقط اور ہُرمز کے پرتگالی قلعوں پر حملہ کیا۔ اس درمیان پرتگالیوں نے دمن کے حکمراں سے دمن کو چھین کر اپنی طاقت اور مضبوط کر لی تھی۔ آخری عثمانی مہم 1554 میں علی رئیس کی سربراہی میں عمل میں آئی۔ ان مہموں کی ناکامی سے ترکوں نے ہی اپنا انداز بدل دیا۔ 1556 میں ترکوں اور پرتگالیوں میں مشرقی تجارت میں حصے داری کا معاہدہ ہو گیا جس میں مسالوں کی تجارت اور ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کی بات طے ہو گئی۔ اس کے بعد عثمانیوں نے اپنی توجہ پھر یوروپ کی طرف مبذول کر دی۔ اس سے پرتگال کے خلاف ترکوں اور مغلوں کے درمیان مستقبل میں کسی قسم کے معاہدے کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے۔

(iii) بحر ہند کے تجارتی سلسلے پر پرتگال کے اثرات:

پرتگالیوں نے بحر ہند میں غیر مسلح آزاد بحری تجارت کا دور ختم کر دیا اور بحر ہند کے مغربی حصے میں تجارت پر مسلم اجارے اور یوروپ میں ان کی مشرقی اشیاء کی تجارت کو فی الحقیقت زبردست دھکا پہنچایا۔

بہر حال، پرتگالیوں کی یہ کوشش کہ وہ مشرقی اشیاء کی تجارت سے مسلمانوں کو بالکل

خارج کردیں اور مغربی ایشیا کی تجارت پر مکمل اجارہ حاصل کرلیں، اس میں بھی انھیں صرف محدود سی ہی کامیابی نصیب ہوئی۔ اس طرح سولھویں صدی کے درمیانی حصے تک اس کے باوجود کہ مسالے بڑی تعداد میں اینٹورپ کے راستے لسبن لا کر یوروپ کے بازاروں میں بیچے جاتے تھے، بحر اسود کی بندرگاہوں، لیوانٹ کے بازاروں اور مصر میں بھی مشرقی اشیاء پہلے کی طرح ہی سپلائی کی جاتی تھیں، جن میں مسالے، رنگ اور روئی اور ریشم کے کپڑے شامل تھے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ شروع سے ہی پرتگال کے بادشاہ نے اعلان کردیا تھا کہ مسالوں، دواؤں، رنگوں بشمولیت نیل، تانبا، چاندی، سونا اور اسلحے کی تجارت پر بادشاہ کا مکمل اجارہ ہوگا۔ کسی دوسرے ملک کے تاجروں۔ یوروپی یا ایشیائی۔ یہاں تک کہ پرتگالی نجی تاجروں اور افسروں کو بھی ان چیزوں کی تجارت میں حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ دوسری اشیاء کی تجارت کرنے والے جہازوں کو بھی پرتگالی افسروں سے پرمٹ (cartaze) لینا ضروری ہوتا تھا۔ پرتگالیوں نے کوشش کی کہ مشرقی افریقہ اور ملاکا جانے والے تمام جہاز گوا سے ہو کر گزریں اور وہاں محصول ادا کریں۔ کسی جہاز کو بھی جس پر زیرِ پابندی' (کنٹرابینڈ) یا بالکل ممنوعہ اشیاء لے جانے کا شبہ ہوتا تھا' یا جو تلاشی کی اجازت نہیں دیتا تھا اسے مالِ غنیمت تصور کرلیا جاتا تھا اور یا تو اسے پکڑ لیا جاتا تھا یا ڈبو دیا جاتا تھا اور اس پر سوار مرد عورتوں کو غلام بنالیا جاتا تھا۔

مگر جلد ہی پرتگالیوں کو اپنی حرکتوں کا نتیجہ معلوم ہوگیا کہ جتنا وہ سمندر میں حاصل کرتے ہیں اس سے زیادہ زمین پر گنواتے ہیں' چونکہ جو تاجر سمندر میں اپنا مال گنواتے تھے یا نقصان اٹھاتے تھے وہ اپنی حکومتوں پر زور ڈالتے تھے کہ وہ پرتگالی تجارت پر اپنے علاقے میں کچھ مخالفانہ رویہ اختیار کریں۔ اس کے علاوہ ایشیا کے پورے ساحل پر تجارت کا تعاقب کرتے رہنا بھی لگ بھگ ناممکن تھا۔ بحری قزاق جو پہلے سے ہی پرتگالی جہازوں کی تلاش میں رہتے تھے وہ عمان، مالابار اور جنوب مشرقی ایشیا کے علاقوں میں متحرک تھے انھیں پرتگال کی اس پالیسی کے نتیجے میں دوسرے تاجروں اور چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کی سرپرستی اور امداد بھی حاصل ہوگئی۔

اس کی وجہ سے علاقائی تاجروں کے دیے جانے والے پرمٹ (کارٹازے) کے قوانین میں کچھ ڈھیل دینی پڑی۔ ان تاجروں میں مسلمان تاجر بھی تھے۔ گھوڑوں کی تجارت جو پوری طرح مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی بہت زیادہ منافع بخش تھی۔ پھر اس علاقے کے حکمرانوں کے لیے

اس کی اہمیت فوجی امور سے بھی تعلق رکھتی تھی۔ مسلمان دیگر اشیاء جیسے کپڑے سے متعلق مصنوعات، شیشہ، عطریات اور کافی وغیرہ میں بھی مصروف تھے جن کی تجارت کے لیے پرتگالیوں کے پاس نہ دولت تھی نہ اتنے جہاز تھے کہ انھیں اس میں لگایا جاسکے۔ اس طرح تجارت اور منافع کے دباؤ بہت جلدی مذہبی تعصبات پر غالب آگئے۔

فی الحقیقت پرتگالی کالی مرچ اور مسالوں تک کی تجارت پر اپنا اجارہ قائم نہ کرسکے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ پرتگال کے نجی تاجر خود اپنے حکمراں کی اُن کوششوں سے ناخوش تھے جو وہ ان اشیاء کی تجارت پر شاہی اجارہ قائم کرنے کے لیے کر رہا تھا۔ شاہی افسر جنھیں کم تنخواہیں ملتی تھیں وہ اکثر اپنے نجی تاجروں، عربوں اور گجراتیوں وغیرہ سے سازباز کر کے خود اپنی جیبیں بھرنا شروع کر دیتے تھے۔ اس طرح کارتازے کا طریقہ ۔بے ایمانیوں کی جڑ بن گیا اور سرکاری آمدنی دوسری جیبیں بھرنے لگی۔

عرب اور گجراتی تاجروں نے بھی تجارت پر پرتگال کی طرف سے عاید کردہ ممانعت سے بچنے کے لیے ادھر اُدھر کے راستے تلاش کر لیے۔ بحر ہند پر پرتگالیوں کی گرفت بھی ادھوری ہی رہی کیونکہ وہ عدن کو گرفت میں نہ لے سکے جس سے بحر احمر میں داخلے پر پابندی یا کنٹرول کیا جاسکتا تھا۔ شام، مصر اور عرب پر ترکی قبضے اور مشرقی بحر روم بحر احمر دونوں میں اس کی بحری طاقت کی توسیع کے نتیجے میں پرتگالی باب المندیل پر رکاوٹ لگانے میں پوری کامیابی حاصل نہ کرسکے جو خلیج فارس میں داخلے کا دروازہ تھا۔ بحر ہند کے دوسرے کنارے پر مسالوں کے جزیروں تک پر پرتگالیوں کی گرفت کمزور ہوگئی۔ اس علاقے میں انھیں ایک ایسی بحری طاقت کا سامنا کرنا تھا جو ان کے جنگی جہازوں تک کے سامنے جمی رہی۔ یہ شمالی ساٹرا کے حکمراں سلطان علی مغایت شاہ کی طاقت تھی۔ پرانی جاوائی بحری جنگ کے طریقوں کو کام میں لاتے ہوئے اس نے پرتگالیوں کو کئی جھڑپوں میں ہرایا اور اَچھیہ کی قلعہ بندی کو مضبوط کرنے کے لیے خود پرتگالیوں سے بہت سی توپیں چھین لیں۔ وہ فوجی سامان کے لیے ترک عثمانی سلطان کے پاس بھی پہنچا، عثمانیوں کا توپیں ڈھالنے میں بڑا نام تھا۔ انھوں نے شمالی ساٹرا میں اچھیہ کے محاصرے کے مقابلے کے لیے اعلیٰ کیلبر کی برونز کی توپیں دیں۔ اس کے نتیجے میں پرتگالیوں کے مقبوضہ ملاکا کے مقابلے میں اچھیہ مسالوں کی برآمد کا ایک اہم

مرکز بن کر اُبھرا۔ عرب اور گجراتی تاجر، جو ملاکا میں مضبوطی سے قدم جمائے ہوئے تھے، وہ اچھیہ کو لکادیو کے راستے بحر احمر میں مسالوں کی برآمد کے لیے ایک مرکز کے روپ میں استعمال کرتے تھے جس سے وہ پرتگالیوں کے قبضے والے مالاباری سمندری حصے سے بچ کر نکل جاتے تھے۔

اس طرح ایشیائی تجارت کے ڈھانچے کا پھیلاؤ، ایشیائی، عرب، گجراتی، تامل اور دوسرے تاجروں کے ذہن کی رسائی یا بروقت کارگزاری، جنھیں اس نظام میں کام کرتے رہنے کا طویل تجربہ تھا، ترکی اور شمالی سماترا کے حکمرانوں کی بحری طاقت اور خود پرتگالیوں کی اپنی داخلی اور ہندوستان میں قائم کردہ اپنی حکومت 'ایسٹاڈو ڈا انڈیا' (Astado da India) کے 'کرٹازے' (پرمٹ) سسٹم کی آخری حدیں، یہ تمام چیزیں پرتگال کی کامیابی میں اہم رکاوٹیں ثابت ہوئیں۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ پرتگال ایک چھوٹا سا ملک تھا اور گو کہ اس نے بیوپار میں بہت تیز ترقی کی تھی، اس کے مالی ذرائع محدود تھے۔ اس لیے پرتگال جن ایشیائی اشیاء کو لسبن پہنچاتا تھا انھیں پورے یوروپ میں فروخت کرنے کے لیے جرمنی اور اٹلی کے تاجر اور ان کی تجارتی کمپنیاں ہی سب سے اہم ایجنٹ بن گئے۔ ایشیا میں یوروپ کی اُن چیزوں کی مانگ بھی محدود تھی جنھیں یوروپ سے سیاہ مرچ اور دوسری اشیاء کے بدلے میں یہاں لایا جاسکتا تھا۔ اس کی وجہ سے وہاں سے قیمتی دھاتیں، خصوصاً چاندی برآمد کرنی ضروری تھی۔ لیکن اسپین کی طرح پرتگال کے پاس امریکہ میں چاندی کی کانیں نہیں تھیں جن کا وہ سہارا لے سکتا، چنانچہ اُسے اٹلی اور جرمنی کے سرمایہ کاروں پر بڑی حد تک منحصر رہنا پڑتا تھا۔ پرتگال کے بادشاہ کی یہ توقع کہ ہندوستانی ساحلوں کی تجارت پر پرتگالی تسلط سے یوروپ کو برآمد کی جانی والی سیاہ مرچ اور دوسری اشیاء کے اخراجات پورے ہو جائیں گے، یہ بھی ایک غلط فہمی ثابت ہوئی۔ پرتگال کی یوروپ سے تجارت لسبن سے ہندوستان بھیجے جانے والے صرف بارہ تیرہ جہاز سالانہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس طرح بحر ہند کے مغربی حصے میں پرتگال کی تجارتی مہم اسٹینس گارڈ کے الفاظ میں ''اشیاء کی دوبارہ تقسیم'' کے کاروبار سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکی، جس کا مطلب تھا کہ اس کی بنیادی آمدنی دوسروں کی تجارت پر محصول لگا کر حاصل ہوتی تھی خود اپنی تجارت کی توسیع یا تجارت کی نئی لائنیں پیدا کرنے سے نہیں ہوتی تھی۔ یوروپ کی مشرق سے تجارت کی حقیقی توسیع کو ابھی سترھویں صدی میں ڈچ اور

کرتے ہوئے مارے گئے تھے، یہ واقعہ ہندی رزمیہ نظم پرتھوی راج رس 'اور 'آلہا کھنڈ' میں امر کر لیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نظم بعد میں لکھی گئی اس لیے اس کی تاریخی صحت پر تاریخ دانوں کو شبہ ہے تاہم یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ چندیلوں کے خلاف پرتھوی راج کو اہم فتح حاصل ہوئی تھی اگرچہ اس نے نئے علاقے حاصل نہیں کیے لیکن وہ بہت ساماں وزر لے کر لوٹا تھا۔

1182 اور 1187 کے درمیان پرتھوی راج نے اپنی توجہ اپنے پرانے دشمن گجرات کے چولکیوں کی طرف مبذول کی۔ یہ جدوجہد کافی طویل عرصے تک چلی اور ایسا لگتا ہے کہ گجرات کے حکمراں بھیم دوم نے جس نے اس سے پہلے غوری حکمراں معزالدین کے حملے کو ناکام بنادیا تھا پرتھوی راج کو بھی شکست دے دی تھی۔ اس شکست نے پرتھوی راج کو مجبور کیا کہ اب وہ گنگا کی وادی اور پنجاب کی طرف توجہ دے۔ روایت کے مطابق اس کے اور قنوج کے گہدوالوں کے درمیان طویل رسہ کشی چلتی رہی جن کے پاس اس علاقے کی سب سے وسیع سلطنت تھی۔ اس تصادم کی وجہ پرتھوی راج کا حکمراں جے چند کی خوب صورت بیٹی سنیوگیتا کا اس کے سوئمبر کے موقع پر اغوا کر لینا تھا۔ اس کے بعد کی جنگ میں جے چند کی ہار ہوئی۔ اس کہانی کی صداقت پر تاریخ دانوں کو شبہ ہے کیوں کہ اس واقعہ کا ذکر اس زمانے کے واقعات میں کہیں اور نہیں ملتا۔ لیکن دہلی اور بالائی گنگا دوآبے پر قبضے کے لیے چوہان اور گہدوالوں کے درمیان دشمنی مشہور ہے اور یہی دشمنی گہدوالوں کے بعد کے رویہ کی وجہ سمجھی جاتی ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اپنے پڑوسیوں کے خلاف لڑنے کی وجہ سے سیاسی طور پر پرتھوی راج نے اپنے آپ کو تنہا کر لیا اور یہ دوری اسے بہت مہنگی پڑی جب کچھ سال بعد اسے معزالدین کی ترکی فوجوں کا سامنا کرنا پڑا۔

1173 میں غزنی میں معزالدین کی تخت نشینی کا حوالہ ہم پہلے ہی دے چکے ہیں۔ ہندوستان کے خلاف اس کا پہلا معرکہ 1175 میں ہوا جب اس نے ملتان پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کیا جو اس وقت کراماتیوں کے تحت تھا جو ہندوستان اور ایران کی سرحد پر پھیلے ہوئے تھے اور جن کے خیالات اسلام اور بدھ مذہب دونوں سے ہی ملتے جلتے تھے۔ اگلے سال معزالدین نے اُوچھ پر قبضہ کیا۔ 79-1178 میں وہ ملتان اور اُوچھ سے ہوتا ہوا گجرات میں نہروال تک پہنچ گیا اس کے

انگریزی تجارت کا انتظار تھا۔

بہر حال، مشرق بعید میں پرتگالیوں کو اپنی تجارت میں توسیع اور کچھ نئی راہیں کھولنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ انھوں نے کورومنڈل سے کپڑے کی برآمد پر قبضہ کر کے اسے انڈونیشیائی مجمع الجزائر پر منتقل کرلیا جہاں سے اس کے بدلے میں یہ مسالے خرید سکتے تھے۔ یہاں بھی مسالوں کی تجارت پر اجارہ قائم کرلینے کا کوئی سوال نہیں تھا کیونکہ یہاں جاوا اور ملایا کے تاجر اپنا کاروبار تیزی سے کررہے تھے۔ پرتگالی تاجر مسالے چین لے جاتے، اس کے بدلے میں ریشم خریدتے اور اسے چاندی کے بدلے میں جاپان پہنچادیتے۔ یہ تجارت یقیناً کافی منافع بخش تھی کیونکہ پیکنگ کے دربار نے قزاقی کے ڈر سے بحری تجارت پر پابندی لگادی تھی۔ اسی وجہ سے پرتگالی اس میں قدم رکھ سکے مگر پرتگالی مکاؤ سے جاپان سال میں صرف ایک بڑا جہاز لے جاسکتے تھے۔

اس تجارت کے علاوہ پرتگالیوں نے جو ایک نئی تجارت کی راہ کھولی وہ فلیپائنس کے راستے جنوبی امریکہ سے تھی۔ ہندوستانی روئی کی مصنوعات کی مانگ فلیپائنس میں برابر موجود تھی۔ چونکہ اسپین کے حکمرانوں نے فلیپائنس سے تجارت کو مسلمانوں اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے لیے بالکل بند کردیا تھا، اس سے پرتگالیوں کو ایک بہت اچھا موقع مل گیا۔ اس تجارت میں انھوں نے کچھ آرمینیائی اور گجراتی تاجروں کو بھی موقع دے دیا۔ فلیپائنس سے اسپینی گیلیون (جہاز) ہندوستانی کپڑا جنوبی امریکہ لے جاتے تھے جہاں یہ چاندی سے بدلا جاتا تھا۔ مشرق بعید سے تجارت اتنی منافع بخش تھی کہ پرتگال کالی مرچ کی بحر ہند کی تجارت میں کسی قدر ڈھیل بھی دے سکتا تھا۔

اس طرح سولھویں صدی کے آخری نصف حصے میں، ایک ایسا دور نظر آیا جس میں پرتگالیوں اور ایشیائی تاجروں کے درمیان تجارت میں شرکت بڑھتی رہی۔ بہت سے عرب اور گجراتی تاجروں نے اپنا مال پرتگالی جہازوں پر لادنے میں زیادہ منافع دیکھا، دوسری طرف شاہی اجارے سے بچنے کے لیے پرتگالی نجی تاجروں اور افسروں نے بھی ایشیائی جہازوں کو استعمال کرنا شروع کیا۔

ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ پرتگالیوں نے دور دراز کے مختلف علاقوں میں اپنی فیکٹریاں یا گودام قائم کر کے مشرقی تجارت میں شفافی (ہر چیز کی معلومات موجود ہونا) پیدا کی جس

کے نتیجے میں بازار اور قیمتیں زیادہ مستحکم ہو گئیں اور ان میں بھی شفافی پیدا ہوئی۔ مگر موجودہ تحقیق سے اس دلیل کی تصدیق نہیں ہوتی۔ جدید تجارت سے پہلے کی تجارت میں قیمتوں میں بہت زیادہ اتار چڑھاؤ / رفرق ایک عام خصوصیت تھی۔ پھر ہندوستانی اور عرب تاجر موجودہ یا کسی مقامی، اور مستقبل کے بازار کی کیفیات، دونوں سے بخوبی واقف تھے۔ فوری یا مقامی بازاروں کے لیے ان کے پاس گودام موجود تھے جو بہترین قیمت حاصل کر لینے کے لیے ضروری تھے تاکہ جس وقت کسی شے کی افراط ہو تو اُسے خریدا جا سکے اور جب قلت ہو تو بیچا جا سکے۔ مثال کے طور پر کافی۔ مگر اعلیٰ درجے کے کپڑے، یا مسالوں جیسی اشیاء کے سلسلے میں شے اور قیمت کا پہلے سے تعین ہوتا تھا۔ ایشیائی تاجران کا انتظام اپنی انجمنوں (ایسوسی ایشنوں) اور مختلف علاقوں میں پھیلے تاجر خاندانوں کے جال کے ذریعے کرتے تھے۔ پرتگالیوں نے مالابار میں مقامی حکمرانوں پر دباؤ ڈال کر یا کچھ ترغیب و تحریص کے ذریعے پہلے سے مقرر کی ہوئی قیمت پر کالی مرچ کی سپلائی حاصل کرنے کی کوشش کی اور اپنے اپنے علاقوں میں مال حاصل کرنے کے لیے مقامی تاجروں یا براہِ راست کاشتکاروں سے ملاقات کی ذمے داری مقامی حکمراں پر چھوڑ دی۔ پرتگالیوں کی یہ پالیسی اس لیے مقبول نہ ہو سکی کہ انھوں نے کاشتکاروں کو کم قیمت دینے کے سلسلے میں سیاسی دباؤ کا استعمال کرنا چاہا اور اپنے حریف یا مقابلہ کرنے والے تاجروں کو قیمت لگانے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ سے مسالوں کی پیداوار بڑھانے سے کاشتکاروں کو کوئی خاص فائدہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔

پرتگالیوں کے اس دعوے کے باوجود کہ وہ مشرقی مقبوضہ علاقوں کے مالک و مختار ہیں، ایشیا کے سیاسی نظام پر پرتگالیوں کا اثر کوئی خاص نہیں تھا۔ ہندوستان یا دوسری جگہوں پر (جزیروں کے علاوہ) اصلی ملک کے علاقوں پر قبضہ کر کے اُسے برقرار رکھنے کی کوشش کے لیے پرتگالیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس لیے صرف ان جزیروں اور قلعوں تک ہی اپنی طاقت کو محدود رکھنے کا ان کا فیصلہ دانشمندانہ تھا جن کی وہ حفاظت کر سکتے تھے اور وہاں سمندری راستے سے رسد پہنچا سکتے تھے۔ گوا کا جزیرہ جو اُن کی حکومت کا مرکز بنا اس کی سب سے اچھی مثال تھی۔ اس کے علاوہ یہ لوگ دھمکیوں یا تحریص و ترغیب کے ذریعے کالی کٹ، کوچین، کنانور جیسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو بھی اپنی مسالوں کی تجارت میں ایجنٹ یا دلال بنا سکے۔

گوا میں پرتگالیوں کی حکومت کا ڈھانچہ یہ تھا کہ اس پر ایک گورنر جنرل کی گرفت تھی جس کی مدد کے لیے ایک کاؤنسل ہوتی تھی جس کا ایک ممبر مذہبی سربراہ بھی ہوتا تھا۔ اپنی کم تعداد کی وجہ سے انھوں نے ملی جلی شادیوں کی بھی ترغیب دی جس کے نتیجے میں کچھ عرصے میں ایک ہند۔ پرتگالی، یا گوانی، سوسائٹی اُبھر آئی۔ لیکن یہ سوسائٹی اور خود حکومت خاص نسلی بنیادوں پر منظم تھی۔ خالص پرتگالی نسل کے لوگ سوسائٹی کے اعلیٰ ترین درجے پر ہوتے تھے اور دوغلی یا ملی جلی نسل کے لوگ سب سے نچلے درجے پر۔ موخرالذکر کو حکومت یا اقتدار میں بھی کوئی جگہ حاصل نہیں ہوتی تھی۔ کلیسا کی مداخلت اُس بھیانک عمل۔ 'اوٹوڈافے' (Autodafe)۔ کے وقت ہوتی تھی جس میں عیسائیوں میں الحاد کو روکنے کے لیے لوگوں کو کھمبے سے باندھ کر زندہ جلایا جاتا تھا۔

اس طرح سیاست یا عالمی تجارت کی توسیع میں پرتگالیوں کی شمولیت بالکل برائے نام یا معمولی ہی رہی۔ پھر بھی ہندوستان کے لیے سیدھا بحری راستہ کھول دینے کا ان کا کارنامہ اتنا اہم ضرور تھا کہ اُسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے دنیا کی بڑھتی ہوئی تجارت میں ہندوستان کے قریب آنے اور اس میں شامل ہو جانے کی راہیں کھولیں اور ہندوستان میں بازار معیشت کی نشوونما میں اضافہ کیا۔ یہ ہندوستان کے اُس طریقۂ فکر کے لیے بھی جسے ایک جدید مورخ، کیرتی چودھری نے ہندوستان کی داخلیت پرستی کا نام دیا ہے (اگر ایک مکمل رخنہ نہیں) تو ایک دھکا تو ضرور تھا۔ ہندوستان سے پرتگال کا تعلق قائم ہونے کے نتیجے میں لاطینی امریکہ کی بہت سی پیداواریں۔ آلو، جوار، انناس وغیرہ۔ ہندوستان کی دیہی معیشت میں داخل ہو گئیں بالکل اسی طرح جیسے ترکوں کی آمد سے بہت سے نئے پھل شامل ہوئے تھے۔ ظاہر ہے اگر کوئی پیداوار منافع بخش تھی تو ہندوستانی کاشتکار اس کا مخالف نہیں ہوسکتا تھا۔ کوچین میں پرتگالیوں کی نگرانی میں مغربی تکنیک استعمال کرتے ہوئے جہاز سازی کی صنعت شروع ہوئی۔ بہرحال کچھ اور چیزیں اور تکنیک جیسے چھپائی (طباعت) گھڑی وغیرہ جو گوا پہنچ چکی تھیں اور ان کے نتائج اور اثرات بہت دوررس تھے انھیں ملک ہندوستان میں نہیں اپنایا گیا جس کی وجوہات بھی ابھی پوری طرح نہیں تلاش کی گئی ہیں۔

بہرحال، ایک بڑا بنیادی سوال یہ باقی رہتا ہے کہ ایک چھوٹی اور معاشی اعتبار سے پسماندہ طاقت کو ہندوستان میں موجود مستحکم طاقتوں نے ایک صدی سے زیادہ عرصے تک بحرِ ہند

پر تسلط جمائے رکھنے کی کیسے اجازت دی؟ ہر شخص واقف ہے کہ بحر ہند پر پرتگالیوں کا تسلط سترھویں صدی میں ختم ہوا، اور وہ بھی ہندوستان کے ہاتھوں نہیں، ڈچ اور برطانوی طاقتوں کے ذریعے۔ اس سوال پر ڈچ اور برطانوی طاقتوں کے عروج کے بیان میں غور کیا جائے گا۔

ایشیائی سمندروں میں پرتگالیوں کی بحری طاقت کی کامیابی کی بنیاد کے سلسلے میں مورخین میں کافی بحث مباحثہ رہا ہے۔ اب یہ بات تسلیم کرلی گئی ہے کہ ہند عرب 'بوم' اور چینیوں کے جنک (جہاز) تکنیک کے اعتبار سے پرتگالیوں کے گیلیون اور کاراویل کی طاقت میں برابر تھے اور سامان ڈھونے کی مقدار (ٹنیج) اور ہوا کے مقابل اپنے (تکون) بادبانوں کے سہارے پرتگالی جہاز رانی کا مقابلہ کرسکتے تھے۔ اُن کے پاس بحری سفر کی اتنی کافی تکنیک اور صلاحیت بھی موجود تھی کہ وہ کھُلے سمندروں میں سفر کرسکیں۔ پرتگالی جس چیز میں بہتر یا آگے تھے وہ اُن کے جہازوں کی تیز نقل و حرکت کی صلاحیت تھی، جبکہ ہند۔ عرب جہاز اپنے بھاری بادبانوں کی وجہ سے بھونڈے اور سست تھے۔ اس کے ساتھ ہی پرتگالیوں کے جہازوں کے ڈھانچے بھی ان سے زیادہ مضبوط تھے اور توپ چلنے کے جھٹکوں کو زیادہ مضبوطی سے جھیلنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لیکن جیسا کہ کہا جاتا ہے یہ پرتگالی جہاز رانوں کے عزم و ارادے کی پختگی تھی جس نے اصل میں اس مرحلے کو اُن کے حق میں طے کیا۔ ہندوستانی، جو قزاقوں سے لڑنے کے عادی تھے، وہ اپنے حکمرانوں کی پشت پناہی حاصل کیے بغیر سمندر میں باقاعدہ جنگ نہیں کرسکتے تھے۔ اس طرح صرف فوجی اور بحری صلاحیت ہی پرتگالیوں کو ایک صدی سے زیادہ ہندوستانی سمندروں پر اپنا قبضہ جمائے رکھنے کی ذمے دار نہیں تھی بلکہ اس کے لیے کچھ اور وجوہات بھی تھیں۔ ہندوستان کی حکومتیں اس تسلط پر اس لیے خاموش رہیں کہ اس کا کوئی خطرناک اثر ملک ہندوستان میں ان کی اپنی سیاسی حیثیت و اقتدار پر نہیں پڑ رہا تھا، نہ بحری تجارت سے ہونے والی ان کی آمدنی پر اس کا کوئی اثر پڑ رہا تھا۔ اس طرح پرتگال سے بحری مقابلہ مشکل اور کامیابی کے اعتبار سے غیر یقینی بھی لگتا تھا اور اس سے کسی قسم کے مالی فائدوں کے حصول کی بھی کوئی خاص امید نہیں کی جاسکتی تھی۔

■■■

-12-

شمالی ہندوستان میں علاقائی سلطنتیں اور طاقت کے توازن کا نظام

1398 میں دہلی پر تیمور کے حملے نے تغلق خاندان کے زوال اور دہلی میں سلطنت کے خاتمے کی رفتار کو تیز کردیا۔ تیمور کے حملے سے پہلے ہی دو بادشاہوں کے بیک وقت منظر پر آنے سے، جن میں سے ایک فیروز آباد اور دوسرا دہلی پر حکومت کرتا تھا، دہلی سلطنت کی کمزوری ظاہر ہونے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بہت سی صوبائی حکومتیں بھی مرکز سے ٹوٹ کر خود مختار ہوگئی تھیں۔ دکنی ریاستیں، مشرق میں بنگال اور مغرب میں سندھ اور ملتان محمد بن تغلق عہد کے آخری حصے میں ہی علیحدہ ہو چکے تھے اور کچھ معمولی اور کمزور سی کوشش کے بعد فیروز نے بھی اس نقصان کو تسلیم کرلیا تھا۔ تیمور کے حملے کے بعد گجرات، مالوہ اور (مشرقی اتر پردیش میں) جونپور نے خود مختاری کا اعلان کردیا اور دوسری طرف خضر خاں نے پنجاب میں مکمل اقتدار حاصل کرلیا۔ اجمیر کے صوبے سے مسلمان گورنر کے نکال دیے جانے سے راجپوتانہ علاقے کی بہت سی ریاستوں نے بھی آزادی اختیار کرلی۔ خود دہلی کے خطے میں بھی حکمرانوں کو اپنی گرفت برقرار رکھنے میں خاصی دقت پیش آرہی تھی۔

گو کہ مختلف صوبائی حکومتیں اور راجپوت ریاستیں اس دور میں ایک دوسرے سے دست و گریبان تھیں، پھر بھی پندرھویں صدی کو پورے شمالی ہندوستان میں انحطاط یا زوال کا دور سمجھنا غلط ہوگا۔ سیاسی اعتبار سے مختلف ریاستوں کی آپسی جنگیں مشکل سے ہی کبھی سرحدی علاقوں کی جنگوں سے آگے بڑھیں مختلف خطوں مشرق، مغرب اور شمال کی ریاستوں کے درمیان طاقت کے توازن میں ایک واضح رجحان یا نظام متواتر باقی رہا۔ ایک طرف مغرب میں گجرات، مالوہ اور میواڑ کی ریاستیں ایک توازن بنائے ہوئے تھیں اور ایک دوسرے کی طاقت پر خود ہی روک لگائے ہوئے تھیں تو دوسری طرف مشرق میں بنگال کو روکے رکھنے کے لیے اڑیسہ کے گجپتی حکمراں اور جونپور

کے مشرقی حکمراں کافی تھے۔ شمال میں کشمیر تو اس کشمکش سے الگ تھا، مگر پندرھویں صدی کے درمیانی دور میں دہلی میں لودیوں کے منظر عام پر آنے سے لودیوں اور جونپور کے حکمرانوں کے درمیان گنگا جمنا دوآب پر قبضے کے لیے ایک طویل کش مکش شروع ہوگئی۔

طاقت کا یہ توازن پندرھویں صدی کے آخری حصے میں ٹوٹنا شروع ہوا۔ لودیوں کے ہاتھوں جونپور کی آخری شکست اور پنجاب سے بنگال کی سرحد تک ان کی سلطنت کی توسیع سے دہلی سلطنت ایک بار پھر مستحکم ہوگئی اور اب مالوہ اور مشرقی راجستھان کی طرف دباؤ بڑھ گیا۔ اس دوران خود مالوہ میں بھی داخلی انتشار شروع ہوگیا جس کے نتیجے میں گجرات اور میواڑ کے درمیان رقابت میں تیزی آگئی۔ اُدھر لودی بھی اس علاقے میں اپنی توسیع کے لیے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اس طرح مالوہ ایک بار پھر شمالی ہندوستان پر تسلط اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے میدانِ جنگ بن گیا۔

جہاں تک ثقافتی صورتِ حال کا سوال ہے اس دور میں ابھرنے والی سلطنتوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مقامی کلچر اور اس کی روایات اور رسم و رواج کو اپنانے کی کوشش کی۔ اس کا سب سے زیادہ اظہار طرزِ تعمیر میں ہوا جس میں ترکوں کے طرزِ تعمیر میں اپنے اپنے علاقوں کے انداز میں تبدیلیاں پیدا کر کے یا اُسے اپنے انداز میں ڈھال کر ایک نیا علاقائی طرزِ تعمیر ابھارنے کی کوشش کی گئی۔ بہت سی جگہوں پر مقامی زبانوں کی بھی ہمت افزائی کی گئی۔ سیاسی دباؤ میں بہت سے حکمرانوں نے ہندو حکمراں اشراف طبقے سے بھی تعلق پیدا کیا۔ اس سے ہندو مسلم ثقافتی قربت یا یکسانیت کی رفتار میں بھی کسی قدر تیزی پیدا ہوئی۔

i- مشرقی ہندوستان۔ بنگال، آسام، اڑیسہ:

جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا جاچکا ہے بنگال، پایہ تخت سے دوری، بری یا بحری راستوں کے ذریعے آمدورفت کی دشواری اور اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شمال مغربی خشک مقامات اور موسم کے عادی سپاہی وغیرہ وہاں کے مرطوب اور گرم موسم میں رہنا نہیں چاہتے تھے، بار بار دہلی کی سلطنت سے خود مختاری کا اعلان کرتا رہا تھا۔

محمد تغلق مختلف علاقوں میں اُبھری بغاوتوں کو فرو کرنے میں مصروف تھا کہ بنگال 1338 میں پھر ٹوٹ کر خود مختار ہو گیا۔ چار سال بعد الیاس خاں لکھنوتی اور سونار گاؤں پر قبضہ کر کے سلطان شمس الدین الیاس خاں کے خطاب کے ساتھ تخت نشین ہو گیا۔ الیاس خان نے اپنی مغربی حدودِ سلطنت کی توسیع شروع کی اور ترہوت سے چمپارن اور گورکھپور تک، اور آخر بنارس تک پہنچ گیا۔ مجبور ہو کر فیروز تغلق نے اس کے خلاف مہم شروع کی۔ نئے مقبوضہ علاقوں کو اپنے قبضے میں کرتا ہوا فیروز بنگال کے پایۂ تخت پانڈوا تک پہنچ گیا اور الیاس کو ایک ڈالا کے مضبوط قلعے میں قلعہ بند ہونے پر مجبور کر دیا۔ دو مہینے کے محاصرے کے بعد فیروز نے واپسی کا دھوکا دے کر الیاس کو قلعے سے باہر نکال لینے کی ترکیب کی اور ایک سنگین جنگ کے بعد بنگالی فوج کو شکست ہوئی لیکن الیاس خاں ایک بار پھر ایک ڈالا کے قلعے میں واپس ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ آخر ایک معاہدہ ہوا جس میں بہار میں دریائے کوسی کو دونوں سلطنتوں کے درمیان سرحد تسلیم کر لیا گیا۔ حالانکہ الیاس فیروز کو پابندی سے تحفے تحائف بھیجتا رہتا تھا مگر وہ اس کا ماتحت کبھی نہیں ہوا۔ دہلی سے دوستانہ تعلقات کے ہوتے ہوئے الیاس کو اپنا علاقہ (آج کے آسام میں) کامروپ کی سلطنت تک بڑھانے کا موقع مل گیا۔ اُس نے نیپال میں کاٹھمنڈو اور اڑیسہ تک لوٹ مار اور حملے کیے۔

الیاس شاہ ایک مقبولِ عام حکمراں تھا اور اُس نے کئی اہم کام بھی انجام دیے۔ جب فیروز پانڈوا میں تھا تو اُس (فیروز) نے وہاں کے امراء، مذہبی رہنماؤں اور دوسرے حق دار لوگوں کو زمینیں اور دوسرے تحفے تحائف دے کر شہر والوں کی حمایت حاصل کرنی چاہی مگر اُسے اس میں ناکامی ہوئی۔ الیاس اپنی مقبولیت کی وجہ سے ایک ایسے شاہی خاندان کی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا جس نے کسی نہ کسی روپ میں سو سال سے زیادہ حکومت کی۔

الیاس کی موت اور اُس کے بیٹے سکندر کے تختِ سلطنت پر بیٹھنے کے بعد فیروز نے ایک بار پھر بنگال پر حملہ کیا۔ سکندر نے بھی اپنے باپ کی اپنائی ہوئی ترکیب استعمال کی اور ایک ڈالا کے قلعے میں جا بیٹھا۔ فیروز کو پھر اُسے فتح کر لینے میں ناکامی ہوئی اور آخر اُسے واپس لوٹنا پڑا۔ اس کے بعد لگ بھگ دو سو سال بنگال کو آزاد چھوڑ دیا گیا اور 1538 تک، جب تک مغلوں نے اپنا اقتدار پوری طرح دہلی پر قائم نہیں کر لیا، بنگال پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔ 1538 میں پہلے اسے

شیر شاہ نے زیر کیا اور پھر سوری خاندان کی حکمرانی کے خاتمے پر اکبر نے اسے پھر فتح کیا۔

الیاس شاہ کے خاندان میں سب سے مشہور بادشاہ غیاث الدین اعظم شاہ (1389 تا 1409) رہا۔ یہ اپنے عدل و انصاف کی وجہ سے خاص طور پر مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار اس نے کسی بیوہ کے لڑکے کو غلطی سے مار ڈالا تھا جس نے قاضی سے اس کی شکایت کی۔ جب قاضی نے اُسے طلب کیا تو وہ بڑی لجاجت سے عدالت میں حاضر ہوا اور قاضی نے جو جرمانہ (خوں بہا) اس پر عائد کیا وہ اُس نے ادا کیا۔ مقدمے کے فیصلے کے بعد سلطان نے قاضی سے کہا کہ اگر قاضی اپنا فرض صحیح طرح ادا نہ کرتا تو اس کا سر قلم کروا دیا جاتا۔ قاضی نے بھی بتلایا کہ اگر وہ اس کی حکم عدولی کرتا تو وہ (قاضی) اسے کوڑے لگائے جانے کی سزا دیتا۔

اعظم شاہ اپنے دور کے بڑے بڑے علماء اور شاعروں سے، جن میں حافظ شیرازی بھی شامل تھے تعلقات رکھتا تھا۔ اس نے چینیوں سے دوبارہ تعلق قائم کیا۔ اعظم شاہ کے سفیر کا چین کے حکمراں نے بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا اور پھر 1409 میں اس نے بھی اعظم شاہ اور اس کی ملکہ کے لیے تحائف کے ساتھ اپنا سفیر بھیجا۔ اس نے یہ بھی درخواست کی کہ بدھ بھکشوؤں کو چین بھیج دیا جائے۔ اعظم شاہ نے اس پر عمل کر دیا۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت بنگال میں بدھ مذہب بالکل ختم نہیں ہوا تھا۔ اس کے چھ سال بعد اس کے جانشین سلطان سیف الدین نے سونے کی تختی پر لکھا ایک خط اور ایک زراف چینی شہنشاہ کو بھیجے۔

چین سے دوبارہ تعلق ہو جانے سے بنگال کی بحری تجارت میں مدد ملی۔ چین سے تجارت کے نتیجے میں چٹاگانگ ایک بڑی اچھی بیوپاری بندرگاہ بن گیا۔ بنگال میں سمندری جہاز بنتے تھے اور یہاں سے اعلیٰ درجے کا کپڑا برآمد ہوتا تھا۔ بنگال چینی اشیاء کے لیے دوبارہ برآمد کا مرکز بھی بن گیا۔ چین کے سفیر کے ساتھ آئے ترجمان ماہوان نے یہاں کا تذکرہ چھوڑا ہے۔ شہتوت کے پیڑوں اور بنگالی ریشم، ہرن کی کھال جیسے چکنے کاغذ کا بھی اس نے ذکر کیا ہے۔

اس [illegible] میں بہت سے صوفی بھی بنگال آئے۔ سلطان نے ان کا خیر مقدم کیا اور انھیں لگان معاف زمینیں عطا کیں۔ ان صوفیوں کی سادہ زندگی، سچی لگن اور ترکِ دنیا کا لوگوں پر بہت اثر پڑا۔ ان صوفیوں کی وجہ سے بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا اور مسلمان

ہو گئے۔ ایسا خاص طور پر مشرقی بنگال کے اُن حصوں میں ہوا جہاں بدھ مذہب کے ماننے والے پھیلے ہوئے تھے اور یہاں غربت اور بدحالی بہت تھی۔ گو کہ یہ تبدیلی مذہب بنیادی طور پر سماجی، ثقافتی اور کچھ دیگر وجوہات کی بنا پر ہوئی تھی لیکن اس تبدیلی کا سہرا ان صوفیوں کی برکت کے سر رہا۔

بہت سے ہندو راجہ بھی متواتر بنگال کے حکمرانوں کے تحت رہے اور انھیں ملکی معاملات میں برابر شریک بھی کیا جاتا رہا۔ چنانچہ دیناج پور کا راجہ گنیش جس کی بہت بڑی املاک اور اپنی فوج تھی اس نے پہلے سلطان سیف الدین کے وارثوں میں بادشاہ گر کا کردار ادا کیا اور پھر خود تختِ سلطنت پر قبضہ کرلیا۔ بہر حال، راجہ گنیش کو ملنے والی حمایت کی بنیاد واضح نہیں ہے۔ کچھ ترکی امراء اور مذہبی لوگوں نے جون پور کے حکمراں کو دعوت دی کہ وہ اسلامی زمینیں کو 'کفر سے نجات دلائے'۔ اس مقصد سے جون پور کی ایک فوج گوڑ بھیجی گئی جو فاتح رہی مگر یہ وہاں زیادہ دن ٹھہر نہ سکی کیونکہ اب تک جون پور اور دہلی کے درمیان کشمکش گرما گئی تھی۔ راجہ گنیش بوڑھا آدمی تھا، وہ جلدی ہی مر گیا۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا ہوا، جس نے ایک مسلمان کی حیثیت سے حکومت کرنا پسند کیا۔ بہر حال، 1493 میں جب تک علاء الدین حسین نے حکومت کی باگ ڈور نہیں سنبھالی، سلطنت کے معاملات میں استقلال پیدا نہ ہوا۔ علاء الدین حسین نے ایک نئے خاندان کی سلطنت کی بنیاد رکھی جو شیر شاہ کے منظر عام پر آنے تک حکومت کرتا رہا۔

فیروز سے معاہدے کے نتیجے میں دہلی کی طرف سے حملے کا خطرہ نہ ہونے اور اس کے بعد خود دہلی کی سلطنت کی کمزوری کی وجہ سے، بنگال کے سلاطین نے اپنے پایۂ تخت گوڑ (پرانا لکھنوتی) اور اس کے بعد 25 کلو میٹر شمال میں پانڈوا کو عالی شان عمارتوں سے خوب سجایا۔ اب اُن میں سے بہت کم باقی ہیں مگر کھنڈرات سے تعمیری کام کی وسعت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ جو سب سے بڑی عمارت ابھی باقی ہے وہ آدینہ مسجد ہے۔ اس مسجد میں کئی ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے تھے۔ حالانکہ مسجد میں لگے پتھر زیادہ تر آس پاس کے مندروں اور لکھنوتی کی دوسری عمارتوں سے ہی لاکر لگائے گئے تھے مگر مسجد میں چوڑی ڈھلواں محرابوں (drop archers) کچھ خاص طرح کے ستون اور منحنی خطوط والی چھتوں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ دہلی کی تعمیری روایات سے آزاد علاقائی طرز کے استعمال کے ساتھ ایک نیا طرزِ تعمیر اُبھرنا شروع ہو گیا تھا۔ یہ طرزِ تعمیر اپنے پختہ روپ میں (پندرھویں صدی

کے دوسرے نصف میں تعمیر شدہ) 'داخل دروازے' میں دیکھ جا سکتا ہے۔ عمارتیں عام طور پر اینٹ اور مسالے سے بنائی جاتی تھیں اور پتھر کا استعمال بہت کم ہوتا تھا۔ سجاوٹ کے لیے کنول اور ہنس وغیرہ کے استعمال سے ہندو روایات کے اثرات کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

سلطانوں نے بنگالی زبان کی بھی سرپرستی کی۔ سری کرشنا وجیہ کے مشہور و معروف شاعر مالادھر باسو کی سرپرستی سلطانوں نے کی اور اسے 'گن راجا خان' کا خطاب دیا۔ اس کے بیٹے کو 'ستیہ راجا خان' کے خطاب سے اعزاز دیا گیا۔ لیکن بنگالی کی ترقی کا سب سے سنہری دور علاء الدین حسین (1493 تا 1519) کا عہد تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں کچھ بہت مشہور بنگالی شاعر پھلے پھولے۔

روشن دماغ، علاء الدین حسین کے عہد سلطنت سے ایک بڑا روشن دور شروع ہوا۔ سلطان نے اپنی سلطنت میں امن وامان قائم کیا اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر ہندوؤں کا تقرر کر کے روادارانہ پالیسی اپنائی۔ چنانچہ اس کا وزیر ایک باصلاحیت اور لائق ہندو تھا۔ طبیبِ اعلیٰ، چیف باڈی گارڈ، ٹکسال کا افسر اعلیٰ، سب ہندو تھے۔ دو مشہور و معروف بھائی۔ روپا اور سناتن۔ جنھیں مقدس ویشنو کا احترام دیا جاتا تھا۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور ان میں سے ایک سلطان کا معتمد خاص (پرائیویٹ سکریٹری) تھا۔ راماین کا بنگالی میں ترجمہ کرنے والے کرتی باس کا خصوصی تعلق سناتن سے بتایا جاتا ہے۔ علاء الدین حسین کے کچھ امراء بھی بنگالی شعراء کی سرپرستی کرتے تھے۔ سلطان مشہور ویشنو سنت چیتنیہ کا بھی احترام کرتا تھا اور بنگالی زندگی میں ایک نئی روحانیت پیدا کرنے کی کوشش میں بھی کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہیں کی گئی۔

حسین شاہ نے شمال میں آسام کی طرف اپنی سرحدوں کو بڑھانے کی کوشش کی اور جنوب مغرب میں اڑیسہ کی طرف اور جنوب مشرق میں چٹاگانگ اور اراکان کی طرف توسیع کرنی چاہی۔ ان میں اُسے سب سے زیادہ کامیابی چٹاگانگ اور اَراکان میں سلطنت کی توسیع کی صورت میں حاصل ہوئی۔ حالانکہ اس فتح کی تفصیلات تو بہت کم موجود ہیں لیکن چٹاگانگ بندرگاہ پر قبضہ، ایک طرف چین تک، جنوب مشرقی ایشیا سے بحری تجارت کا ایک اہم رشتہ تھا اور دوسری طرف افریقہ تک کی تجارت کا ذریعہ تھا۔ بڑی سخت جنگوں کے ایک سلسلے کے بعد مشرق میں تپراپر بھی قبضہ کر کے سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔

باوجود آبو پہاڑ کے قریب گجرات کے حکمران نے معزالدین کوزبردست شکست دی۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ چولکیوں نے پرتھوی راج سے مدد مانگی لیکن اس کے وزیروں نے مدد دینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ غوریوں اور چولکیوں دونوں کو ہی چوہانوں کا دشمن سمجھتے تھے۔ اس وقت پرتھوری راج مشکل سے بارہ سال کا ہوگا اس لیے اس فیصلہ کے لیے اس کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

گجرات کے معرکہ میں شکست کے بعد معزالدین نے اپنا پورا لائحہ عمل بدل دیا 80-1179 میں غزنویوں سے پشاور فتح کرنے کے بعد وہ 1181 میں لاہور کی سمت بڑھا۔ غزنوی حکمراں خسرو ملک نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اسے لاہور میں حکومت کرنے کی اجازت دے دی گئی اور معزالدین سیالکوٹ سمیت پنجاب میں اپنے علاقے کو مسلسل بڑھاتا رہا۔ اس کے علاوہ سندھ میں ساحل تک اپنے قبضے کو مضبوط کرتا رہا۔ آخرکار 1186 میں معزالدین نے غزنوی حکمران کو معطل کر کے ایک قلعہ میں قید کر دیا اور کچھ سال بعد اس کو قتل کروادیا۔ اب غوریوں اور شمالی ہندوستان کے راجپوت حکمرانوں کے درمیان ٹکراؤ کے لیے میدان تیار تھا۔

ترائن کی جنگ:

پنجاب اور سندھ بں اپنی حیثیت مستحکم کرنے کے بعد 1191 میں معزالدین نے تبرہند کے قلعے پر حملہ کر کے سے فتح کر لیا جو دہلی کی حفاظت کے لیے بہت اہم قلعہ تھا۔ اس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ترکوں کو مستحکم ہونے کا موقع دیئے بغیر پرتھوی راج نے فوراً تبرہند کی طرف کوچ کیا۔ جنگ میں پرتھوی راج کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔ معزالدین کو، ایک واقعہ نگار کے مطابق، ایک خلجی گھوڑ سوار نے بچالیا اور زخمی سلطان کو حفاظت کے مقام تک پہنچایا۔ اپنی فتح کے بعد پرتھوی راج نے ہاری ہوئی غوری فوج کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی شاید اس لیے کہ وہ اپنے مقام سے دور دراز دشمنوں کے علاقے میں بہت اندر تک جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ غزنویوں کی طرح غوری بھی پنجاب پر قبضہ کر کے مطمئن ہو جائیں گے اس لیے اس نے تبرہند کے محاصرے کو صرف سرحدی لڑائی کی حیثیت دی اور کچھ مہینہ محاصرہ کرنے کے بعد اس پر قبضہ کر لیا۔

اس حقیقت کو کہ پرتھوی راج نے معزالدین کے ساتھ جھڑپ کو صرف سرحدی جنگ ہی سمجھا تھا اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ اپنی فتح کے بعد غوری سرداروں کے ساتھ

آسام:

آج کے آسام میں برہم پتر کی زرخیز وادی کو بنگال کے سلاطین نے ہمیشہ اپنے قبضہ میں رکھنے کی کوشش کی۔ بارھویں صدی کے درمیانی عرصے میں پالاؤں کے زوال کے بعد برہم پتر وادی بہت سی چھوٹی چھوٹی فرمانروائیوں میں تقسیم ہوگئی تھی جو ہمیشہ ایک دوسرے سے جنگ میں مصروف رہتی تھیں۔ رفتہ رفتہ مغرب میں کامروپ اور کامتا (جنھیں فارسی مورخ ادل بدل کر لکھتے تھے) کے حکمرانوں نے کرتویا اور برناڈی دریاؤں کے درمیانی حصے کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ ان کے مشرق میں اہوم تھے۔ اہوم اصل میں اس بڑے تائی قبیلوں کے گروپ سے تعلق رکھتے تھے جو جنوبی چین اور بہت سے جنوب مشرقی ملکوں پر تسلط رکھتے تھے۔ یہ یُنان سے تیرھویں صدی کے پہلے نصف میں برہم پُتر وادی میں داخل ہوئے تھے اور اپنے حکمراں سکھاپا کی سرکردگی میں انھوں نے اس علاقے پر تسلط قائم کرلیا تھا جسے اب ڈبروگڑھ اور سِب ساگر ضلعوں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ پوری وادی ان کے نام کی نسبت سے آسام کہلائی جانے لگی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ محمد بن بختیار خلجی تبت پر نگاہیں جمائے ہوئے ایک فوجی مہم کامروپ لایا تھا اور ایک انجان علاقے میں تباہ کن شکست سے دوچار ہوا تھا۔ اس کے بعد بھی اس علاقے کو اپنا تابعدار کرکے گوہاٹی پر مستقل اقتدار قائم کرنے کی ترکی گورنروں اور بنگال کے باغی حکمرانوں کی متعدد کوششیں وہاں کے موسم، جغرافیائی کیفیت اور اس علاقے کے مقامی باشندوں کی سخت مزاحمت کے سبب ناکام ہوچکی تھیں۔ بہرحال کچھ عرصے تک کامروپ / کاما کے حکمرانوں کو بنگال کو سونے اور ہاتھیوں کے روپ میں سالانہ خراج بھی ادا کرنا پڑا تھا اور یہی آگے چل کر اس کی مانگ کی بنیاد بنا۔

بنگال کے خود مختار سلطانوں نے اس سلسلے کو وہیں سے شروع کیا جہاں اُن کے پیش رو حکمراں اس میں ناکام ہوئے تھے۔ الیاس شاہ نے کامروپ پر حملہ کیا اور اس کے پایۂ تخت پر قبضہ کرلیا۔ بہرحال اہوم حکمرانوں کو تُرکوں کی اپنی سرحدوں سے اتنی قربت اچھی نہ لگی، چنانچہ تھوڑے عرصے بعد ہی اُن کی مدد سے کامروپ کے حکمراں نے تُرکوں کو کرتویا دریا کے دوسری طرف دھکیل دیا اور اب اِسی کو بنگال سلطنت کی شمال مشرقی سرحد تسلیم کرلیا گیا۔

بہرحال، بنگال کے حکمراں کسی پہلے مناسب موقعے یا کامروپ پر تسلط قائم کرلینے کا

پوراعزم کیے ہوئے تھے۔ یہ موقع انھیں کامروپ کے حکمراں اور اہوم کے درمیان آپسی دشمنی شروع ہو جانے سے مل گیا۔ چنانچہ علاء الدین حسین نے مغربی حصے -جس میں باجو تک آج کا کوچ بہار شامل ہے- پر حملہ کیا، قبضہ کیا، اور اُسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

داخلی سیاسی حالات، بار بار ہونے والی جنگوں -جن میں خودوادی کی اندرونی لڑائیاں اور بنگال کے گورنروں اور سلطانوں کی لڑائیاں- دونوں شامل تھیں۔ ان سب کے باوجود کامروپ اور کامتا نے علم حاصل کرتے رہنے اور سنسکرت سیکھنے کی اپنی قدیم روایات کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مختلف قبیلوں کے آپسی تعلق اور مختلف لوگوں کے میل جول سے ایک نئی زبان آسامی ابھرنی شروع ہوئی۔ آسامی میں پہلا ادبی کام ہیم سرسوتی کا 'پرہلاد چرت' مانا جاتا ہے۔ شنکرادیوا (پیدائش 1449) کی سربراہی میں، جدید ویشنو تحریک، کے ابھرنے سے اس زبان کو ایک نئی تحریک ملی۔ شمال مغربی ہندوستان کے بھکتی سنتوں کی طرح شنکرادیوا اور اس کے پیروکار مذہبی ظاہری رسوم کی بجائے دعاؤں اور گیان دھیان پر زیادہ زور دیتے تھے۔ عوام تک پہنچنے کے لیے یہ سنت ان کی اپنی زبان آسامی میں بولتے اور لکھتے تھے۔ ان کے مرکز جنھیں 'نام گھورا' کہا جاتا تھا ان کے نئے عقیدے کی تبلیغ اور ان کے ادب کی تقسیم و توسیع کے مرکز بن گئے۔

اس طرح پندرھویں صدی کو آسام کی ثقافتی اور ادبی نشاۃ ثانیہ کا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں ایک دوسری اہم بات رفتہ رفتہ اہوم لوگوں کا ہندوکرن بھی تھا، جو ان کے دیوی دیوتاؤں کو خود ہندو دیوتاؤں کے زمرے میں شامل کر لینے اور ہندو اشراف کے خاندان میں شادیوں وغیرہ سے وجود میں آیا۔ اہوم حکمرانوں کی یہ بات سمجھ میں آگئی کہ ہندو مذہب قبول کر لینے کا مطلب ہے کہ حکمرانوں کو ایک الوہی یا مذہبی درجہ حاصل ہو جائے گا جس سے خود اُن کے امراء کے درمیان اُن کی حیثیت اور مضبوط ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ قرابت رکھنے والے یا ایک ہی اصل رکھنے والے خاندانوں اور سرحدی قبیلوں کو شامل کر کے ہندو معاشرے کو اور تقویت حاصل ہوئی۔

اڑیسہ:

اس زمانے میں اڑیسہ اور بنگال کی سرحدیں بہت واضح نہیں تھیں۔ گنگا حکمراں جو گیارھویں صدی میں برسر اقتدار آئے تھے اور پندرھویں صدی کے درمیانی حصے تک حکومت کی

تھی، انھوں نے تین حصوں اُتکل، کالنگااور کوسالا کو متحد کیا، جن سے مل کر آج کا اڑیسہ بنا ہے۔ گنگا حکمراں بڑے جنگجو اور مندروں کی تعمیر کے شوقین تھے۔ نرسنگھ دیو (فوت 1264) جسے اس خاندان کے اہم ترین حکمرانوں میں گنا جاتا ہے، اس نے کونارک میں سوریہ مندر تعمیر کروایا تھا۔ اس نے جنوبی بنگال میں رادھا پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرلیااور کئی بار لکھنوتی کا محاصرہ کیاجو دہلی کی فوج کی بروقت مدد سے بچ گیا۔ اس زمانے میں بنگال اور اڑیسہ کی سرحد سرسوتی دریا پر تھی جس میں گنگا سے بہت ساپانی آتا تھا۔ اس طرح آج کے مدناپور ضلع کا بہت ساحصہ اور ہنگلی ضلع کے کچھ حصے اڑیسہ میں تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اڑیسہ کے حکمرانوں نے اپنی سرحدوں کو بھاگیرتی دریا تک بڑھانے کی کوشش کی مگر بنگال کے حکمرانوں کی مزاحمت کے نتیجے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

الیاس شاہ نے اپنے عہد حکومت کے آغاز میں جاج نگر (اڑیسہ) پر حملہ کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ پوری مدافعت جھیلتا ہوا وہ چلکا جھیل تک بڑھ گیااور بہت سامالِ غنیمت لے کر لوٹا جس میں بہت سے ہاتھی بھی تھے۔ کچھ سال بعد 1360 میں بنگال کی مہم سے واپسی پر فیروز تغلق نے بھی اڑیسہ پر حملہ کیا۔ اُس نے پایۂ تخت پر قبضہ کیا بہت سے لوگوں کو قتل کیااور مشہور جگن ناتھ مندر کی بے حرمتی کی۔ ان دو حملوں سے شاہی خاندان کے عزت واحترام کو بہت دھکا لگا مگر اس خاندان کی حکومت پندرھویں صدی کے درمیانی حصے تک کسی نہ کسی طرح کھنچتی رہی۔ اس کے بعد گجپتی خاندان کی نئی سلطنت قائم ہوئی۔ گجپتی عہد حکومت اڑیسہ کی تاریخ کا ایک روشن اور شان دار دور تھا۔ گجپتی حکمرانوں نے خاص طور پر جنوب میں کرناٹکا کی طرف اپنی سلطنت کی توسیع کی۔ جیسا ہم دیکھ چکے ہیں اس کی وجہ سے اُن کی مڈبھیڑ وجے نگر، ریڈی اور بہمنی سلطانوں سے ہوئی۔ گجپتی حکمرانوں کی، جنوب کی طرف توسیع کو ترجیح دینے کی شاید ایک وجہ یہ رہی ہو کہ انھوں نے محسوس کیا کہ بنگال کے سلاطین کو بنگال اڑیسہ کی سرحدوں سے ہٹانا طاقت کے اعتبار سے آسان نہیں ہے۔ حالانکہ جنوب کی طرف بڑھنے میں انھیں شان وشوکت اور مالِ غنیمت تو ہاتھ لگا مگر وجے نگر اور بہمنی سلاطین کی طاقت اور ذرائع کی مضبوطی کی وجہ سے وہ اپنے جنوبی مفقوحہ علاقوں پر زیادہ دن قابض نہ رہ سکے۔ مگر یہ بات کہ اڑیسہ کے حکمراں بیک وقت ایک طرف بنگال اور دوسری طرف کرناٹکا کے دور دراز علاقوں میں کامیابی کے ساتھ اُلجھے رہے، یہ بھی اُن کی جرأت اور طاقت دونوں کی تصدیق کرتی ہے۔ اس دور میں اُڑیا زبان نے بھی ترقی کی اور نظم ونثر دونوں میں کچھ اہم

تخلیقات ہوئیں۔

اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں مشرق کے مختلف علاقے پھولے پھلے اور ترقی حاصل کی۔ حالانکہ اس خطے کی سلطنتوں میں سب سے طاقت ور بہر حال بنگال کی سلطنت ہی تھی مگر یہ سلطنت بھی حملوں اور غارت گری سے آگے بڑھ کر آسام اور اڑیسہ کی ریاستوں کو اپنی گرفت میں نہ لا سکی۔ بنگال کی خود مختاری کے لیے ایک خطرہ اُس وقت ضرور پیدا ہوا جب لودیوں نے جون پور پر کامیاب حملہ کیا کیونکہ بنگال کے جونپور سے دوستانہ تعلقات تھے۔ جونپور کے شکست خوردہ حکمراں نے بنگال میں پناہ لی اور اُسے بڑے تپاک سے وہاں رکھا گیا۔ حالانکہ جب بنگال اور دہلی کی فوجیں کچھ عرصے آمنے سامنے کھڑی تھیں تو ٹکراؤ کا زبردست خطرہ بھی پیدا ہوا تھا مگر ایک معاہدے کے تحت خاموشی سے بہار کو دونوں سلطنتوں کے درمیان تقسیم کرلیا گیا۔

ii- مغربی ہندوستان: گجرات، مالوہ اور راجستھان:

علاقے کی وسعت، صحت بخش آب و ہوا اور زرخیز زمین کی وجہ سے گجرات اور مالوہ کا علاقہ ہر زمانے میں ایک قیمتی انعام کی حیثیت رکھتا تھا۔ گجرات اپنے اعلیٰ درجے کے حرفوں اور دستکاریوں اور مصروف بندرگاہوں کے لیے مشہور تھا۔ یہاں سے پورے شمالی ہندوستان کی تجارت چلائی جاتی تھی اور مالوہ اور راجستھان اس کے اہم عبوری مرکز تھے، جو گنگا وادی کی پیداواروں کو گجرات کی بندرگاہوں تک پہنچاتے تھے۔ اس طرح مالوہ اور گجرات پر گرفت اور راجستھان سے گزرنے والی سڑکوں کے سلسلے سے شمال یا جنوب کی کسی بھی شاہی طاقت کو دلچسپی رہتی تھی۔

پندرھویں صدی میں مالوہ اور گجرات کی طاقتیں آپس میں توازن قائم رکھتی تھیں۔ گو کہ دونوں اپنی سرحدوں سے ملی ہوئی راجستھانی ریاستوں پر اقتدار حاصل کرلینے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں مگر ان میں سے کوئی ایک بھی راجستھان میں بہت زیادہ اندر نہ گھس سکی جس کی بنیادی وجہ رانا کمبھا کی سربراہی میں میواڑ کی ابھرتی ہوئی مضبوط طاقت تھی۔ مگر یہ توازن سولھویں صدی کے ابتدائی دہوں میں بگڑنا شروع ہوا اور اس کے نتیجے میں ایک نئی صورتِ حال اُبھری۔

گجرات:

فیروز تغلق کے ماتحت گجرات کے ایک سیدھے سادے گورنر نے فرشتہ کے بیان کے مطابق "ہندو مذہب کی ہمت افزائی کی اور اس طرح بُت پرستی کو ختم کرنے کی بجائے اسے پھولنے پھلنے کا موقع دیا"۔ اس کا جانشین ایک شخص ظفر خان ہوا جس کا باپ سادھارن ایک نو مسلم راجپوت تھا اور اس نے اپنی بہن کی شادی فیروز تغلق سے کر دی تھی۔ تیمور کے دہلی پر حملے کے بعد گجرات اور مالوا خود مختار ہو گئے مگر برائے نام دہلی سے الحاق باقی رہا۔ بہر حال 1407 تک ظفر خان نے گجرات کا باقاعدہ حکمراں ہونے کا اعلان نہیں کیا۔ اب اس نے مظفر شاہ کا لقب اختیار کر لیا۔ دلاور خان غوری مانڈو میں گوالیار کی خود مختاری کا اعلان کچھ سال پہلے ہی کر چکا تھا۔

گجرات سلطنت قائم کرنے والا شخص فی الحقیقت احمد شاہ (اول۔ 1411 تا 1442) تھا، جو مظفر شاہ کا پوتا تھا۔ اپنے لمبے عہد حکومت میں اس نے امراء پر پوری گرفت حاصل کی، انتظامیہ کو مضبوطی سے قائم کیا اور سلطنت کی توسیع کر کے اس کو مستحکم اور مضبوط کیا۔ اس نے اپنا دارالسلطنت پٹن سے منتقل کر کے نئے شہر احمد آباد میں منتقل کیا۔ اس شہر کی بنیاد اس نے 1413 میں رکھی تھی۔ اسے تعمیرات کا بہت شوق تھا اور اس نے احمد آباد شہر کو خوبصورت اور شاندار محلات، مسجدوں، مدرسوں اور بازاروں سے بہت کچھ اپنا کر ایک ایسے نئے طرزِ تعمیر کی ابتدا کی جو دہلی کے طرزِ تعمیر سے بیّن طور پر مختلف تھا۔ اس طرز کی کچھ خصوصیات میں بہت شبک بُرجیاں، پتھر پر تفصیلی اور خوبصورت نقاشی اور نازک دیوار گیریاں شامل تھیں۔ اس دور کے طرزِ تعمیر کی بہترین مثال احمد آباد کی جامع مسجد اور تین دروازہ ہیں۔ احمد شاہ نے سوراشٹر کے علاقے میں راجپوت ریاستوں اور گجرات اور راجستھان کی سرحدی ریاستوں تک بھی اپنا تسلط بڑھانے کی کوشش کی۔ سوراشٹر میں اس نے گیرنار کے مضبوط قلعے پر حملہ کر کے اُسے فتح تو کر لیا مگر وہاں کے راجہ سے خراج وصول کر کے اُسے پھر بحال کر دیا۔ پھر اس نے مشہور ہندو تیرتھ گاہ سِدھ پور پر حملہ کیا اور وہاں کے بہت سے خوبصورت مندروں کو مسمار کیا۔ پیش کش یا سالانہ خراج کے علاوہ اس نے گجرات کے ہندو حکمرانوں پر جزیہ عائد کیا، جسے اس سے پہلے اُن پر کبھی نہیں لگایا گیا تھا۔ بہر حال، جس طرح دہلی سلطنت میں لگان کے ایک حصے کے طور پر جزیہ (خراج) افراد سے جمع کیا جاتا تھا گجرات میں جزیہ اور پیش کش دونوں راجاؤں سے وصول کیے جاتے ہوں گے۔ اِن تمام

اقدامات کی بنیاد پر قرون وسطیٰ کے بہت سے مورخوں نے احمد شاہ کی کافروں کے زبردست دشمن کے روپ میں تعریف و تحسین کی ہے جبکہ بہت سے جدید مورخین نے اسے متعصب اور کٹر کہا ہے۔ لیکن اصلی صورتِ حال فی الحقیقت کافی گنجلک سی محسوس ہوتی ہے۔ جبکہ ایک طرف احمد شاہ ہندو مندروں کو مسمار اور ختم کر دینے کے سلسلے میں فی الحقیقت کٹر تھا مگر دوسری طرف وہ اپنی حکومت میں بہت سے ہندوؤں کو سرکاری عہدوں میں داخل کرنے کے سلسلے میں ذرا نہیں ہچکچایا۔ مانک چند اور موتی چند جو بنیا یا بیوپاری طبقے سے تعلق رکھتے تھے وہ اس کے عہدِ حکومت میں وزیر رہے وہ عدل و انصاف کے معاملے میں بھی اتنا ہی سخت تھا کہ اس نے اپنے داماد کو ایک قتل کے سلسلے میں سزا کے طور پر سر بازار قتل کروایا تھا۔ یقیناً وہ ہندو راجاؤں سے لڑا، مگر مسلم حکمرانوں سے بھی اپنے وقت میں اتنا ہی لڑا جن میں مالوہ، خاندیش اور دکن کے حکمراں شامل تھے۔ اس نے ایدار کے مضبوط قلعے کو اپنے ماتحت کیا اور جھالاوار، بوندی، ڈونگر پور جیسی راجپوت ریاستوں کو بھی اپنی گرفت میں لیا۔

شروع سے ہی گجرات اور مالوہ کی سلطنتیں ایک دوسرے کی سخت رقیب چلی آرہی تھیں اور لگ بھگ ہر موقعے پر ہمیشہ مخالف کیمپ میں رہی تھیں۔ وجے نگر اور بہمنی حکمرانوں کے درمیان جنگوں کی طرح مالوہ اور گجرات کے درمیان جنگوں سے بھی اُن کی ریاستوں کی سرحدوں میں کوئی مستقل قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

مالوہ میں دلاور خاں کے جانشین ہوشنگ شاہ کو مظفر شاہ نے شکست دی اور قید کر دیا۔ مگر مالوہ پر قبضہ برقرار رکھنے کو ناممکن سمجھتے ہوئے اُس نے ہوشنگ شاہ کو کچھ سال بعد آزاد کر دیا اور اُسے دوبارہ تخت پر بٹھادیا۔ اس سے مالوہ کے حکمرانوں کے زخموں پر مرہم رکھے جانے کے بجائے اُن کے دل میں گجرات سے اور پرخاش پیدا ہو گئی۔ وہ برابر اس موقعے کی تلاش میں رہنے لگے کہ گجرات کے اندر ناخوش اور حکومت مخالف عناصر کو ابھارتے اور مدد دیتے رہیں خواہ وہ دربار کے ناخوش یا باغی امراء ہوں یا گجرات کے حکمراں کے خلاف لڑنے والے ہندو راجہ ہوں۔ گجرات کے حکمرانوں نے اس کا جواب اس طرح دینے کی کوشش کی کہ مالوہ کے تخت پر ان کا نامزد کردہ سلطان تخت نشین ہو۔ اس سنگین قسم کی رقابت نے دونوں سلطنتوں کو اتنا کمزور کر دیا کہ شمالی ہندوستان کی سیاست میں اُن کے لیے کوئی اہم کردار ادا کرنا ممکن نہ ہو سکا۔

محمود بیگڑھا:

احمد شاہ کے جانشینوں نے بھی توسیع اور ان علاقوں میں تسلط اور استحکام کی پالیسی کو جاری رکھا۔ گجرات کا سب سے مشہور بادشاہ محمود بیگڑھا تھا جس نے گجرات پر پچاس سال سے زیادہ 1459 سے 1511 تک، حکومت کی۔ اسے بیگڑھا اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس نے دو مضبوط ترین قلعے (گڑھ) فتح کیے تھے جن میں ایک سوراشٹر میں گرنار تھا (جواب جوناگڑھ کہلاتا ہے) اور دوسرا جنوبی گجرات میں چمپانیر کا قلعہ تھا۔[1] گرنار کا حکمراں اُسے پابندی سے خراج ادا کرتا تھا مگر محمود بیگڑھا نے سوراشٹر پر قبضہ کر لینے کی پالیسی کے تحت گرنار کی سلطنت کو مکمل طور پر اپنی سلطنت میں شامل کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ سوراشٹر بہت خوشحال اور ترقی پذیر علاقہ تھا اور اس میں کچھ بہت زرخیز قطعے اور مصروف قسم کی بندرگاہیں تھیں۔ بدقسمتی سے سوراشٹر کے علاقے میں ڈاکوؤں اور بحری قزاقوں کی بھی بہتات تھی جن کا شکار تجارت اور جہازرانی کا کاروبار رہتا تھا۔ گرنار کا مضبوط قلعہ صرف سوراشٹر پر حکومت اور نظم و نسق قائم رکھنے کے لیے ہی موزوں نہیں تھا بلکہ سندھ کے خلاف مہمیں شروع کرنے کے لیے بھی ایک اچھا مرکز تھا۔

محمود بیگڑھا نے بہت بڑی فوجی طاقت کے ساتھ گرنار کے قلعے کا محاصرہ کیا۔ حالانکہ راجہ کے پاس قلعے میں تھوڑی سی ہی توپیں تھیں اس نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن اس سے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ کہا جاتا ہے اس قلعے کی فتح، جس تک پہنچنا ناممکن تھا، سازش کی وجہ سے ممکن ہو سکی۔ گرنار کے حکمراں نے اپنے کامدار (وزیر/ایجنٹ) کی بیوی کو جبراً چھین لیا تھا جس نے چپ چاپ اپنے مالک کے خلاف سازش کر دی۔ قلعے کی فتح کے بعد گرنار کا راجہ مسلمان ہو گیا اور اُسے سلطان کی خدمت میں داخل کر لیا گیا۔ سلطان نے قلعے کی پہاڑی کے دامن میں ایک نیا شہر مصطفےٰ آباد کے نام سے بسایا۔ اس نے یہاں بہت سی عظیم الشان عمارتیں بنوائیں اور اپنے امراء سے بھی اس کی فرمائش کی۔ اس طرح یہ گجرات کا دوسرا دارالسلطنت ہو گیا۔

بعد میں محمود بیگڑھا نے دوارکا کو لوٹا، جس کی اہم وجہ یہ تھی کہ بحری قزاقوں کو یہاں سے پشت پناہی حاصل تھی جو تاجروں کو لوٹتے تھے۔ ویسے اس پر حملے کی فوری وجہ یہ تھی کہ مولانا محمود سمرقندی، جو ہُرمُز سے لوٹ رہے تھے، انھوں نے شکایت کی تھی کہ انھیں مجبور کر کے

(1) ایک اور روایت کے مطابق وہ بیگڑھا اس لیے کہلاتا تھا کہ اس کی مونچھیں گائے کے سینگوں (بیگاڑھا) جیسی تھیں۔

ساحل پر لایا گیا اور اُن کا سارا سامان لوٹ لیا گیا اور قزاقوں کو وہاں کے حکمراں نے پناہ دی۔ بہر حال اس حملے کو وہاں کے مشہور ہندو مندروں کو مسمار کرنے کے سلسلے میں بھی استعمال کیا گیا۔

جہاں تک چمپانیر کے قلعے کا سوال ہے یہ سلطان کے خاندیش اور مالوہ پر تسلط کے منصوبے کی راہ میں بڑے کانٹے کی جگہ پر واقع تھا۔ یہاں کا حکمراں گو کہ گجرات کی ہی ایک جاگیر داری ریاست کا حاکم تھا مگر اس کے تعلقات مالوہ کے سلطان سے بھی بہت گہرے تھے۔ چمپانیر کا قلعہ 1454 میں اس صورت میں فتح ہوا جب یہاں کے بہادر راجہ اور اُس کے سپاہیوں نے، ہر طرف سے امداد کی توقعات کے ٹوٹ جانے کے بعد، پہلے جوہر کی رسم ادا کی اور پھر آخری آدمی تک لڑ کر ختم ہو گیا۔ محمود نے چمپانیر کے پاس ایک نیا شہر محمود آباد بسایا۔ اُس نے وہاں بہت اچھے باغات لگوائے اور اُسے اپنی مخصوص رہائش گاہ بنالیا۔

محمود بیگوھا کو پرتگالیوں سے بھی بھڑنا پڑا جو مغربی ایشیائی ممالک سے گجرات کی تجارت پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ اسی نے پرتگالیوں کی بحری طاقت کو روکنے کے لیے مصر کے حکمرانوں سے بھی تعلق قائم کیا مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

چمپانیر اب صرف کھنڈر ہے، لیکن جو عمارت اب بھی توجہ کا مرکز ہے وہ جامع مسجد ہے۔ اس کا صحن مسقف (چھت دار) اور اس میں جین طرزِ تعمیر کے بہت سے اصول اپنائے گئے ہیں۔ اس دور میں جو دوسری عمارتیں بنیں اُن میں پتھر کا کام اتنا نفیس ہے کہ اسے صرف سنار ہی کے کام کے مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔

محمود بیگوھا کے طویل اور پُر امن دور میں تجارت اور کاروبار میں ترقی ہوئی۔ اُس نے تاجروں کی سہولت کے لیے بہت سی کاروان سرائیں اور سرائیں بنوائی۔ تاجر اس کے دور میں بہت خوش تھے کیونکہ آمد و رفت کے لیے شاہراہیں پُر امن تھیں۔

حالانکہ محمود بیگوھا نے کبھی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن عالموں فاضلوں کے متواتر تعلق سے اُسے بہت کافی معلومات حاصل تھیں۔ اس کے عہد میں بہت سی عربی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کا درباری شاعر اُدیا راجہ تھا جو سنسکرت میں لکھتا تھا۔

محمود بیگوھا کی صورت شکل بھی غیر معمولی تھی۔ اس کی لہراتی داڑھی اس کے پیٹ

تک پہنچتی تھی اور اس کی مونچھیں اتنی لمبی تھیں کہ وہ انھیں اپنے سر پر باندھ لیتا تھا۔ باربو سا سیاح کے مطابق، محمود بچپن سے ہی کسی قسم کے زہر پر پلا تھا یہاں تک کہ اگر کوئی مکھی اس کے ہاتھ پر بیٹھ جاتی تھی تو وہ پھولنے لگتی تھی اور فوراً گر کر مر جاتی تھی۔

محمود اپنی زبردست بھوک کے لیے بھی مشہور تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ناشتے میں ایک پیالہ شہد، ایک پیالہ مکھن اور سو سے ڈیڑھ سو تک کیلے کھاتا تھا۔ 10 سے 15 کلو کھانا دن بھر میں کھاتا تھا اور بتایا جاتا ہے کہ قیمہ بھرے سموسے اس کے تکیے کے دونوں طرف رکھ دیے جاتے تھے تاکہ رات کو اگر بھوک لگے تو پریشانی نہ ہو۔

شروع سے ہی گجرات کے حکمرانوں نے اپنے کچھ ماتحت راجپوت حکمرانوں کے خاندانوں میں شادی کرنے کی پالیسی بنا رکھی تھی۔ چنانچہ 1446 میں ایدار کے راجہ کی لڑکی کی گجرات کے حکمراں سے شادی ہوئی۔ مظفر شاہ دوم کی ماں بھی راجپوت تھی اور خود اس نے بھی کئی راجپوت شہزادیوں سے شادی کی تھی۔ گو کہ گجراتی حکمرانوں کی خدمت میں بہت سے ہندوؤں نے ترقی کی، جیسے راجیہ رائن جو محمود بیگڑھا کا سب سے بڑا امیر تھا، اور ملک گوپی جو وزیر اعظم تھا، لیکن شادی بیاہ کے رشتوں نے نہ تو سلطانوں کی مجموعی پالیسیوں میں کوئی تبدیلی پیدا کی نہ ان خاندانوں میں کسی طرح سیاسی اعتبار سے کوئی قربت پیدا ہوئی۔

گجرات کی سلطنت ایک طاقتور، انتظامی امور میں بہت مستحکم اور خوشحال ریاست رہی اور بہرحال اتنی مضبوط بھی رہی کہ پرتگالی اس کی سرحدوں یا بندرگاہوں میں کوئی موثر قسم کی مداخلت نہ کر سکے۔ لیکن بہادر شاہ کی مالوہ اور راجستھان پر اپنی گرفت قائم کر لینے کی کوشش کے نتیجے میں اس کا ٹکراؤ مغلوں سے ہوا اور یہی اسے ختم کر دینے کے لیے کافی تھا۔

مالوہ اور میواڑ:

مالوہ ریاست نرمدا اور تاپتی دریاؤں کے درمیان اونچے سطح مرتفع میں واقع تھی۔ گجرات اور شمالی ہندوستان کی شاہراہوں اور اسی طرح شمالی اور جنوبی ہندوستان کو جوڑنے والے راستوں پر اس کی گرفت تھی۔ جب تک مالوہ ریاست مضبوط اور طاقتور رہی یہ گجراتی، میواڑی، بہمنی اور دہلی کے لودی سلطانوں کی امنگوں اور حوصلوں کے لیے ایک رکاوٹ کا کام دیتی رہی۔ شمالی ہندوستان کی جغرافیائی

صورت حال ایسی تھی کہ اگر اس علاقے کی کوئی بھی طاقتور اور مضبوط ریاست مالوہ پر اپنی مکمل گرفت قائم کر لیتی تو وہ پورے شمالی ہندوستان پر تسلط قائم کر لینے کی راہ پر آسانی سے لگ سکتی تھی۔

پندرھویں صدی کے دوران مالوہ ریاست اپنے عروج پر تھی۔ اس کا دارالسلطنت دھار سے مانڈو میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ جگہ دفاعی اعتبار سے بہت محفوظ اور قدرتی اعتبار سے بہت خوبصورت تھی۔ یہیں مالوہ کے حکمراں نے بہت سی عمارتیں بنوائیں جن کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں اور اپنی شان و شوکت کا اثر ڈالتے ہیں۔ گجرات کے طرزِ تعمیر کے برخلاف مانڈو کی عمارتیں بہت چوڑی چکلی تھیں اور انھیں اور زیادہ بااثر بنانے کے لیے انھیں بہت اونچے چبوتروں پر قائم کیا گیا تھا۔ ان میں سب سے مشہور جامع مسجد، ہنڈولا محل اور جہاز محل ہیں۔

شروع سے ہی مالوہ کی ریاست داخلی تنازعوں اور کشمکشوں میں گھری ہوئی تھی۔ تخت کے دعوے داروں کے درمیان کھینچ تان کے ساتھ امراء کے مختلف گروپوں میں طاقت اور منفعت کے حصول کے لیے آپسی جھگڑے بھی ہمیشہ چلتے رہتے تھے۔ پڑوسی ریاستیں گجرات اور میواڑ میں فرقہ بندی کا فائدہ اپنے حق میں اٹھانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی تھیں۔

مالوہ میں شروع کے ایک بادشاہ ہوشنگ شاہ نے مذہبی رواداری کی ایک عام پالیسی اپنائی۔ بہت سے راجپوتوں کو جن میں سے کچھ آج کے اتر پردیش سے تعلق رکھتے تھے، مالوہ میں رہنے کی ترغیب فراہم کی گئی اور قیمتی مالی امداد عطا کی گئی۔ ان میں سے ایک رائے سلہادی بھی تھا۔ میواڑ کے رانا موکل کے دو بڑے بھائیوں کو مالوہ میں جاگیریں دی گئیں۔ للت پور کے مندر کے ایک کتبے سے، جو اسی دور میں بنا تھا ظاہر ہوتا ہے کہ مندروں کی تعمیر پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ہوشنگ شاہ نے جینیوں کی بھی سرپرستی کی جو اس زمانے میں اس علاقے کے بنیادی بیوپاری اور بینک کار زمرے میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ نردیو اسونی، جو ایک کامیاب بیوپاری تھا، ہوشنگ شاہ کا خزانچی اور اس کے مشیروں میں سے ایک تھا۔

بدقسمتی سے مالوہ کے سارے حکمراں اتنے روادار نہ ہوئے۔ محمود خلجی (1436 تا 1469) جو مالوہ کے حکمرانوں میں سب سے مضبوط حکمراں مانا جاتا ہے، اس نے میواڑ کے رانا کمبھا اور آس پڑوس کے دوسرے راجاؤں سے فوجی مقابلے کے دوران بہت سے مندر تباہ کیے۔ گو کہ

مستقبل کے مقابلے کے لیے اس نے بہت کم تیاری کی۔ 'پرتھوی راج رس' میں پرتھوی راج پر الزام لگایا گیا ہے کہ وہ حکومت کے کاموں کی طرف سے لاپرواہی برت کر عیش و عشرت میں مصروف رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ الزام سچ نہ ہو لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس نے غوریوں کی طرف سے حملے کے خطرے کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔

1192 میں ترائن کی دوسری جنگ کو ہندوستان کی تاریخ میں صحیح طور پر ایک اہم موڑ سمجھا جاتا ہے۔ معزالدین نے مقابلے کے لیے بہت احتیاط کے ساتھ تیاری کی تھی اور ان امیروں کو سزا دی تھی جو پچھلی لڑائی میں میدان میں ثابت قدم نہیں رہے تھے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ دونوں طرف کی فوجوں میں حقیقتاً کتنی تعداد تھی۔ منہاج السراج کے مطابق جو اس وقت کا واقعہ نگار تھا، معزالدین کے پاس 120,000 سپاہی لوہے کے بکتر اور ہتھیاروں سے پوری طرح لیس تھے۔ سترھویں صدی کے تاریخ داں فرشتہ کا کہنا ہے کہ پرتھوی راج کے پاس 3,000 ہاتھی، 300,000 گھوڑ اسوار اور کافی تعداد میں پیدل فوج تھی۔ یہ تعداد بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر بتائی گئی معلوم ہوتی ہے شاید اس لیے کہ اس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ معزالدین نے کتنا مقابلہ کیا اور اس کو کتنی زبردست فتح حاصل ہوئی۔ لیکن ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ پرتھوی راج کی فوجیں اس کے مخالف کی فوجوں سے زیادہ تھیں۔ فرشتہ یہ بھی لکھتا ہے کہ پرتھوی راج کی اپیل پر ہندوستان کے تمام رئیس اس کے ساتھ ہو گئے تھے۔ حالانکہ اس میں بھی شبہ ہے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ پرتھوی راج نے اپنی جنگی پالیسیوں کی وجہ سے اپنے آپ کو آس پاس کے تمام طاقتور پڑوسیوں سے علیحدہ کر لیا تھا اور نہ ہی فرشتہ نے کسی اہم رئیس کا نام لیا ہے۔ شاید پرتھوی راج کی فوجوں میں دہلی کے حکمراں گووند راج سمیت اپنے ہی بہت سے جاگیر دار شامل تھے۔ یہ طاقت کے بجائے کمزوری کی وجہ تھی کیونکہ ان جاگیر داروں میں معزالدین کی فوجوں کی طرح لیڈر شپ یا مرکزی رہنمائی کی کمی تھی۔

ترائن کی لڑائی صف آرائی کے بجائے نقل و حرکت کی لڑائی زیادہ تھی۔ معزالدین کے کم ہتھیاروں سے لیس سوار تیر انداز پرتھوی راج کی سست رفتار فوج کو ہراساں کیے رہتے اور ان کی فوجوں میں انتشار پیدا کر کے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتے۔ پرتھوی راج کو زبردست شکست

اُس کے اس عمل کو کسی طرح صحیح نہیں مانا جاسکتا مگر عام طور پر ایسا جنگ کے دوران ہی کیا گیا اور اِسے مندروں کی عمومی تباہی اور بربادی کی باقاعدہ پالیسی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ محمود خلجی ایک بے چین طبیعت اور اولوالعزم قسم کا خود مختار بادشاہ تھا۔ وہ لگ بھگ اپنے سب پڑوسی حکمرانوں سے لڑا۔ گجرات کے حکمراں گونڈوانہ اور اڑیسہ کے راجہ، بہمنی سلطان یہاں تک کہ دہلی کے سلطانوں سے بھی بہر حال اس نے اپنی طاقت کو بنیادی طور پر جنوبی راجستھان کے تاخت و تاراج کرنے اور میواڑ کو اپنا محکوم بنالینے کی کوشش میں صرف کیا۔

پندرھویں صدی کے دوران میواڑ کی طاقت کا رفتہ رفتہ ابھرنا شمالی ہندوستان کی سیاسی زندگی میں کافی اہمیت رکھتا تھا۔ علاء الدین خلجی کے ہاتھوں رنتھمبور فتح ہو جانے سے راجپوتانہ میں چوہان طاقت کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر اس تباہ شدہ طاقت سے کئی چھوٹی چھوٹی نئی ریاستیں ابھریں۔ تغلق اقتدار کے زوال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مارواڑ کے راؤ چندا نے سانبھر، ناگور اور اجمیر پر قبضہ کر کے مارواڑ کو راجستھان کی سب سے مضبوط طاقت بنالیا۔ بعد میں راؤ جودھا (1438 تا 1489) جسے کچھ عرصے بھٹکتے پھرنے کی زندگی گزارنی پڑی تھی، نے جودھ پور نام سے نئے شہر کی بنیاد ڈالی اور اسے 1659 میں اپنا پایۂ تخت بنالیا اور اپنی ریاست کو ایک نیا استحکام دیا۔

اس علاقے میں دوسری اہم ریاست ناگور کی مسلم فرمانروائی تھی۔ اجمیر جو بہت سے مسلمان گورنروں کا صدر مقام رہا تھا، متعدد ہاتھوں میں تبدیل ہوا اور ابھرتی ہوئی راجپوت ریاستوں کے لیے ایک مستقل جھگڑے کی جڑ بن گیا۔ مشرقی راجپوتانہ پر تسلط بھی ایک متنازعہ مسئلہ تھا چونکہ دہلی کے حکمراں اس سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

ریاست میواڑ کی ابتدائی تاریخ کچھ دھندلی ہے۔ گو کہ یہ آٹھویں صدی سے چلی آرہی تھی لیکن جس حکمراں نے اِسے ایک قابلِ ذکر طاقت کا درجہ عطا کیا وہ رانا کمبھا (1433 تا 1468) تھا۔ اپنے داخلی حریفوں کو یکے بعد دیگرے شکست دے کر بڑی احتیاط سے اُس نے پہلے اپنے علاقے میں استحکام پیدا کیا پھر اس نے سانبھر، ناگور، اجمیر، رنتھمبور وغیرہ پر قبضہ کیا اور پھر اپنی سرحدوں سے ملی ہوئی ریاستوں بوندی، کوٹا، ڈونگر پور وغیرہ کو اپنے قبضے میں کیا۔ چونکہ اس سے پہلے کوٹا مالوہ کو اور ڈونگر پور گجرات کو، خراج دے رہا تھا اس لیے اب کمبھا ان دونوں سلطنتوں کے

مدِ مقابل کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ بھی مقابلے کے دوسرے اسباب موجود تھے۔ رانا نے اپنے دربار میں محمود خلجی کے ایک مخالف شخص کو نہ صرف اپنے دربار میں پناہ دے دی تھی بلکہ اُسے مالوہ کے تختِ سلطنت پر بٹھانے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس کے جواب میں محمود خلجی نے رانا کے کئی مخالفوں کو اپنے دربار میں پناہ دی اور انھیں باقاعدہ رانا کے خلاف ابھارنے کی کوشش کی۔ ان میں خود رانا کا بھائی موکال بھی شامل تھا۔

کمبھا اپنے پورے دورِ حکومت میں گجرات اور مالوہ سے ٹکراؤ میں پھنسا رہا۔ پھر اس کا زیادہ وقت مارواڑ کے راٹھوروں سے لڑنے جھگڑنے میں گزرا۔ ان تمام سمتوں سے متواتر زبردست دباؤ کے باوجود رانا میواڑ میں اپنی حیثیت واقتدار کو برقرار رکھنے میں عام طور پر کامیاب رہا۔ گجرات کی فوجوں نے کئی بار کمبھل گڑھ کا محاصرہ کیا اور محمود خلجی تو اس کے علاقے میں اجمیر تک گھس آیا اور وہاں اس نے اپنا گورنر بھی بٹھا دیا۔ بہر حال رانا ان تمام حملوں کو پسپا کر دینے میں اور لگ بھگ اپنے پورے مفتوحہ علاقے میں اپنا تسلط برقرار رکھنے میں کامیاب رہا، سوائے ان چند علاقوں کے جو بالکل سرحد پر واقع تھے، جن میں رنتھمبور بھی شامل تھا۔ ان دو مضبوط طاقتوں کا مقابلہ کرتے رہنا بھی رانا کمبھا کا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔

کمبھا عالموں کا مربی بھی تھا اور خود بھی پڑھا لکھا شخص تھا۔ اس نے کئی کتابیں بھی تالیف کی جن میں سے کچھ ابھی تک موجود ہیں اور پڑھی جا سکتی ہیں۔ اس کے محل کے کھنڈر اور چتوڑ میں اس کا بنوایا فتح مینار (کیرتی استمبھ) اس کا مظہر ہیں کہ وہ ایک عالی ہمت معمار بھی تھا۔ اُس نے آبپاشی کے لیے بہت سے تالاب اور جھیلیں وغیرہ بھی بنوائیں۔ اس کے عہد میں بنے کچھ مندروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک سنگ تراشی اور بُت سازی کا فن اپنے اعلیٰ درجے پر باقی تھا۔

کمبھا کو اُس کے بیٹے اودا نے تخت حاصل کر لینے کی غرض سے قتل کر دیا۔ گو کہ اودا کو تو جلدی ہی نکال دیا گیا مگر اُس نے گدی کے لیے اپنے پیچھے ایک لمبی کشمکش چھوڑ دی۔ کچھ عرصے تک اپنے بھائیوں سے طویل سنگین جنگوں کے بعد رانا سانگا میواڑ کی گدی پر قابض ہوا۔ جو حالات پیدا ہوئے وہ مالوہ ریاست کی داخلی ٹوٹ پھوٹ اور انتشار تھے۔ محمود دوم مشرقی مالوہ کے طاقتور لیڈر میدنی رائے سے الجھ پڑا جس نے اُسے تخت حاصل کرنے میں مدد دی تھی۔ مالوہ کے حکمراں نے

گجرات سے مدد چاہی، دوسری طرف میدینی رائے رانا سانگا سے جاملا۔ 1519 کی جنگ میں رانا نے محمود (دوم) کو شکست دی اور اُسے قیدی بنا کر چتوڑ کی طرف لے گیا مگر کہا جاتا ہے کہ چھ مہینے بعد اُس کے ایک بیٹے کو ضمانت کے طور پر اپنے پاس رکھ کر اُسے چھوڑ دیا۔ اس طرح مشرقی مالوہ جس میں چندیری بھی شامل تھا رانا سانگا کے تسلط میں آگئے۔

مالوہ کی اس صورتِ حال سے دہلی کے لودی سلطان بھی چونکے، چونکہ وہ خود مالوہ پر اپنا تسلط قائم کر لینے کا خیال رکھتے تھے۔ چندیری پہلے ہی لودی سلطانوں کی بالادستی قبول کر چکا تھا۔ اس سلسلے میں لودی سلطانوں اور رانا سانگا کے درمیان متواتر کئی مقابلے بھی ہوئے۔ جنوبی راجستھان میں ہراوتی کی سرحد پر گھتولی کے مقام پر 1518 کی ایک جنگ میں ابراہیم لودی کو کافی سخت پسپائیوں کا سامنا کرنا پڑا مگر سانگا بھی زخمی ہوا جس سے وہ ساری زندگی کے لیے لنگڑا ہو گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ لودیوں اور سانگا کی فوجوں میں جھڑپوں کا سلسلہ متواتر جاری رہا اور سانگا کا اثر رفتہ رفتہ آگرہ کے خطے میں فتح پور سیکری کے پاس بہنے والے پیلیا کھیر دریا تک پھیل گیا۔

اس دوران بابر نے ہندوستان کی سرحدوں تک پہنچنا شروع کر دیا تھا۔ اب شمالی ہندوستان میں اقتدارِ اعلیٰ کے لیے آخری مقابلہ اب بالکل ناگزیر ہوتا ہوا نظر آرہا تھا۔

iii- شمال مغربی اور شمالی ہند۔ شرقی، لودی سلطان اور کشمیر:

جب ہندوستان پر تیمور کی یلغار اور دہلی پر حملے کے بعد تغلق سلطان بھاگ کھڑا ہوا تو تیمور نے ہندوستان کی باگ ڈور خضر خاں کو سونپ دی جو پہلے ملتان کا گورنر رہ چکا تھا۔ اس سے پہلے تیمور ملتان اور دیپال پور کی باگ ڈور خضر خاں کو سونپ چکا تھا۔ مگر تغلق سلطان واپس آگیا اس لیے خضر خاں دہلی سے دور رہا اور اپنا تسلط ملتان اور پنجاب پر برقرار رکھا۔ 1412 میں تغلق حکمراں کے انتقال کے بعد وہ دہلی میں داخل ہوا اور اس نے ایک نئے خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈالی جسے سیّد خاندان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سید تیموری حکمرانوں کے ماتحت نہیں تھے گو کہ اُن کا نام خطبے میں بھی کچھ عرصے لیا جاتا رہا۔ بہرحال سید کبھی بھی سلطنت پر پوری طرح گرفت حاصل نہ کر سکے اور تمام عرصے کبھی پنجاب کے کھوکر، کبھی میواتی اور کبھی جونپور کے شرقی حکمراں اُن کے لیے خطرہ بنے رہے۔

جونپور کی سلطنت فیروز تغلق کے ایک ممتاز امیر ملک سرور نے قائم کی تھی۔ ملک سرور کچھ عرصے وزیر بھی رہا تھا اور پھر 'ملک الشرق' کے خطاب کے ساتھ مشرقی علاقوں کے لیے نامزد کر دیا گیا تھا۔ اسی خطاب کی وجہ سے اس کے جانشین شرقی کہلائے گئے۔ شرقی سلاطین نے (مشرقی اتر پردیش میں) اپنا پایۂ تخت جونپور مقرر کیا جسے انھوں نے عظیم الشان محلات، مسجدوں اور مقبروں سے سجایا۔ ان مسجدوں اور مزاروں میں سے اب بہت کم باقی ہیں۔ ان عمارتوں سے اظہار ہوتا ہے کہ ان سلطانوں نے دہلی کے طرزِ تعمیر کی صرف نقل ہی نہیں کی بلکہ انھوں نے خود اپنا ایک شاندار طرز اختیار کیا جس میں بڑے بڑے اونچے دروازے اور زبردست محرابیں خصوصی حیثیت رکھتی تھیں۔

شرقی سلاطین علم و ثقافت کے بھی بہت بڑے سرپرست اور مربّی تھے۔ شعراء، علماء اور صوفی سنت بڑی تعداد میں جونپور میں جمع ہوئے اور دربار کی رونق میں اضافہ کیا۔ کچھ عرصے میں ہی جونپور کو شیراز ہند کہا جانے لگا۔ ملک محمد جائسی ہندی کی مشہور تصنیف پدماوت کا مصنف جونپور میں ہی رہتا تھا۔ شرقی سلطنت سو سال سے کچھ کم عرصے باقی رہی۔ اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں یہ مغربی اتر پردیش میں علی گڑھ سے شمالی بہار میں دربھنگا تک اور شمال میں نیپال کی سرحد سے جنوب میں بندیل کھنڈ تک پھیلی ہوئی تھی۔ شرقی حکمراں دہلی کو فتح کرلینے کے لیے بھی بے چین تھے مگر اس میں کامیاب نہ ہوسکے۔ پندرھویں صدی کے درمیانی حصے میں لودیوں کے استحکام کے بعد سے شرقی سلاطین زیادہ تر دفاعی مہموں میں ہی مصروف رہے۔ انھوں نے مغربی اتر پردیش کا بڑا حصہ بھی گنوا دیا اور اپنی طاقت کو دہلی پر بار بار سخت حملے کر کے ضائع کر دیا۔ آخر کار 1484 میں دہلی کے حکمراں بہلول لودی نے جونپور پر قبضہ کر کے پوری شرقی سلطنت کو اپنے تسلط میں کر لیا۔ شرقی حکمراں کچھ عرصے تک چنار میں رہا اور اپنی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرلینے کی بار بار کوشش کرتا رہا آخر دل شکستہ ہی مر گیا۔

دہلی میں حکومت اور انتظامیہ کے معطل ہو جانے کے بعد شرقی حکمرانوں نے ایک کافی وسیع و عریض علاقے پر امن و امان قائم کیا۔ انھوں نے بنگال کے حکمرانوں کو شرقی اتر پردیش تک بڑھ آنے سے کامیابی کے ساتھ روکے رکھا۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ انھوں نے ایسی کلچرل

روایات قائم کیں جو شرقیوں کے زوال کے بعد بھی عرصے تک باقی رہیں۔

ہم نے تغلق خاندان کی سلطنت کے بعد ابھی سید خاندان کا ذکر کیا تھا۔ جونپور کے حکمرانوں کی طرف سے متواتر خطروں کے مقابلے کے لیے سیدوں نے افغان لیڈر بہلول لودی سے مدد چاہی جو بہت سے افغان سرداروں کے ساتھ پنجاب میں قدم جما چکا تھا۔ بہلول لودی نے کھوکروں کی ابھرتی ہوئی طاقت کو روکا تھا جو ایک خوفناک جنگجو قبیلہ تھا اور سالٹ رینج (Salt Ranges) میں رہتا تھا۔ جلدی ہی بہلول نے پورے پنجاب پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ دہلی پر مالوہ کے حکمراں کے حملے کے وقت دہلی کے حکمراں نے جب اُسے بلایا تو بہلول یہیں رُک گیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس کے سپاہیوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ بہلول باقاعدہ طور پر 1451 میں تخت نشین ہوا۔

پندرھویں صدی کے درمیانی حصے میں ہی لودیوں کا غلبہ اوپری گنگا وادی اور پنجاب پر ہو گیا تھا۔ ان سے پہلے دہلی سلطنت کے حکمرانوں کے برخلاف جو ترک تھے، لودی سلطان پٹھان تھے۔ حالانکہ دہلی سلطنت کی فوج میں بھی افغان کافی بڑی تعداد میں موجود تھے مگر افغان امراء میں سے بہت کم کو کوئی اہم حیثیت یا عہدہ مل پایا تھا۔ اسی وجہ سے بختیار خلجی جو افغان تھا کو اپنی قسمت آزمائی بہار اور بنگال میں کرنی پڑی تھی۔ شمالی ہندوستان میں افغانوں کی بڑھتی ہوئی اہمیت اور حیثیت کا اندازہ مالوہ میں افغان حکومت کے قیام سے بھی ہو رہا تھا۔ بہمنی سلطنت میں بھی افغان اہم عہدوں پر فائز تھے۔

بہلول لودی کی طاقت زیادہ تر شرقی حکمرانوں کے مقابلے میں صرف ہوئی۔ اپنی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے بہلول نے روہ کے افغانوں کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تاکہ ''وہ غربت اور افلاس کی رسوائی سے نجات پائیں، اور مجھے بالادستی حاصل ہو جائے۔'' افغان مورخ عباس شروانی مزید لکھتا ہے: ''اس فرمان کے ملتے ہی روہ کے افغان ٹڈی دل کی طرح بہلول کی خدمت میں دوڑ پڑے۔'' یہ مبالغہ ہو سکتا ہے لیکن اتنا بہر حال حقیقت ہے کہ افغانوں کے آمد سے بہلول شرقیوں کو شکست دینے کے قابل ہو گیا اور اس سے ہندوستان کے مسلم معاشرے کے رنگ میں بھی ایک تبدیلی پیدا ہو گئی جس میں اب افغانوں کی تعداد، اہمیت اور حیثیت، شمال اور جنوب

دونوں جگہ، بہت بڑھ گئی۔

لودیوں میں سب سے اہم سلطان سکندر لودی (1489 تا 1517) تھا جو گجرات کے محمود بیگڑھا اور میواڑ کے رانا سانگا کا ہم عصر تھا۔ سکندر لودی نے دہلی کی حکومت کو ان دونوں طاقتوں کی طرف سے دہلی پر قبضے کے لیے آئندہ کشمکش کے لیے چست اور تیار کیا۔ اس نے اُن افغان سرداروں کو بھی کسی حد تک دبانے یا قابو میں رکھنے کی کوشش کی جو قبائلی آزادی اور خود مختاری کا ناقابلِ تسخیر احساس رکھتے تھے اور سلطان کو کچھ برابر حیثیت والوں میں صرف پہلا مان لینے کے عادی تھے۔ سکندر نے امراء کو اپنے سامنے کھڑے رہنے پر مجبور کیا تاکہ اس کے اعلیٰ حیثیت اور اقتدار کا اثر اُن کے دلوں پر بیٹھ جائے۔ جب کوئی فرمان یا شاہی حکم پہنچتا تھا تو شہر کے تمام امراء کو اُسے پورے اعزاز و احترام کے ساتھ وصول کرنے شہر سے باہر آنا پڑتا تھا۔ اس طرح سکندر نے اپنے امراء کے ذہن میں سلطان کی اعلیٰ حیثیت کو مستحکم انداز میں قائم کر دیا۔ جن جن امراء کے پاس جاگیریں تھیں انھیں پابندی سے اُن کا سالانہ حساب پیش کرنا ہوتا تھا۔ اگر کوئی روپے پیسے میں غبن یا کسی قسم کی بدعنوانی کرتا تھا تو اسے بہت سخت سزا دی جاتی تھی۔ بہرحال اپنے امراء پر مکمل گرفت قائم کر لینے کے سلسلے میں سکندر لودی کو صرف محدود کامیابی نصیب ہوئی۔ اپنی موت کے وقت بہلول لودی نے اپنی سلطنت کو اپنے بیٹوں اور عزیزوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ گو کہ سکندر نے بڑی سخت جدوجہد کے بعد اس تقسیم کو ختم کر دیا تھا لیکن افغان سرداروں کے دماغ میں سلطنت کی تقسیم کا خیال بہر طور باقی تھا۔

سکندر لودی اپنی سلطنت میں ایک چست اور مستعد انتظامیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ عدل و انصاف پر وہ بہت زور دیتا تھا اور سلطنت کی ساری شاہراہوں کو لٹیروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ کر دیا گیا تھا۔ تمام ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں حیرتناک طور پر کم تھیں۔ سلطان نے زراعت میں بھی گہری دلچسپی لی۔ اس نے اناج پر چنگی محصول ختم کر دیا اور گز کا ایک نیا پیمانہ رائج کیا جسے 'گزِ سکندری' کہا جاتا تھا جو مغل عہد تک جاری رہا۔ جو لگان کھاتے (Rent-roll) اس کے دور میں تیار کیے گئے تھے بعد میں شیر شاہ سوری کے زمانے میں انھی کی بنیاد پر 'لگان کھاتے' تیار کیے گئے۔

سکندر لودی ایک قدامت پرست بلکہ کٹر اور متعصب بادشاہ مانا جاتا ہے۔ اس نے ان

تمام کاموں پر مسلمانوں کے لیے پابندی لگادی جو اسلامی شرع میں ممنوع تھے۔ مثال کے طور پر عورتوں کا صوفیوں کے مزار پر جانا یا ان بزرگوں کی یاد میں جلوس نکالنا۔ اس نے ہندوؤں پر جزیہ دوبارہ عاید کیا اور ایک برہمن کو اس کے لیے قتل کروادیا کہ اس کا کہنا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مقدس کتابیں یکساں طور پر قابلِ احترام ہیں۔ اپنی فوجی مہموں کے دوران اس نے کئی مشہور و معروف مندروں کو بھی منہدم کروادیا جیسے نگرکوٹ کے مندر۔

سکندر لودی نے عالموں اور فلسفیوں اور لکھنے والوں کو بہت قیمتی عطیات سے نوازا جس کی وجہ سے عرب، ایران سمیت ہر سمت اور ہر ملک کے پڑھے لکھے اور تہذیب یافتہ لوگ اس کے دربار میں بڑی تعداد میں جمع ہوگئے۔ سلطان کی کوششوں سے سنسکرت کی بہت سی کتابیں فارسی میں ترجمہ ہوئیں۔ اسے موسیقی میں بھی دلچسپی تھی چنانچہ سنسکرت کی موسیقی پر کچھ نادر اور نایاب کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کروایا گیا۔ اسی دور میں بہت بڑی تعداد میں ہندوؤں نے فارسی سیکھی اور انہیں بہت سے انتظامی عہدوں پر مقرر کیا گیا۔

اس طرح سے اس کے دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ثقافتی مصالحت یا قربت کا ماحول متواتر آگے بڑھتا رہا۔ سکندر لودی نے دھولپور اور گوالیار کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں توسیع بھی کی۔ ان فوجی مہموں کے دوران احتیاط سے سروے کرواکر اور گفت و شنید کے بعد 1506 میں آگرہ کو شہر کے لئے چنا گیا۔ یہ شہر مشرقی راجستھان پر گرفت رکھنے اور مالوہ اور گجرات کے راستوں پر نگاہ رکھنے کی غرض سے چنا گیا تھا۔ یہیں سے دوآب کے باغی امراء پر بھی گرفت رکھنا آسان تھا۔ کچھ عرصے میں آگرہ ایک بڑا شہر ہوگیا اور اسے ہی لودیوں کا دوسرا پایہء تخت بنادیا گیا۔

سکندر لودی کی دلچسپی متواتر مشرقی راجستھان میں بڑھ رہی تھی جس کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ پہلے اس نے ناگور کے خان کو اپنی حفاظت میں لیا اور اس بات کی کوشش کی کہ رنتھمبور اپنی وفاداری کا الحاق مالوہ کے بدلے دہلی سلطنت سے کرلے۔ اس کا جانشین ابراہیم لودی تو میواڑ کے خلاف ایک فوجی مہم بھی لے کر گیا لیکن جیسا کہ پہلے ذکر ہوچکا ہے یہ پسپا کردی گئی۔ مالوہ میں رانا کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اس کی فوج کے آگرہ اور بیانا کی طرف بڑھنے سے یہ بات

صاف طور پر ظاہر ہو رہی تھی کہ میواڑ اور لودیوں کے درمیان ٹکراؤ کے امکانات مستقبل میں بڑھ رہے ہیں۔اگر بابر نے اس بیچ مداخلت نہ کردی ہوتی تو اس ٹکراؤ کے نتائج کیا ہوتے؟ یہ کہنا مشکل ہے۔

کشمیر:

پندرھویں صدی میں شمالی ہندوستان کے حالات کا جائزہ کشمیر کا ذکر کیے بغیر یقیناً مکمل نہیں مانا جائے گا۔ کشمیر کی خوبصورت وادی ایک طویل عرصے سے تمام غیر ملکیوں کے لیے لگ بھگ بند ہی تھی۔البیرونی کے مطابق وادی میں ہندوؤں تک کا داخلہ اس وقت تک ممنوع تھا جب تک کوئی شخص وہاں کے کسی امیر سے ذاتی طور پر واقفیت نہ رکھتا ہو۔اس زمانے میں کشمیر شیومت کا مرکز مانا جاتا تھا۔ بہر حال اس صورتِ حال میں چودھویں صدی کے درمیانی حصے میں، اس وقت تبدیلی پیدا ہوئی جب وہاں ہندو راج ختم ہو گیا۔ 1320 میں منگول لیڈر دلوچا کا کشمیر پر تباہ کن حملہ اس تبدیلی کا پیش لفظ کہا جاسکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈلوچا نے بڑے پیمانے پر مردوں کا قتلِ عام کیا اور بچوں اور عورتوں کو غلام بنا کر وسطِ ایشیا کے تاجروں کے ہاتھ بیچ دیا۔ شہر اور گاؤوں کو لوٹ کر پھونک دیا گیا۔ کشمیر کی مجبور حکومت اس ظلم وزیادتی کے خلاف کچھ نہ کر سکی جس کی وجہ سے اس کے لیے عوام کی ہمدردی اور حمایت سب ختم ہو گئی۔

منگول حملے کے لگ بھگ سو سال بعد زین العابدین، جسے کشمیر کی تاریخ کا سب سے بڑا بادشاہ مانا جاتا ہے، تخت نشین ہوا۔اس عرصے میں کشمیر کے معاشرے میں بہت کافی تبدیلی آچکی تھی۔ کشمیر میں صوفیوں اور وسطِ ایشیا کے پناہ گزینوں کی ایک بڑی تعداد آچکی تھی۔ ان باہر سے آنے والوں کے لیے بارہ مولا کا راستہ کافی آسان تھا۔ایک اور قابل ذکر صورت حال یہ تھی کہ صوفیوں اور ہندو سنتوں کا ایک حلقہ ابھرا تھا جنھیں رشی کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ ہندومت اور اسلام کی کچھ باتوں کو ایک دوسرے میں ضم کر کے پیش کرتے تھے۔ کچھ ان صوفیوں کی تبلیغ کے اثر سے اور کچھ دباؤ اور طاقت کے استعمال سے کشمیر کی آبادی کے نچلے حصے میں بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔اس صورتِ حال کی تکمیل (1389 تا 1413) میں سکندر شاہ کے دور میں برہمنوں پر دباؤ سے شروع ہوئی۔ سکندر شاہ نے حکم دیا تھا کہ یا تو تمام برہمن اور پڑھے لکھے ہندو مسلمان ہو جائیں یا وہ وادی چھوڑ کر چلے جائیں۔ ان کے مندروں کو تباہ کر دیے جانے اور تمام سونے چاندی کی

مورتیوں کو پگھلا کر سکوں کی ڈھلائی میں کام میں لانے کا حکم بھی دے دیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ احکامات بادشاہ کے وزیر سوہا بھٹ کے ایماء پر جاری کیے گئے تھے جس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اب وہ خود اپنے پرانے مذہب کے پیروؤں کو خوفزدہ اور بددِل کرنے کے درپے تھا۔

اس صورتِ حال میں زین العابدین (1420 تا 1470) کے تخت نشین ہونے سے تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس نے مصالحانہ پالیسی اختیار کی اور جتنے غیر مسلم کشمیر سے چلے گئے تھے انھیں واپس بلایا۔ جن لوگوں نے اپنے پرانے مذہب ہندو مت میں واپس ہونا چاہا یا جو جان کے خوف سے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے لگے تھے، انھیں اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے کی آزادی دی گئی۔ زین العابدین نے اُن کے لائبریریاں انھیں واپس کیں اور وہ تمام مالی امدادیں جو ہندوؤں کو پہلے ملا کرتی تھیں بحال کیں۔ مندروں کو بھی واپس کر کے بحال کیا گیا۔ ایک سو سال سے زیادہ عرصے بعد ابوالفضل نے لکھا تھا کہ کشمیر میں ایک سو پچاس عالیشان مندر تھے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ انھیں زین العابدین نے ہی بحال کیا ہوگا۔ زین العابدین نے دوسرے معاملات میں بھی کشادگی اور رواداری کی پالیسی اپنائی۔ اس نے جزیہ ختم کیا اور گاؤکشی پر پابندی عائد کی اور ہندوؤں کے جذبات و خواہشات کا احترام کرتے ہوئے ستی پر عائد پابندی اُٹھالی۔ اس کی حکومت میں ہندو بہت سے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ سریا بھٹ عدل کا وزیر اور درباری طبیب تھا۔ زین العابدین کی پہلی دو ملکائیں ہندو تھیں جو جموں کے راجہ کی لڑکیاں تھیں۔ یہی اس کے چاروں بیٹوں کی مائیں تھیں۔ اُس نے تیسری شادی ان کی موت کے بعد ہی کی۔

سلطان خود بھی بہت پڑھا لکھا تھا اور شاعری بھی کرتا تھا۔ فارسی، کشمیری، سنسکرت اور تبتی زبانوں میں اچھی مہارت رکھتا تھا۔ اس نے فارسی اور سنسکرت عالموں کی سرپرستی کی اور اُس کی فرمائش پر بہت سی سنسکرت کتابوں، جیسے مہابھارت، کلہن کی تاریخِ کشمیر، راج ترنگنی، کا ترجمہ فارسی میں کیا گیا اور اس تاریخ کو اس وقت تک کے حالات شامل کر کے مکمل کیا گیا۔ اُسے موسیقی کا بھی شوق تھا جسے سن کر گوالیار کے راجہ نے اس سلسلے کی دو نایاب سنسکرت کتابیں بھی اُسے بھجوائی تھیں۔

سلطان نے کشمیر کی معاشی ترقی کی طرف بھی توجہ دی۔ اس نے دو افراد کو سمرقند کاغذ

سازی اور جلد بندی کا فن سیکھنے بھیجا۔ کشمیر میں اس نے بہت سے حرفوں اور دستکاروں کی بھی نشوونما کی جیسے (قیمتی) پتھروں کی تراش خراش اور پالش کا فن، بوتل بنانا، سونے کے ورق بنانا وغیرہ۔ اس نے شال سازی کے فن کو بڑھاوا دیا جس کے لیے آج کشمیر اتنا مشہور ہے۔ بھار توبندوقیں بنانے اور آتش بازی تیار کرنے کے فن میں بھی کشمیر میں ترقی ہوئی۔ سلطان نے بڑی تعداد میں باندھ، نہریں اور پل بنواکر کشمیری زراعت کو بھی ترقی دی۔ وہ بڑا پرجوش معمار بھی تھا۔ اس سلسلے میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ وولر جھیل میں 'زینا لنکا' بنوانا تھا۔ جو ایک مصنوعی جزیرہ ہے جس پر اُس نے اپنا محل اور مسجد بنوائی تھی۔

زین العابدین کو آج بھی کشمیری بڈشاہ (سلطان اعظم) کہتے ہیں۔ وہ اچھا جنگجو بھی تھا، اس نے لکھا کہ علاقے پر منگولوں کے حملے کو پسپا کیا، بلتستان (جسے تبتِ خورد بھی کہا جاتا ہے) کا علاقہ فتح کیا اور جموں اور راجوری پر گرفت رکھی۔ اس طرح اس نے کشمیر کی سلطنت کو متحد کر دیا۔

زین العابدین کا چرچا دور دور تک پھیل گیا۔ اس نے ہندوستان اور اسی طرح ایشیا بھر کے ممتاز حکمرانوں سے بھی تعلق بنائے رکھا۔

■■■

ہوئی اور وہ وہاں سے بھاگ نکلا لیکن اس کا پیچھا کیا گیا اور وہ حصار ضلع کے سرسہ میں جو پہلے سرسوتی کہلاتا تھا، گرفتار کرلیا گیا۔ تاریخ داں منہاج السراج کا کہنا ہے کہ اسے فوراً قتل کردیا گیا۔ لیکن ایک دوسرے ہم عصر مورخ حسن نظامی کے مطابق اس کو اجمیر لے جایا گیا جہاں اسے حکومت کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس کا ثبوت بھی سِکّوں سے ملتا ہے جہاں سِکّوں پر ایک طرف پرتھوی راج کی تصویر اور دوسری طرف سری محمد سام لکھا ہوا ملتا ہے۔ کچھ دن بعد اس نے بغاوت کردی اور دھوکہ دہی کے الزام میں قتل کردیا گیا۔ اس کا بیٹا اس کا جانشین بنا اور جاگیردار کی حیثیت سے حکومت کرتا رہا۔ اس لیے اس کہانی میں کوئی سچائی نہیں ہے کہ پرتھوی راج کو غزنی لے جایا گیا اور آنکھوں پر بندھی پٹی کے ساتھ ہی اس نے ایک تیر سے غوری سلطان کو قتل کیا اور پھر اس کے درباری موسیقار چاند کے ہاتھوں مارا گیا۔

پرتھوی راج کو ایک عظیم سپاہی اور شاعروں اور پنڈتوں کے سرپرست کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایک جنرل کی حیثیت سے اس کے نام بہت سی فتوحات ہیں لیکن جیسا کہ جدید تاریخ داں دشرتھ شرما کا کہنا ہے: ”ترائن کی دوسری لڑائی اس کی رہنمائی اس کی فوجی لیاقت اور تدبر پر دھبہ ہے۔“

گنگا کی بالائی وادی میں ترکوں کا پھیلاؤ:

ترائن کی فتح کے بعد پوری چوہان حکومت غوریوں کے قدموں میں تھی لیکن معزالدین نے ایک محتاط پالیسی اپنائی۔ اس نے شوالک کے پورے علاقے کو حاصل کرلیا تھا یعنی اجمیر تک اور حصار سے سرسہ تک کا علاقہ جو اب ہریانہ میں شامل ہے۔ اس نے حصار اور سرسہ کا علاقہ اپنے وفادار غلام قطب الدین ایبک کے سپرد کردیا۔ گووند راج جو دہلی کا تومر سردار تھا ترائن کی لڑائی میں مارا گیا تھا اس کے بیٹے کو باج گذار کی حیثیت سے دہلی میں تخت نشین کیا گیا اور جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے پرتھوی راج کو اجمیر میں بحال کردیا۔ اس کے بعد معزالدین غزنی واپس چلا گیا۔

اس انتظام کو وقتی ہی ہونا تھا۔ اگر غوری اپنے آپ کو صرف پنجاب اور آس پاس کے علاقوں تک ہی محدود رکھتے تو بھی یہ انتظام غیر مستحکم ہی ہوتا۔ لیکن اگر ترکوں کو گنگا کی بالائی وادی تک پھیلنا تھا تو دہلی اتنا اہم مقام تھا کہ اس کو دوسروں کے ہاتھوں میں چھوڑا نہیں جاسکتا تھا۔

-13-

دہلی سلطنت دور میں مذہبی اور ثقافتی زندگی

ہندوستان میں ترکوں کی آمد اور تیرھویں صدی میں دہلی سلطنت کے قیام کا زمانہ ہلچل اور ترقی دونوں کا دور تھا۔ جیسا ہم دیکھ چکے ہیں اس کا ابتدائی دور بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری اور تباہی و بربادی کا دور تھا جس میں بہت سے خوبصورت مندر، محلات اور شہر تباہ و برباد کیے گئے۔ سلطنت میں توسیع کے ساتھ ساتھ یہ صورتِ حال کچھ وقفوں کے ساتھ جاری رہی۔ لیکن جب کوئی علاقہ یا سلطنت فتح ہو جاتی تھی یا مطیع ہو جاتی تھی تو امن و سکون اور ترقی کا دور شروع ہو جاتا تھا۔ یہ انداز شمالی ہندوستان میں آہستہ آہستہ شروع ہوا جہاں بڑے بڑے علاقے دو سو سال تک براہِ راست سلطنت کے تحت رہے۔

ترک حکمرانوں کو کسی صورت میں بھی اکھڑ یا بربریت پسند تصور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ لوگ آٹھویں صدی میں وسطی ایشیا میں ابھرے تھے اور رفتہ رفتہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس طرح انھیں اسلامی تہذیب اور کلچر ورثے میں ملا تھا جو ترقی کی کافی اعلیٰ منزل پر پہنچ چکا تھا۔ حالانکہ عباسی خلافت، جس کا اسلامی دنیا پر ڈیڑھ صدی سے زیادہ غلبہ رہا تھا، اب اُس کے زوال کا دور چل رہا تھا، اور بہت سی ریاستیں اور سلطنتیں اس کے مقابل کھڑی ہو چکی تھیں، مگر یہ سلطنتیں بھی عباسیوں کے قائم کردہ انتظامیہ کے پیمانوں اور کلچر کو تھوڑی بہت تبدیلی یا کمی بیشی کے ساتھ اپنائے ہوئے تھیں۔ جو ترک ہندوستان آئے تھے وہ خود کو صرف اسلام کا نمائندہ یا چیمپین ہی تصور نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی اعلیٰ روایات اور اقدار کا ورثہ دار ہونے پر بھی فخر کرتے تھے۔ خواہ وہ طرزِ تعمیر کی روایات ہوں، علم و ادب ہو، حکومت کی ساخت یا سائنس اور ٹکنالوجی کچھ بھی ہو۔ انھوں نے وہی زبان، فارسی اپنائی تھی جو دسویں صدی تک وسطِ ایشیا، خراسان اور ایران کی حکومت اور ثقافت کی زبان بن کر ابھری تھی۔

دوسری طرف ہندو بھی ایک مذہب اور کلچر کے ورثے دار تھے جو ہزاروں سال میں اس حد پر پہنچا تھا۔ شمالی ہندوستان میں چوتھی اور پانچویں صدی کا زمانہ سائنسی اور ثقافتی اعتبار سے

انتہائی عروج کا دور مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد گو کہ ہندوستان سائنسی میدان میں پچھڑ گیا تھا، اور تخلیقی فکر کے دھارے بھی رفتہ رفتہ خشک ہوتے چلے گئے تھے لیکن ثقافتی روایات اور اقدار ابھی باقی تھیں۔ جدید تحقیقات نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ آٹھویں سے بارھویں صدی تک کے دور کو بھی کسی طرح ثقافتی تنزل کا دور نہیں کہا جا سکتا۔ یہی وہ دور تھا جس میں تعمیری کام کافی حد تک جاری رہا خاص طور پر مندروں کے طرزِ تعمیر میں کافی نکھار آیا۔ اس طرح بندیل کھنڈ میں کھجوراہو، اڑیسہ اور متھرا، کاشی اور دلواڑہ وغیرہ میں بہت سی جگہ مندر بنے۔ ان مندروں میں طرزِ تعمیر اور بُت تراشی، دونوں میں صلاحیت اور مہارت کا احساس ہوتا ہے۔ اس زمانے میں مذہب اور فلسفے میں بھی کافی اہم تصورات ابھرے۔ چنانچہ سنکرا نے ویدوں کے فلسفے پر ایک آخری مہر ثبت کر دی اور ہندوؤں میں کسی ایک ذاتی دیوتا کی پرستش اور اس سے محبت کرنے والا ایک مسلک جنوبی ہندوستان میں اُبھرا۔

ہندومت، بُدھ مت اور اسلام کے درمیان تعلق ہندوستان میں اسلام پہنچنے سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ آپسی لین دین کے اس عمل میں اسلام کے ہندوستان پہنچنے کے بعد اور تیزی آئی۔ بہر طور، اس عمل کے سیاسی رُخ اور مذہبی فلسفیانہ رخ، دونوں میں امتیاز یا فرق سمجھ لینا بہت ضروری ہے، گو کہ یہ دونوں رُخ ایک دوسرے پر اثر انداز ضرور ہوتے تھے۔ کچھ کٹر قسم کے علماء جیسے التتمش کے دربار کے نورالدین مبارک غزنوی ہندوؤں سے مخالفت میں شدت پسندی کی وکالت کرتے تھے، خاص طور پر برہمنوں کے یہ شدید مخالف تھے چونکہ اُن کے خیال میں سچے دین کے یہی سب سے بڑے دشمن تھے۔ ہم پہلے یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اس پالیسی کو حکمرانوں نے اپنے دور کے حالات کے اعتبار سے نامناسب اور ناقابل عمل پایا۔ خود ہندوؤں میں بھی ایک طبقے میں مسلمانوں سے کچھ دوری اور نفرت کا انداز موجود تھا، چنانچہ انھوں نے مسلمانوں سے کم سے کم تعلق رکھنے کی پالیسی اپنائی۔ بہر حال، ان رکاوٹوں اور اسلام اور ہندو، دونوں مذہبوں میں ظاہری طور پر ایک ناقابلِ عبور دوری کے باوجود جس میں اسلام، اللہ کے علاوہ تمام دوسرے خداؤں کو سختی سے ... خ کرتا ہے اور اس کا آخری پیغمبر (محمد) کو مانتا ہے اور ہندو مذہب تنوع یا کثیر الجہتی میں یکجہتی کا عنصر رکھتے ہوئے بہت سے دیوی دیوتاؤں کا تصور رکھتا ہے اور بتوں کی پوجا کا طریقہ اپناتا

ہے جسے مسلمان مسترد کرتے ہیں۔ آپسی قربت، مصالحت اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا عمل رفتہ رفتہ شروع ہو ہی گیا۔ اس طرزِ عمل کو سب سے پہلے طرزِ تعمیر، ادب، موسیقی وغیرہ میں دیکھا گیا۔ مذہبی رخ میں بھی یہ عمل اس وقت سے پیدا ہوا جب سے ملک میں صوفیت داخل ہوئی اور شمالی ہندوستان میں مقبولِ عام بھکتی تحریک کی نشوونما ہوئی۔ یہ عمل پندرھویں صدی میں رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہا اور مغلوں کے دور میں سولھویں اور سترھویں صدی میں اس میں توانائی اور تیزی پیدا ہوئی۔ مگر یہ تصور کرلینا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ اختلاف یا ٹکراؤ کے عنصر بالکل ختم ہوگئے۔ ہوا یہ کہ قربت و مصالحت اور اختلاف یا ٹکراؤ کے عمل دونوں بیک وقت جاری رہے۔ ان میں بعض حکمرانوں اور بعض علاقوں میں کچھ سستی یا رکاوٹ پیدا ہو جاتی تھی اور کچھ دوسرے حکمرانوں کے دور میں تیزی اور ترقی نظر آتی تھی۔

مناسب ہوگا کہ ٹکراؤ اور قربت، ان دونوں عناصر کا اس دور کے تناظر میں تجزیہ کیا جائے۔

i- طرزِ تعمیر:

نئے حکمرانوں کی سب سے پہلے ضرورت رہنے کے لیے مکان اور اپنے ہم مذہبوں کے لیے عبادت گاہیں بنانے کی تھی۔ عبادت گاہوں کے لیے شروع میں انھوں نے مندروں اور دوسری عمارتوں کو مسجدوں میں تبدیل کرنا شروع کیا۔ ان کی مثالیں، دہلی میں قطب مینار سے ملحق مسجد قوت الاسلام اور اجمیر میں وہ عمارت ہے جسے، اڑھائی دن کا جھونپڑا کہا جاتا ہے۔ اوّل الذکر پہلے ایک جین مندر تھا جو بعد میں ایک ایسے مندر میں تبدیل کر دیا گیا تھا جو وشنو کے نام پر تھا اور موخرالذکر ایک بودھ خانقاہ تھی۔ دہلی میں جو واحد تعمیری کام تھا وہ منہدم کیے ہوئے دیوی استھان (گرب گرہ) کے سامنے دو محرابیں تھیں جنھیں بڑی خوبصورتی سے نقاشی سے سجایا گیا تھا۔ ان کے سامنے چھت دار راستوں سے گھرا ایک صحن تھا جس میں اس علاقے کے ستائیس مندروں سے لوٹے ہوئے صرف ستون کھڑے کر دیے گئے تھے۔ ان محرابوں کو جس انداز سے سجایا گیا ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔ چونکہ اسلام میں انسان یا کسی جانور کی شکل بنانا منع ہے اس لیے ان پر بھی کوئی ایسی شکل نہیں بنائی گئی تھی۔ اس کے بدلے انھوں نے پھولدار بیلوں اور قران کی آیتوں کا استعمال کیا تھا جو ایک دوسرے میں بڑی فنکاری اور خوبصورتی سے گوندھی گئی تھیں۔ پھر جلدی ہی ترکوں نے

اپنی عمارتیں بھی بنانی شروع کردیں۔ اس کے لیے انھوں نے زیادہ تر یہیں کے کاریگروں سے کام لیا جیسے سنگ تراش، راج مستری وغیرہ۔ کچھ بعد میں کچھ فنکار معمار مغربی ایشیا سے ہندوستان آئے۔ اپنی عمارتوں میں ترکوں نے محرابوں اور گنبدوں کا استعمال بہت زیادہ کیا۔ بہر حال نہ تو محراب ترکی یا مسلمان ایجاد تھی نہ گنبد۔ عربوں نے انھیں بازنطینی سلطنت سے اپنایا تھا اور پھر ان میں اختراعیں کر کے انھیں بہتر کیا اور پھر بالکل اپنا بنا لیا۔

محراب اور گنبد کے استعمال کے کچھ فائدے تھے۔ گنبد عمارت کو ایک خوشگوار خط فلکی یا افقی پس منظر فراہم کرتا تھا اور معماروں میں جیسے جیسے تجربہ اور اس سے اعتماد بڑھا گنبد اوپر اٹھتا چلا گیا۔ ایک چوکور عمارت پر گول گنبد تعمیر کرنے اور گنبد اونچے سے اونچا اٹھانے کے سلسلے میں بھی بہت سے تجربے کیے گئے۔ اس طرح بہت سی عالیشان اور اونچی اونچی عمارتیں وجود میں آئیں۔ محرابوں اور گنبدوں کا فائدہ ایک یہ تھا کہ ان کی وجہ سے اُن بہت سے ستونوں سے چھٹکارا پانا ممکن ہو گیا جن پر چھت رکھی جاتی تھی۔ اس طرح سے بڑے بڑے ہال بنائے جاسکے جن میں کسی قسم کی رکاوٹ بغیر دیکھا جاسکتا تھا۔ ایسی جگہیں مسجدوں اور محلوں میں لوگوں کے جمع ہونے میں آسانی پیدا کرتی تھیں۔ بہر حال ایسی محرابوں کو بہت مضبوط مسالوں (سیمنٹ) کی ضرورت ہوتی تھی جن کے بغیر پتھروں کو نہیں جمایا جاسکتا تھا۔ ترک اپنی عمارتوں میں بہت عمدہ قسم کا چونے کا مسالہ (گچ) استعمال کرتے تھے۔ اس طرح انواع واقسام کی بہت سی عمارتیں اور بہتر قسم کے مسالوں کا استعمال پورے ہندوستان میں ترکوں کی آمد سے رائج ہوتا چلا گیا۔

محراب اور گنبد سے ہندوستانی پہلے سے واقف تھے مگر ان کا استعمال اتنے وسیع پیمانے پر نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ محراب کی تعمیر کا صحیح اور سائنٹفک طریقہ مشکل سے ہی کہیں استعمال ہوتا تھا۔ ہندوستان کی عمارتوں میں جو طریقہ عام طور پر استعمال ہوتا تھا اس میں پتھر پر پتھر رکھ کر فاصلے کو کم کرتے چلے جاتے تھے یہاں تک یہ فاصلہ اتنا کم ہو جاتا تھا کہ اُسے ایک پتھر سے بند کیا جاسکتا تھا یا اُن پتھروں پر ایک سل رکھ کر اُسے ڈھکا جاسکتا تھا۔ ترکی حکمرانوں نے اپنی عمارتوں میں گنبد اور محراب کا طریقہ اور شہتیروں اور پتھر کی سل دونوں طریقوں کا استعمال کیا۔

سجاوٹ کے سلسلے میں ترک بھی اپنی عمارتوں میں انسانی یا حیوانی شکلیں بنانے سے گریز

کرتے تھے۔ ان کے بدلے میں وہ جیومیٹری اور پھولوں اور بیلوں کا استعمال کرتے تھے اور ان میں قران کی آیتوں کی پٹیاں اور پینل بھی شامل کرتے تھے۔ اس طرح عربی خط بھی ایک قسم کا آرٹ یا فن بن گیا۔ آرائش کے ان مختلف طریقوں کے مجموعے کو طغرائی گل کاری' (Arabesque)' کہا جانے لگا۔ انھوں نے ہندو امتیازی خصوصیات جیسے بیل، گھنٹی، سواستک (swastika) کنول وغیرہ کو بھی آسانی سے اپنالیا۔ ہندوستانیوں کی طرح ترک بھی اپنی عمارتوں کی سجاوٹ کے بڑے شوقین تھے۔ ترکوں نے اپنی عمارتوں میں سنگِ سرخ کو استعمال کر کے ان میں رنگ کی خوبصورتی اور بڑھادی۔ پیلے پتھر یا سنگ مرمر کو سجاوٹ یا سنگِ سرخ کے اثر کو ابھارنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

تیرھویں صدی میں ترکوں کی بنوائی ہوئی سب سے عالیشان اور سب سے مشہور عمارت مسجد قوت السلام سے ملحق مینار ہے۔ یہ موذن کے اذان دینے کی جگہ 'ماذنہ' کہلاتا تھا۔ 'قطب مینار' تو اسے بہت بعد میں کہا جانے لگا۔ شاید اس لیے کہ اس کی تعمیر قطب الدین ایبک نے شروع کروائی تھی' یا ممکن ہے اس لیے کہ جب التمش نے اسے مکمل کروایا تو مشہور صوفی قطب الدین بختیار کاکی دہلی میں رہتے تھے اور اسے ان کی روحانیت کی دین یا علامت سمجھا جانے لگا تھا۔ اس خیال کی کوئی بنیاد یا وجہ موجود نہیں ہے کہ یہ کسی پہلے بنے ہوئے راجپوت مینار کی بنیادوں پر دوبارہ بنایا گیا ہے یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ مینار کی بنیاد یا نچلے حصے میں کچھ ایسے پتھر لگے ہوئے ہیں جو اس علاقے کے منہدم شدہ مندروں کے تھے۔ مینار میں نصب ایک کتبے میں فضل بن ابوالعالی کا نام بھی کندہ ہے، مگر اس بوسیدہ اور مٹے ہوئے سے کتبے سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ نام اس کے معمار کا ہے یا صرف کام کی نگرانی کرنے والے کا۔

گو کہ میناروں کی تعمیر کی روایت ہندوستان، مغربی ایشیا اور دوسری جگہوں پر موجود تھی لیکن قطب مینار کئی وجوہات کی بناء پر منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی زبردست اونچائی۔ 71.4 میٹر (238) فٹ، اس کی مخروطی یا گاؤدم ساخت کی وجہ سے اور بااثر ہوگئی ہے۔ شروع میں یہ صرف چار منزل اونچا تھا۔ لیکن اس کی اوپری منزل پر بجلی گر گئی تھی تو فیروز تغلق نے اس کی مرمت کروائی اور ایک منزل اور بڑھادی۔ اس مینار کی خاص خوبصورتی اصل میں اس کے چھجوں (بالکنیوں) سے ہے، جو اس میں سے اُبھرے ہوئے یا باہر نکلے ہوئے ہیں اور "گوشے دار شہد کے چھتوں" جیسے

شش پہل پتھروں سے جڑے ہوئے ہیں۔ مینار کے باہری حصے پر تکون (کمرخی) اور گولائی لی ہوئی متناسب پٹیوں کو جس مہارت سے ابھارا گیا ہے اُس نے اور سنگ سرخ اور سفید سنگِ مرمر کی اوپر لگی پٹیوں نے اس کی خوبصورتی کو بہت بڑھا دیا ہے۔

التمش کے عہد میں دہلی سلطنت کے استحکام کے بعد سے ترکوں کے بڑھتے ہوئے عمارتی کام کو اس دور کی بہت سی عمارتوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس طرح اتر پردیش میں بدایوں کی مسجد اور بہت سی دوسری عمارتیں، ناگور، ہانسی اور ہریانہ میں پلول کے مقام پر عالی شان دروازے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اب ترکوں نے خود اپنی عمارتیں بنوانے کا عزم کرلیا تھا۔ التمش کا اپنا مقبرہ، جو خود اُسی کے آخری دنوں میں بنا تھا اس سے تعمیر میں ہندو اور مسلم روایات کے آپسی امتزاج کے نشانات بھی ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ مقبرہ ایک مربع شکل کی عمارت تھا لیکن اس کے کونوں پر چوتھائی گنبد کے قبے اور سہارے کی ڈاٹیں بنا کر اور اُسے ہشت پہل شکل دے کر اس پر گنبد تعمیر کیا گیا تھا۔ بعد میں مربع شکل کی بہت سی عمارتوں میں یہی طریقہ استعمال کیا گیا۔ اس سے بھی زیادہ متاثر کن اندرونی دیواروں کی نقاشی تھی جس میں خطاطی میں ہندوستانی گل کاری شامل کر کے اِسے اور خوبصورت کیا گیا تھا۔

تیرھویں صدی میں مغربی ایشیا میں منگولوں کی تباہ کاریوں کے نتیجے میں بہت سے عالم و فاضل لوگ ہندوستان آئے جن میں ریاضی داں اور ماہرین تعمیرات (آرکیٹیکٹ) بھی شامل تھے۔ اس کے اثر سے ہمیں بلبن کے سیدھے سادے مقبرے میں صحیح محراب نظر آجاتی ہے۔ یہ محراب دونوں طرف اُبھرے چھجے یا منڈیر جیسے پتھروں پر براہِ راست ابھاری جاتی ہے، اور اس طرح نہیں بنائی جاتی کہ پتھر پر پتھر رکھ کر فاصلے کو کم کرتے چلے گئے اور پھر اوپر ایک پتھر کی سل سے اُسے ڈھک دیا۔

خلجی دور میں بھی بہت عمارتی کام ہوا۔ علاءالدین نے سیری میں اپنا پایۂ تخت تعمیر کروایا جو قطب سے کچھ کلومیٹر دور تھا۔ بدقسمتی سے اب اس شہر کی مشکل سے ہی کوئی چیز بچی ہے۔ علاءالدین نے قطب مینار سے دوگنا اونچا ایک مینار اور بنوانے کا منصوبہ بنایا تھا مگر وہ اپنی موت کی وجہ سے اسے پورا نہ کروا سکا۔ بہر حال اس نے قوت الاسلام مسجد میں داخلے کا ایک دروازہ ضرور بنوایا۔

یہ دروازہ، جسے علائی دروازہ کہتے ہیں اس کی کچھ ممتاز خصوصیات ہیں۔ اس پر بنا گنبد اس اصول پر نہیں بنایا گیا کہ مسالے کے ردّے ایک کے اوپر ایک اس طرح چڑھائے جائیں کہ جیسے جیسے یہ اوپر اٹھتا جائے اس کی جسامت یا سائز رفتہ رفتہ کم سے کم ہوتا چلا جائے بلکہ اسے آگے بڑھتی ہوئی نگروں (radiating voussors) کے اصول پر بنایا گیا تھا اور یہ اپنے طرز کی ہندوستان میں پہلی عمارت تھی۔ گھوڑے کے نعل کی شکل کی محراب، جس کو پہلی مرتبہ کسی عمارت میں استعمال کیا گیا تھا، یہ بھی دیکھنے میں بہت خوبصورت لگتی ہے۔ زینت کے لیے استعمال کیے گئے طریقے محراب کے اندرونی حصے میں چھوٹی ہوئی جگہ (merlons)، دو محرابوں کے ملنے کی جگہ (Spandrel) پر کنول کا استعمال سفید سنگ مرمر کی جعفریاں (جالیاں) اور لال پتھر کی یکسانیت کو کم کرنے کے لیے سنگِ مرمر کی سفید پٹیاں عمارت میں مضبوطی اور شان و شوکت پیدا کرتی ہیں جو ہندوستانی طرزِ تعمیر کی روایات میں ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

اس دور میں مسجد کے طرزِ تعمیر میں بھی ترقی اور پختگی پیدا ہوئی جیسا کہ صوفی نظام الدین اولیا کے مزار کے پاس تعمیر جماعت خانہ مسجد میں محسوس ہوتا ہے۔

تغلق دور میں بھی جو سلطنت عہد کے انتہائی عروج اور ساتھ ہی ساتھ اس کے زوال کے ابتدا کا بھی وقت ہے، عمارتی کام میں بہت ترقی ہوئی۔ غیاث الدین اور محمد تغلق نے قلعہ - محل کی ملی جلی بہت بڑی تعمیر کروائی جسے تغلق آباد کہا جاتا ہے۔ جمنا کے دھارے کو روک کر اس کے چاروں طرف ایک بہت بڑی مصنوعی جھیل بھی تیار کی گئی۔ غیاث الدین کا مقبرہ طرزِ تعمیر میں ایک نئے رجحان کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایک متاثر کن اور خوبصورت خطِ فلکی (افقی پس منظر) پیدا کرنے کے لیے عمارت کو ایک اونچے چبوترے پر اٹھایا گیا۔ اس کی خوبصورتی اس کے سنگِ مرمر کے گنبد سے اور دوبالا ہوگئی۔ تغلق دور کی عمارتوں کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کی ڈھلواں دیواریں ہیں۔ یہ گاؤدم دیواریں (batter) کہلاتی ہیں اور ان سے عمارت کی مضبوطی اور پختگی کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ بہر طور، فیروز تغلق کی عمارتوں میں گاؤدم کا استعمال شاذونادر ہی ہے۔ تغلق دور کی عمارتوں کی ایک اور امتیازی خصوصیت ان میں محراب کے اصول اور چوکھٹ اور شہتیر (لنٹل اور بیم) دونوں کا عمداً امتزاج ہے۔ حوض خاص میں فیروز تغلق کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں جو تفریحی

مقام کے طور پر بنوائی گئی تھیں اور جن کے چاروں طرف ایک بہت بڑی مصنوعی جھیل بھی تھی، یکے بعد دیگرے ایک منزل میں محراب اور دوسری میں چوکھٹ اور شہتیر کا انداز ملتا ہے۔ ایسا ہی فیروز شاہ کے نئے قلعے میں بھی دیکھا جاسکتا ہے جسے فیروز شاہ کوٹلہ کہا جاتا ہے۔ تغلق حکمرانوں نے اپنی عمارتوں میں قیمتی سنگِ سرخ استعمال نہیں کیا بلکہ سستا اور آسانی سے ملنے والا بھورا پتھر ہی لگایا ہے۔ فیروز شاہ کی عمارتوں میں پتھروں پر گچ یا چونے کے مسالے کی بھی ایک موٹی سی تہہ چڑھائی جاتی تھی جس پر سفید پتائی کی جاتی تھی اور یہ طریقہ ابھی تک بھی رائج ہے۔ چونکہ اس قسم کے پتھروں اور مسالے پر نقاشی یا کھدائی کا کام آسان نہیں تھا اس لیے تغلق دور کی عمارتوں میں زینت یا آرائش بہت کم نظر آتی ہے۔ لیکن فیروز کی تمام عمارتوں میں سجاوٹ میں کنول ضرور نظر آتا ہے۔ ایک اور طریقہ جو فیروز تغلق کے مقبرے میں نظر آتا ہے وہ سامنے کے رُخ پر پتھر کا جنگلا ہے جو خالص ہندوانداز ہے۔

اس زمانے میں بہت سی مسجدیں بھی تعمیر ہوئیں جیسے کلاں مسجد، کھڑکی مسجد۔ یہ کھردرے یا بے پالش پتھر کی تھیں اور ان پر گچ مسالے کا پلاسٹر بھی نہیں ہوا تھا اس لیے یہ اتنی پُرشکوہ نہیں تھیں۔ ان کی ستون بھاری اور موٹے تھے۔ ابھی ہندوستان کے معمار میں اتنی خود اعتمادی بھی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ گنبد کو زیادہ اونچا اٹھا سکے۔ اس لیے یہ عمارتیں کچھ دبی دبی سی لگتی ہیں۔ لودیوں نے بھی اپنی عمارتوں میں آڑے ترچھے اور بے گڑھے پتھروں کے استعمال اور گچ کے پلاسٹر کی روایت کو جاری رکھا۔ مگر اس وقت تک ہندوستانی معمار اور راج مستری نئے طرز کی عمارتوں کی تعمیر کے سلسلے میں پورا اعتماد حاصل کر چکے تھے۔ اس لیے اب اُن کے گنبد آسمان میں اونچے اٹھنے لگے تھے۔ ایک نیا طریقہ جو ہندوستان میں ہی پہلی بار نظر آیا وہ دوہرا گنبد بنانے کا تھا۔ شروع میں اس کو تجربے کے طور پر بنایا گیا مگر سکندر لودی کے مقبرے میں یہ پوری طرح مکمل شکل میں سامنے آیا۔ جیسے جیسے گنبدوں کی اونچائی بڑھتی گئی یہ طریقہ ضروری ہوتا چلا گیا۔ گنبد کا ایک پرت اندر کی طرف رکھنے سے گنبد کی اونچائی اندر کے حصے میں متناسب دکھائی دیتی تھی۔ بعد میں یہی طریقہ تمام عمارتوں میں استعمال ہونے لگا۔

ایک اور تعمیراتی طریقہ جو سب سے پہلے فیروز کے وزیر خانِ جہاں تلنگانی کے مقبرے

میں استعمال ہوا وہ ہشت پہل عمارت بنانے کا تھا۔ اس میں اور بھی اختراعات شامل کی گئیں۔ اس کے چاروں طرف ایک برآمدہ بنایا گیا۔ بارش اور دھوپ سے بچانے کے لیے اس پر ایک چھجہ بھی ڈالا گیا، چھت کے تمام کونوں پر چھتریاں یا اولتیاں بنوائی گئیں۔ ان کی عمارتوں میں بھی محراب اور شہتیر اور پتھر کی سل والے دونوں طریقے استعمال کیے گئے۔

لودیوں نے اپنی عمارتوں، خصوصاً مقبروں کی تعمیر میں ایک طریقہ یہ بھی اپنایا کہ انھیں اونچے چبوتروں پر اُٹھایا جس سے یہ عمارتیں جسامت میں بھی اور خط فلکی (افقی پس منظر) کے اعتبار سے بھی عالیشان لگیں۔ کچھ مقبروں کو باغات میں تعمیر کروایا گیا۔ دہلی کا لودی گارڈن اس کی بہترین مثال ہے۔ بعد میں مغلوں نے بھی ان میں سے بہت سی خصوصیات کو اپنایا اور ان کا نقطۂ عروج شاہ جہاں کے بنوائے ہوئے تاج محل میں نظر آیا۔

۔ دہلی سلطنت کے انتشار تک ہندوستان کے مختلف علاقوں کی ریاستوں میں اُن کا اپنا انفرادی طرزِ تعمیر بھی ابھر چکا تھا۔ ان میں سے زیادہ طرزوں پر وہاں کے مقامی طرزِ تعمیر کی بڑی گہری چھاپ تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں یہ بات بنگال گجرات، مالوہ اور دکن وغیرہ کی عمارتوں میں خاص طور پر موجود تھی۔

اس زمانے میں تعمیراتی کاموں میں ہمیں صرف زبردست اضافہ نظر نہیں آتا بلکہ ہندو مسلمان روایات اور طرزِ تعمیر کے ایک دوسرے سے قریب تر آنے کا رجحان بھی نظر آتا ہے۔ پندرھویں صدی میں جو بہت سی بادشاہتیں قائم ہوئیں وہاں دہلی میں ابھرتے ہوئے طرزِ تعمیر کو اپنے علاقے کی تعمیراتی روایت میں ضم کر کے ایک ملا جلا انداز پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

ii- مذہبی تصورات و عقائد:

مذہب ایک بڑا پیچیدہ اور بڑا حساس قسم کا مسئلہ ہے کیونکہ ہر مذہب کے ماننے والے اپنے ہی مذہب کو منفرد یا یکتا بھی مانتے ہیں اور یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ اُن کے مذہب نے کسی دوسرے مذہب سے اثر قبول نہیں کیا۔ بہر حال اتنی سخت حد بندی کو برقرار رکھنا اس صورت میں خاص طور پر ناممکن ہے جب مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک ہی جغرافیائی علاقے میں رہتے ہوں یا جب ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں منتقل ہونے والے اپنے ساتھ پرانے تصورات،

عقائد اور رسم و رواج کی پابندیاں بھی لاتے ہوں۔ سیاح، جن میں صوفی اور فقیر بھی شامل ہیں، جو متواتر ایک سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں، وہ بھی عمداً یا غیر ارادی طور پر اجنبی تصورات کو ایک سے دوسرے ملک پہنچانے میں واسطے کا کردار ادا کرتے ہیں۔

اسلام جدید دنیا میں پوری طرح منظم اور ساخت کے اعتبار سے مکمل بڑے مذاہب میں سے آخری مذہب تھا۔ اپنی تکمیل یا ساخت کے ابتدائی دور میں، جو مجموعی طور پر اس کے وجود کی پہلی تین صدیاں سمجھی جاتی ہیں یعنی نویں صدی کے آخری حصے تک اس کا تعلق اپنے علاقے کی قدیم تہذیبوں ایرانی، یونانی، بازنطینی، اور ہندوستانی سے قائم ہوا۔ ان میں سے ہر تہذیب نے عرب اسلامی کلچر پر کتنا اثر ڈالا یہ مسئلہ علماء اور تاریخ دانوں کے درمیان ابھی تک بحث و مباحثے کا عنوان ہے۔ یونانی فکر نے اسلامی فلسفے پر گہرا اثر ڈالا، جبکہ ایران اور بازنطین کا اثر حکومت کے نظام اور طرزِ تعمیر پر بہت زیادہ پڑا۔ مذہب، فلسفے اور سائنس پر ہندوستان نے اسلامی فلسفے پر کتنا اثر چھوڑا، اس مسئلے میں اختلاف رائے موجود ہے۔ بہر حال اتنی بات میں تو شبہ کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے کہ ان میدانوں میں ہندوستان اور اس کے پڑوسی ممالک سے جغرافیائی، بیوپاری اور سیاسی وجوہات کی بناء پر ایک مستقل رشتہ یا تعلق موجود تھا۔ جدید تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نستوری عیسائیت، مانوی مذہب (Manichism) اور بدھ مذہب، وسطی ایشیا اور خراسان کے دور دراز یا الگ تھلگ، علاقوں میں دسویں صدی تک باقی رہے اور ان کی عبادت گاہیں، سنسکرت اور بدھ مت کی کتابیں اور علماء اُس علاقے میں اُس وقت تک پائے جاتے تھے۔ نویں صدی میں بدھ مت اور فلکیات (آسٹرونومی) اور علم طب پر کتابیں اخلاقیات کی کتاب بت اُپدیش اور منطق اور فوجی سائنس پر کتابچے عربی زبان میں ترجمہ ہوئے تھے۔ عربوں کا تعلق جن جن ملکوں سے بھی قائم ہوا وہاں سے وہ اُن کے رسم و رواج، سائنس، مذہب وغیرہ کی معلومات حاصل کرنے کے زبردست شائق تھے، جن میں ہندوستان بھی شامل تھا۔ چنانچہ الکندی نے ہندوستانی مذہبوں پر ایک کتاب تالیف کی۔ الندیم الاشعری، شہرستانی اور دوسرے بہت سے علماء نے ہندوستان کے مذہب اور یہاں کے فلسفیانہ نظام کی توضیح و تشریح پر بحث کرنے کے لیے اپنی کتابوں میں ابواب قائم کیے۔ البیرونی جو اس علاقے میں دسویں صدی میں آیا تھا اُس نے پاتن جلی کی 'یوگ سوتر' کا

اجمیر اور دہلی دونوں جگہوں کی بغاوتوں نے اس مسئلہ کو حل کردیا۔ اجمیر میں پرتھوی راج کے بیٹے کی بغاوت کو کچلنے کے لیے جس نے ترکوں کی بالادستی قبول کرلی تھی، ایبک نے 1192 میں دہلی پر یورش کی اور اس کو فتح کرلیا۔ اب دہلی ہندوستان میں ترکی عمل درآمد کا اہم مرکز بن گیا۔ تومر سردار کو کچھ اور مدت تک کے لیے برقرار رکھا گیا لیکن جب وہ باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث پایا گیا تو 1193 میں اسے معزول کردیا گیا۔ پرتھوی راج کے بھائی ہری راج کو جو اس وقت راجپوت مزاحمت کی سربراہی کررہا تھا، شکست دے کر اجمیر پر قبضہ کرلیا گیا۔ ہری راج اپنی ہار کی شرمندگی میں خود آگ میں کود کر جل گیا۔ اب اجمیر ایک ترکی گورنر کے سپرد کردیا گیا اور پرتھوی راج کے بیٹے گووند کو وہاں سے ہٹا کر رنتھمبور چلے جانے پر مجبور کیا۔

دہلی کے اطراف میں اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کے بعد اب ترکوں نے قنوج کے گہڑوالوں پر حملہ کرنے کی تیاری کی جو اس وقت ملک کی سب سے زیادہ طاقتور سلطنت سمجھی جاتی تھی۔ 1194 میں معزالدین ہندوستان واپس لوٹ آیا۔ ترائن کی لڑائی کے فوراً بعد ترکوں نے بالائی دوآب کے علاقے میرٹھ، برَن (موجودہ بلند شہر) اور کول (موجودہ علی گڑھ) پر قبضہ کرلیا تھا جو ڈور راجپوتوں کے قبضہ میں تھے حالانکہ ڈوروں نے سخت مزاحمت کی اور اس علاقے کی جنگی اہمیت بھی بہت تھی۔ لیکن گہڑوال حکمراں جے چند ان کی مدد کے لیے نہیں آیا۔ اس سے پہلے اس نے اپنے آپ کو بہت محفوظ سمجھتے ہوئے معزالدین کے ہاتھوں پرتھوی راج کی شکست پر بہت خوشیاں منائی تھیں اور اس کے دربار میں جشن منایا گیا تھا۔

1194 میں معزالدین نے پچاس ہزار سواروں کے ساتھ قنوج اور بنارس کی طرف کوچ کیا۔ یہ لڑائی چندآور میں لڑی گئی جو اب اٹاوہ میں ہے۔ اس زمانے کی ادبی تحریروں میں یہاں بھی مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ ان کے مطابق جے چند کے پاس 80,000 زرہ پوش، 30,000 گھوڑے، 300,000 پیدل فوج، 200,000 تیرانداز اور بے شمار ہاتھی تھے۔ جے چند کو جو کوئی بڑا جنگ آزما نہیں تھا زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ لوٹ مار اور قتل وغارت گری کے بعد اسنی کا قلعہ (ضلع فتح پور) جہاں گہڑوال کا خزانہ تھا، لوٹ لیا گیا۔ بنارس کو بھی جو پہلے گہڑوال کی راجدھانی تھی، لوٹا گیا۔ اس کے علاوہ بہت سارے مندروں کو بھی تباہ کیا گیا۔ آخرکار 1198 میں قنوج پر

عربی میں ترجمہ کیااور اس میں یوگیوں کو صوفیوں کے متوازی قرار دیا۔ بعض مفکرین کا خیال ہے کہ نیائے ویشیشک کے نظریۂ جوہر (اٹامک تھیوری) نے بھی اسلامی فلسفے پر اثر ڈالا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ کی پہلی تین صدیوں میں عرب دوسرے تصورات کو اخذ کرنے کے سلسلے میں کشادہ ذہن تھے۔ مگر اس کے باوجود اسلام کے بنیادی اصول اور اس کے فلسفے کی بنیاد قران اور رسول کے اقوال وافعال میں ہی گہرائی سے جمی رہی۔

(ا) صوفی تحریک: ابتدا

اسلام کی تاریخ میں دسویں صدی سے ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس میں عباسیوں کے سیاسی کھنڈروں پر ترکوں کے اقتدار کی نئی عمارت کھڑی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی فکر و فلسفہ اور عقائد کی دنیا میں بھی بہت اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ فکر و فلسفے کی دنیا میں معتزلہ یا عقلی دلائل کے ماننے والے گروپ کے غلبے کا خاتمہ ہوا۔ قران و حدیث کی بنیاد پر مبنی راسخ العقیدہ طبقہ وجود میں آیا اور مستحکم ہوا اور صوفیاء کے سلسلے واضح طور پر منظر عام پر نظر آنے لگے۔

معتزلہ یا معقولیت پسند، فلاسفہ جنھیں عباسی خلفاء کی حمایت حاصل تھی، اور جو اپنے مخالفین کو کچل ڈالنے اور ختم کرنے میں سیاسی طاقت کا بھی استعمال کر لیتے تھے، انھوں نے اسلامی شریعت کو عقلی دلائل پر پرکھ کر اُسے منظم کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کی فکر کا دائرہ خدا کی حقیقت یا ماہیت، تخلیق، انسان کا خدا سے رشتہ، روح کی حقیقت وغیرہ سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کی دلیل تھی کہ انسان اپنے اعمال کا خود ہی مالک و مختار ہے خواہ وہ اچھے اعمال ہوں یا برے اور قرآن تخلیق کیا گیا تھا راسخ العقیدہ تصور سے بالکل مختلف تھا جن کا عقیدہ تھا کہ یہ حرف بہ حرف خدا کا کلام ہے، اس لیے دائمی ہے اور غلطیوں سے مبرا ہے۔

راسخ العقیدہ فرقے کا معتزلہ زمرے پر اعتراض یہ تھا کہ انھوں نے تشکیک اور الحاد پھیلایا ہے۔ یہ لوگ معتزلہ کے فلسفے کو وحدت وجود کے فلسفے کے متوازی قرار دیتے تھے جن کا کہنا تھا کہ خدا اور یہ پوری تخلیق کی ہوئی دنیا بنیادی طور پر ایک ہی وجود کا مظہر ہیں۔ راسخ العقیدہ لوگ اس تصور کو اس لیے الحاد یا کفر مانتے تھے کہ اس میں خالق و مخلوق کے درمیان فرق ختم ہو جاتا ہے۔

معتزلیوں پر متواتر ظلم و جبر اور دباؤ اور راسخ العقیدہ زُمرے کی مستقل مخالفت کے نتیجے

میں معتزلہ فرقہ بالکل ختم ہو گیا۔ اس سے روایت پسندوں کو مضبوطی حاصل ہوئی اور اسلامی شریعت یا قانون کے چار مسلک واضح طور پر منظم ہو گئے۔ ان چار مکتبوں میں سے حنفی مکتبِ فکر جو سب سے زیادہ کشادہ ذہن یا آزاد فکر رکھتا تھا، اِسے مشرقی ترکوں نے اپنایا اور یہی بعد میں ہندوستان آئے۔ معتزلیوں کے خاتمے نے صوفی طرزِ فکر کو بھی تقویت بخشی۔

اہلِ باطن یا عارف جنھیں بعد میں صوفی کہا جانے لگا، اسلام میں شروع میں ہی نظر آنے لگتے تھے۔ ان میں زیادہ تر لوگ وہ تھے جو اپنے زہد اور دین داری میں بہت سچے تھے اور انھیں دولت و اقتدار کے بے جاد کھاوے سے نفرت تھی اور اسلامی سلطنت کی توسیع کے بعد سے اسلامی اقدار و اخلاق میں انحطاط سے بے چینی محسوس کرتے تھے۔ شروع کے کچھ صوفیاء جیسے حسن بصری اور اُن کے ماننے والے، عارفہ رابعہ بصری (فوت: آٹھویں صدی) وغیرہ نماز، متواتر روزوں، اور خدا سے بے غرض محبت پر بہت زور دیتے تھے۔ رابعہ رہبانیت یا ترکِ دنیا کی زندگی گزارتی تھیں اور اُن کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ اس وقت تک صوفیوں نے پٹی دار اونی کپڑے (صوف) کا لبادہ پہننا شروع کر دیا تھا، جو ان کے قول کے مطابق رسول کی سنت تھا اور جسے عیسائی راہب اور مذہبی بزرگ بھی پہنا کرتے تھے۔ ذوالنون مصری (فوت: نویں صدی)، جنھوں نے عرب اور شام میں طویل سفر کیے تھے، انھوں نے دھیان یا مراقبے کے ذریعہ عارفوں کے خدا تک پہنچنے کا طریقہ بیان کیا۔ ذوالنون پر الحاد کا الزام لگایا گیا مگر بعد میں وہ بری کر دیے گئے۔ صوفیوں کے فنا کے نظریے سے جن میں اہلِ باطن لوگ روحانی طور پر خدا میں ضم ہو جانے کا تصور پیش کرتے ہیں، راسخ العقیدہ علماء ناراض تھے اور ان سے متواتر ٹکراؤ رہتا تھا۔ چنانچہ بایزید بایات جس کا دادا آتش پرست تھا، اس کے حالتِ وجد میں دیے اس بیان سے علماء کو بہت جھٹکا لگا "مجھے فخر ہے۔ میری شان کتنی عظیم ہے۔"، "میں نے کعبے کو اپنے اِرد گرد گھومتے دیکھا ہے۔" مگر اس کا شاگرد منصور بن حلاج بغدادی اتنا خوش نصیب نہیں تھا، چنانچہ وہ قید ہوا اور کفر والحاد کے الزام میں قتل کر دیا گیا (دسویں صدی)۔ منصور نے دور دراز کے سفر کیے تھے اور وہ سندھ بھی پہنچا تھا اور اب یہ بات تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ وہ ویدوں کے کچھ عالموں سے بھی ملا تھا۔ لیکن اب یہ بات بھی عام طور پر مانی جاتی ہے کہ اس وقت تک یوگ کے تصورات اور ویدوں کے نظریات ایران میں بہت عام ہو چکے تھے اور انھیں

حاصل کرنے کے لیے سندھ آنا کسی طرح ضروری نہیں تھا۔ باطنی تجربات یا تصورات بہت سے اور مذہبوں میں بھی عارفوں کو اسی سمت میں لے جاتے ہیں۔ منصور کا اناالحق (میں ہی حقیت / خدا ہوں) کا اس طرح کھل کر اعلان صوفیاء کے اس یقین یا عقیدے کا صرف ایک مظہر تھا کہ کشف یا روشن باطنی کا یہی آخری نقطۂ عروج ہے کہ خود کو اللہ میں ضم کر دیا جائے۔ بہر طور منصور کے توبہ سے انکار، اور اپنے یقین اور عقیدہ کے لیے اپنی جان قربان کر دینے نے صوفیوں کو صرف شہادت کی خلعت ہی نہیں پہنا دی بلکہ اُن کی صدق دلی، عقیدے کی پختگی اور دنیا سے بے تعلقی کی سند بھی انھیں عطا کر دی۔

اس طرح ایک خاموش اور پر سکون تحریک جس کی بنیادیں محبت، لگن، جذبے اور گیان دھیان میں پیوست تھیں رفتہ رفتہ ایک ایسی وجدانی محبت کی تحریک میں تبدیل ہو گئی جس میں سماجی رسم و رواج اور مذہبی عقائد اور عملوں کو بھی نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔

دسویں صدی تک اسلامی دنیا میں صوفیت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ دسویں اور بارھویں صدی کے درمیان میں کچھ فلسفیانہ نظریات، عقائد کچھ ریاضی عمل جیسے سانس روکنا، اعتراف گناہ اور کفارہ، مختلف سلسلوں اور مکاتیبِ فکر کا قیام، اور بہت سے صوفیوں کے تحت خانقاہوں اور محتاج خانوں وغیرہ کا قیام وغیرہ مکمل ہوئے۔ شہر بہ شہر گھومنے والے یوگی، جو اسلامی دنیا میں 'جوگی' کہلاتے تھے، انھوں نے صوفیاء کو 'ہتھ یوگ'، کی مشقوں سے متعارف کیا۔ فی الحقیقت 'ہتھ یوگ' پر سنسکرت کی کتاب 'امرت کنڈ' کا اسی زمانے میں عربی میں اور کچھ بعد میں فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔

فارسی کے شعراء کے اِس سلسلے نے اللہ سے محبت اور اس میں ضم ہو جانے کا صوفیا کا پیغام دور دور تک پہنچایا۔ ان میں سے چار مشہور ترین شعراء تھے: ثنائی (فوت: 1131)، عطار (فوت: 1230)، عراقی (فوت: 1289) اور رومی (فوت 1273)۔ ان کی شاعری کو عشقِ حقیقی اور جذبِ باطن کی معراج مانا گیا اور یہ دنیا کے ہر حصے تک پہنچی جس میں ہندوستان بھی شامل تھا۔ یہ شعراء اپنے طرزِ فکر میں انسان دوست تھے اور تمام مذاہب کے لوگوں سے رواداری اور یکسانیت کا تصور رکھتے تھے، ثنائی کے یہ مصرعے اس جذبے کی بہترین عکاسی کرتے ہیں:

"ایمان و کفر، دونوں اُس (ذاتِ باری) کی طرف دوڑ رہے ہیں
اور (یک زبان) اعلان کر رہے ہیں
وہی واحد ہے اور کوئی اُس کی خدائی میں شریک نہیں ہے۔"

کچھ صوفیوں نے موسیقی کی محفلوں (سماع) کی بھی حمایت کی جس میں ایک جذب وجدان کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اس پر بھی علماء بہت ناراض تھے۔

الغزالی، جن کا راسخ العقیدہ علماء اور صوفیاء دونوں بہت احترام کرتے ہیں، انھوں نے اسلامی راسخ عقیدے اور صوفیت میں قربت یا کسی طرح کی مصالحت پیدا کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس میں انھیں خاصی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ انھوں نے معقولیت پسند فلسفے کو اس دلیل سے ایک بار پھر جھٹکا دیا کہ اللہ کی ذات کا عرفان (مثبت معلومات) اور اُس کی خصوصیات واوصاف محض عقل سے حاصل نہیں کیا جاسکتے۔ اسے الہام یا کشف سے پایا جاسکتا ہے اس لیے الہامی کتاب قرآن صوفیاء اور مسلمانوں دونوں کے لیے لازمی ہے۔

اس وقت صوفیاء بارہ سلسلوں میں منقسم یا منظم ہو چکے تھے۔ بہر حال، یہ تعداد بھی تبدیل ہوتی رہی اور اس میں کچھ نئے سلسلے شامل ہوتے رہے اور کچھ معدوم ہوتے رہے۔ ابتدائی دور میں سلسلوں نے صوفیوں کو کچھ استحکام یا تنظیم بخشی اور انھیں علماء کے مخالفانہ حملوں کو جھیلنے اور روحانی و عرفان کو آگے بڑھاتے رہنے کے قابل کر دیا۔ کسی سلسلے کا سربراہ کوئی جانا پہچانا صوفی یا اہل باطن ہوتا تھا جو کسی خانقاہ یا کسی محتاج خانے میں اپنے شاگردوں (مریدوں) کے ساتھ رہتا تھا۔ استاد (پیر) اور شاگرد (مرید) کا درمیانی رشتہ یا تعلق صوفی نظام کا سب سے اہم حصہ تھا۔ ہر پیر اپنے کام کو آگے بڑھانے کے لیے اپنا ایک خلیفہ مقرر کرتا تھا۔ یہ لوگ مختلف علاقوں میں روحانی کام انجام دیتے رہنے کے لیے وَلی یا نائب بھی مقرر کیا کرتے تھے۔

صوفیت کا نظام مجموعی طور پر دو حصوں یا مسلکوں میں بٹا ہوا ہے: باشرع یعنی وہ جو اسلامی قانون (شرع) کے پابند ہیں اور دوسرے وہ جو بے شرع یعنی ان قوانین کے پابند نہیں ہیں، ان دونوں مسلکوں کے سلسلے ہندوستان میں پھلے پھولے۔ موخرالذکر کے پیروکار زیادہ تر گھومتے پھرتے رہنے والے صوفی قلندر ہوتے تھے، حالانکہ ان قلندر صوفیوں نے اپنا کوئی سلسلہ تو قائم

نہیں کیا لیکن ان میں سے کچھ نے بڑے پیمانے پر عوام میں مقبولیت اور احترام پایا اور اِن کا احترام کرنے والوں میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے۔

چشتی اور سہروردی سلسلے:

چشتی سلسلہ:

سلطنت عہد میں جو دو سلسلے ہندوستان میں سب سے زیادہ پھولے پھلے وہ چشتی اور سہروردی تھے۔ سہروردی سلسلے کا اثر پنجاب اور سندھ میں زیادہ تھا جبکہ چشتی صوفیاء دہلی اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں جن میں راجستھان، پنجاب کے کچھ علاقے اور موجودہ اتر پردیش کے کچھ حصے شامل تھے، میں زیادہ متحرک نظر آتے تھے۔ یہ سلسلے بنگال اور بہار، مالوہ، گجرات وغیرہ میں اور بعد میں دکن میں بھی پھیل گئے۔ ایک مختلف سلسلہ 'کبرادیہ' کشمیر میں پھیلا۔ عام طور پر کسی ایک سلسلے کے صوفی دوسرے سلسلے کے صوفیوں سے عزت و احترام سے پیش آتے تھے۔ چنانچہ سہروردی صوفیاء دہلی آئے تو یہاں اُن کا خیر مقدم ہوا اور چشتی صوفیاء ملتان گئے تو وہاں بھی انھیں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اصل میں یہ اُس روایت کا اظہار کرتا ہے کہ صوفی حضرات مختلف علاقوں کو مختلف صوفیوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ چنانچہ جب ایک موسیقار نے، جو پنجاب سے ملتان جا رہا تھا، بابا فرید سے اپنے حق میں دُعا کرنے کی درخواست کی تو بابا نے جواب میں کہا کہ اُن کے روحانی اثر کی حدود فلاں تالاب تک ہیں اور اس سے آگے سہروردی صوفی شیخ بہاء الدین زکریا کی حدود شروع ہو جاتی ہیں اس لیے وہ اُن کی دعائیں بھی حاصل کرے۔

چشتی سلسلہ جسے ہندوستان میں معین الدین چشتی نے قائم کیا تھا وہ فی الحقیقت بنیادی طور پر ہندوستانی ہی تھا چونکہ چشت (افغانستان) میں تو یہ سلسلہ وہیں ختم ہو گیا تھا۔ معین الدین چشتی کی ابتدائی زندگی اور کاموں کے بارے میں بہت کم معلومات موجود ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے اقوال یا تعلیمات کے بارے میں اپنی کوئی کتاب یا مجموعہ نہیں چھوڑا۔ آج جو کچھ اُن کے بارے میں موجود ہے وہ بھی اُن کی موت کے ڈیڑھ سو سال بعد لکھا گیا اور بعد کے لکھنے والوں نے ان کے بارے میں طرح طرح کی خیال آرائیاں اپنی طرف سے بڑھا دی ہیں، جیسے پرتھوی راج چوہان کا ان

پر ظلم وجبر اور اُن کے معجزات وغیرہ جو عوام میں مقبول ہیں۔ جدید تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ معین الدین، معزالدین محمد غوری کی پرتھوی راج پر فتح کے بعد ہندوستان آئے نہ کہ اس سے پہلے اور اجمیر وہ 1206 سے پہلے نہیں پہنچے اور اس وقت تک یہاں ترک تسلط پوری طرح مستحکم ہو چکا تھا اور یہاں ترکی غازیوں اور ان جنگی قیدیوں کو اچھی خاصی آبادی موجود تھی جنھیں جبراً مسلمان کر لیا گیا تھا۔ خواجہ نے اجمیر میں اس لیے قیام کیا کہ چشت کی طرح یہ بھی سیاسی ہلچل کے مرکز دہلی سے دور ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ خواجہ محسوس کرتے تھے کہ دنیاوی الجھنوں سے دور ایک روحانیت کی زندگی گزارنے کے لیے کسی بڑے بارونق شہر کے مقابلے میں چھوٹا سا قصبہ ہی زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ ان کے شاگرد حمیدالدین نے ناگور میں قیام کیا، جو راجستھان کا ایک اور چھوٹا سا شہر تھا جہاں کافی مسلمان آبادی موجود تھی۔ خواجہ معین الدین شادی شدہ تھے مگر وہ خدا سے لو لگائے ایک راہب کی سی پاک صاف زندگی گزارتے تھے۔ ان کا سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو خدا پرستی کی نیک زندگی گزارنے میں مدد کریں۔ اُن کا مقصد تبدیلی مذہب کروانا نہیں تھا کیونکہ وہ اس بات میں یقین رکھتے تھے کہ مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔

معین الدین کی بحیثیت صوفی سنت شہرت اُن کی موت (1235) کے بعد بڑھی۔ محمد تغلق اُن کی قبر پر آیا اور ان کے مزار پر گنبد اور ایک مسجد پندرھویں صدی میں مالوہ کے سلطان محمود خلجی نے تعمیر کرا دیے۔ بحیثیت صوفی سنت معین الدین کی حیثیت وعظمت اپنے نقطہ عروج پر اکبر کے دور میں پہنچی جو ان کا زبردست معتقد تھا۔ اکبر کے لیے سیاسی اعتبار سے اجمیر اہم مقام تھا، چونکہ متواتر بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں ایسے مقام پر معین الدین جیسی مقدس شخصیت جن کا فیض بلا تفریق مذہب ہر شخص کے لیے عام تھا، اکبر کے لیے کچھ مثبت اثرات ہی پیدا کر سکتی تھی۔

دہلی پر چشتی سلسلے کا اثر قطب الدین بختیار کاکی نے مستحکم کیا، جو اپنے آبائی وطن ماوراء النہر سے 1221 میں دہلی آ گئے تھے۔ سلطان التتمش نے بڑی گرم جوشی سے اُن کا خیر مقدم کیا کیونکہ بحیثیت صوفی اُن کی شہرت ان کے دہلی آنے سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکی تھی۔ اس وقت تک بہت سے ممتاز علماء مذہبی اعتبار سے محترم شخصیتوں اور وسطی اور مغربی ایشیا میں منگولوں کی تاخت و تاراج سے بچ کر بھاگے ہوئے پناہ گزیں شاہزادوں وغیرہ کے بہت بڑی تعداد میں دہلی آجانے کی

وجہ سے دہلی کا اپنا درجہ اس وقت کی دنیائے اسلام میں ایک ممتاز اسلامی مرکز (قبۃ الاسلام) کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ بختیار کاکی نے چشتی سلسلے کو دہلی کے خصوصی صوفی سلسلے کی حیثیت میں قدم جما لینے کا مشکل کام سر انجام دیا، کیونکہ یہاں مذہبی راسخ العقیدہ عناصر اور سہروردی سلسلے دونوں طرف سے چنوتی موجود تھی۔ اول الذکر انھیں دہلی سے ہی نکال دینا چاہتے تھے، چنانچہ انھوں نے اُن کی موسیقی کی محفلوں کے جرم میں انھیں بدعتی قرار دے دیا۔ بہر حال التمش نے اس جرم کو اس لیے مسترد کر دیا کہ وہ خود علماء کے خلاف صوفی اثرات کو کام میں لانا چاہتا تھا۔ اس وقت تک بختیار کاکی عوام میں اتنے مقبول اور محترم ہو چکے تھے کہ جب انھوں نے دہلی سے اجمیر جانے کا ارادہ کیا تو لوگوں کے غول کے غول اُن کے ساتھ ساتھ میلوں تک چلتے رہے آخر مجبور ہو کر انھیں اپنی ہجرت کے خیال کو ہی چھوڑنا پڑا۔ دوسری طرف سہروردی سلسلے کا راسخ العقیدہ ہونے کا انداز بھی دہلی والوں کو پسند نہ آیا، اس لیے وہ بھی ناکام رہے۔

بختیار کاکی کے چہیتے شاگرد اور نائب بابا فرید الدین گنج شکر تھے جو آج کے ہریانہ میں ہانسی کے مقام پر رہتے تھے۔ اس کے بعد یہ اجودھن منتقل ہو گئے جو ملتان سے لاہور کے سب سے بڑے عام راستے پر ستلج کے کنارے واقع تھا۔ بابا فرید گنج شکر غربت یا فقیری، دنیاوی سازو سامان اور دنیاداری کو تجنے، فاقہ کشی اور دوسری سخت اخلاقی پابندیوں، خاکساری اور دوسروں کی خدمت پر خاص طور پر زور دیتے تھے۔ اُن کے انداز میں کچھ ایسی وسعت اور ہمہ گیری تھی کہ کچھ شعر جنھیں ان سے منسوب کیا جاتا ہے، گرونانک کی گرو گرنتھ صاحب میں بھی شامل کر لیے گئے۔ (گو کہ کچھ نئے محققین کا خیال ہے کہ لسانی اعتبار سے گرو گرنتھ صاحب میں شامل یہ اشعار ان کے کچھ ایسے شاگردوں کے ہیں جنھوں نے اپنا نام بھی فرید ہی رکھ لیا تھا، البتہ خیالات وہی ہیں جو بابا فرید گنج شکر کے تھے)۔

بابا فرید کے سب سے اہم نائب یا خلیفہ نظام الدین اولیا (فوت 1325) بلا شبہ دہلی میں سب سے مشہور چشتی صوفی تھے جن کے زمانے میں چشتی سلسلہ دہلی میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچا۔ دہلی میں زبردست سیاسی ہلچل کے دور میں یہ پچاس برس رہے اور متواتر کام کرتے رہے۔ ان کے دور میں بلبن خاندان کا عہد ختم ہوا اور علاء الدین خلجی بر سر اقتدار آیا، پھر علاء الدین کی موت کے

بعد اختلال اور ہلچل کا دور گزرا اور پھر تغلق اُبھرے۔ خاندانوں اور حکومتوں کے اس متواتر پھیر بدل میں نظام الدین صرف اس چشتی فلسفے کی وجہ سے باقی رہے کہ وہ سیاست سے بالکل بے تعلق اور دور رہتے تھے اور حکمرانوں اور امراء سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ جب خسرو نے انھیں ایک بہت بڑی رقم دی تو انھوں نے اُسے قبول تو کر لیا مگر اُسے فوراً ضرورت مندوں اور غریبوں میں بانٹ دیا۔ بعد میں جب غیاث الدین تغلق نے وہ رقم واپس مانگی تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ رقم مسلمانوں کی تھی اور انھیں میں تقسیم کی جا چکی ہے۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ سلطان اُن کے جواب سے مطمئن ہوا یا نہیں۔ افواہ یا زبانی روایت یہی ہے کہ سلطان بنگال مہم سے واپسی پر ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنا چاہتا تھا۔ لوگوں نے جب نظام الدین سے پوچھا تو انھوں نے بے فکری سے جواباً کہا: "ہنوز دلّی دور است" (ابھی دلّی دور ہے)۔ اور یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ سلطان دہلی پہنچنے سے پہلے اس پویلین میں ہی مر گیا جو محمد بن تغلق نے اس کے خیر مقدم کے لیے بنوایا تھا۔ یہ کہانی سچی ہے یا نہیں۔ بہر حال اس نے نظام الدین کو ایک زندہ روایت ضرور بنا دیا۔

نصیر الدین چراغ دہلی (فوت 1356) دہلی میں چشتی سلسلے کے آخری بڑے صوفی ہوئے۔ محمد بن تغلق کی موت کے وقت نصیر الدین سندھ میں اس کی فوج میں تھے اور انھوں نے ہی فیروز کی تخت نشینی میں مدد دی۔ فیروز ان کا بہت احترام کرتا تھا اور دہلی میں کئی بار ان سے ملنے بھی گیا، مگر صوفی پھر سیاست سے علیحدہ رہنے کی پالیسی پر قائم ہو گئے۔ اپنے بعد کسی کو اس معیار اور توقع پر پورا اترتے نہ دیکھ کر نصیر الدین چراغ نے اپنا جانشین (خلیفہ) کسی کو نامزد نہیں کیا اور اپنے تبرکات یا ذاتی سامان انگی پیوند لگی گدڑی، جانماز، لکڑی کا پیالہ، تسبیح، کھڑاؤں وغیرہ کو اپنے ساتھ ہی دفن کر دینے کا حکم دے دیا۔ نصیر الدین کے اپنے جانشین نامزد نہ کرنے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ چشتی صوفیاء ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئے جس سے چشتی صوفی خیالات اور زیادہ وسیع وعریض علاقوں میں عام ہو گئے۔

چشتی سلسلے کے صوفیاء سادی زندگی، غربت وافلاس، خاکساری اور خدا سے بے لوث لگن اور محبت پر بہت زور دیتے تھے۔ غربت کے اپنے تصور کو وہ اس حد تک لے گئے کہ پکے گھروں کے بجائے کچے مٹی کے چھپروں والے گھروں میں رہتے تھے۔ یہ لوگ خود اور ان کے خاندان

والے کئی کئی دن فاقوں میں زندگی گزارتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ روحانی زندگی کے لیے اپنی حسوں پر مکمل قابو حاصل کرنا ضروری ہے۔اس کے حصول کے لیے انہوں نے ریاضت اور مشقت کا راستہ چنا جیسے روزہ رکھنا' سانس روکنا وغیرہ اور گناہوں کے کفارہ کے طور پر خود اذیتی کے عمل اختیار کیے۔یہ لوگ ترک دنیا کی تعلیم دیتے تھے' جس سے ان کا مطلب مال و دولت' حکومت کی نوکری' اور (بدکردار) عورتوں سے تعلق سے کنارہ کشی تھا۔اس کا مطلب سماج یا معاشرہ سے قطع تعلق نہیں تھا۔ معین الدین چشتی کے تصور کے مطابق خدا سے لو لگانے کا سب سے اعلیٰ وسیلہ دکھی اور مصیبت زدہ لوگوں کو راحت پہچانا' محروموں اور مجبوروں کی ضرورتوں کو پورا کرنا اور بھوکوں کو کھانا کھلانا تھا۔ نظام الدین اولیا کے مطابق بے غرض خدمت خلق فرض نماز سے زیادہ اہم چیز تھی۔نظام الدین کے علاوہ تمام ممتاز چشتی صوفیاء شادی شدہ تھے اور خاندان رکھتے تھے۔اس طرح صوفی سنتوں کو شادی شدہ زندگی گزارنے کی اجازت تھی بشرطیکہ یہ انکی روحانی زندگی میں دخل انداز نہ ہو۔

چشتی صوفیاء لوگوں کو عام طور پر چار حصوں میں تقسیم کرتے تھے۔ان میں صوفیاء یا اللہ والے جو دوسروں کی تبلیغ و اصلاح کے کام میں مصروف تھے' اعلیٰ ترین درجے پر سمجھے جاتے تھے۔ ان کے بعد ان کے شاگرد آتے تھے۔ حکمراں اور صاحبان علم تیسرے درجے میں شمار ہوتے تھے اور عوام جن کے پاس نہ علم تھا نہ روحانی نشو و نما کی خواہش وہ چوتھے درجہ میں آتے تھے۔اپنے شاگردوں یا مریدوں کو چشتی صوفیا کی ہدایت تھی کہ وہ کسی پیشے سے اپنی روزی کمائیں۔زراعت و تجارت بھی قابل قبول کام تھے۔ مگر انہیں مشورہ دیا جاتا تھا وہ اپنی روزانہ ضروریات کو پورا کرنے سے زیادہ دولت جمع نہ کریں۔ بیوپاریوں اور کاروبار میں ایمانداری اور سچائی پر زور دیا جاتا تھا۔ گھریلو ذمہ داریاں منظور تھیں مگر شرط وہی تھی کہ وہ روحانی ترقی میں حایل نہ ہوں۔صبر و تحمل' غصے پر قابو' دوسروں کو تکلیف نہ پہنچانا اور محبت اور بھائی چارے کا انداز' تشدد سے گریز' ان تمام چیزوں پر زور دیا جاتا تھا۔ لیکن اسے عدم تشدد' کی پالیسی نہیں کہا جاسکتا چونکہ اس کا تعلق حکومت کے طرز فکر سے تھا۔

چشتی صوفیاء لوگوں میں دولت' مذہب' عقائد اور خاندانی حیثیت وغیرہ کی بنیاد پر کسی

قسم کا امتیاز نہیں برتتے تھے۔ایسے وقت میں جب ترکوں نے اسلامی برادری اور رواداری کے سارے اصول عام طور پر بھلا دیے تھے اور عام لوگوں کو، جن میں نو مسلم بھی شامل تھے، حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، صوفیوں کے مساوات کے اس تصور نے نہ صرف انہیں عوام میں مقبول کیا بلکہ کچھ سماجی تناؤ اور خلشوں کو کم کرنے میں بھی مدد کی۔ چنانچہ نظام الدین اولیاء کے جماعت خانے کے دروازے عوام کو ہمدردی، پشت پناہی اور صحیح مشورہ دینے کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ حالانکہ صوفیوں کی بنیادی دلچسپی مسلمانوں کے لیے بہتری اور رفاہی کاموں میں تھی مگر ان کی ہمدردی اور دیکھ ریکھ کے دائرے سے ہندو خارج نہیں تھے۔ معین الدین چشتی کے شاگرد حمید الدین ناگوری ہندو جذبات واحساسات کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ وہ خود سبزی خور ہو گئے تھے اور مستقل اپنے شاگردوں کو گوشت ترک کر دینے کا مشورہ دیتے رہتے تھے۔

چشتی صوفی ہندو اور جین یوگیوں سے آزادی سے ملتے جلتے تھے اور ان سے مختلف مسائل، خصوصاً یوگا ریاضتوں کے بارے میں گفتگو کرتے تھے۔ گو کہ یہ اپنے مرضی سے تبدیلیِ مذہب کا خیر مقدم بھی کرتے تھے مگر یہ بھی مانتے تھے کہ تبلیغ کے مقابلے میں ذاتی مثال ہی اس سلسلے میں زیادہ کارگر ہوتی تھی۔ بہر حال چشتی صوفیاء ہندو عقیدے کی طاقت کو بھی اچھی طرح جانتے اور مانتے تھے۔ چنانچہ ایک صوفی نے نصیحت کی: ”اوہ تم لوگ جو ہندوؤں کی بت پرستی پر ناک بھوں چڑھاتے ہو تمہیں ان سے یہ بھی سیکھنا چاہیے کہ عبادت (پرستش) کس طرح کی جاتی ہے۔“ ایک موقع پر اپنے کوٹھے پر اپنے دوست امیر خسرو کے ساتھ ٹہلتے ہوئے نظام الدین اولیاء نے کچھ ہندو لوگوں کو پوجا کرتے دیکھا۔ ان کی لگن اور جذبے سے متاثر ہو کر انھوں نے کہا: ”ہر فرقے نے اپنی راہ اپنا عقیدہ اور اپنی عبادت کا طریقہ منتخب کیا ہے۔“

چشتیوں کی یہی کشادہ دلی اور رواداری تھی جس کی وجہ سے وہ اس گنگا وادی میں کامیاب ہو گئے جس میں اکثریت غیر مسلموں کی تھی۔ بہر حال صوفی سلسلے بھی غربت وافلاس کی حدوں اور غیر مسلموں سے رواداری برتنے کے سلسلے میں اختلاف رکھتے تھے۔ کشمیر میں 'کبراویہ' سلسلہ اپنے پیروؤں کو ہندو مندروں کی بے حرمتی کرنے اور انہیں برباد کر دینے کی ترغیب دیتا تھا۔ پھر بھی اسی زمانے میں وہ ہندوؤں سے اچھے تعلقات بھی رکھتے تھے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے اُن اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب

قبضہ ہو گیا۔

ترائن اور چنداور کی لڑائیوں کے ساتھ ہی گنگا کی وادی میں ترکی حکومت کی بنیاد قائم ہوئی۔ اکاد کا شورشوں کے علاوہ اس علاقے میں ترکی حکومت کے خلاف کوئی بڑی مزاحمت نہیں ہوئی پھر بھی ترکوں کو اس علاقے سے مخالفوں کو پوری طرح اکھاڑ پھینکنے اور اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے میں پچاس سال لگ گئے۔ اپنی مغربی اور جنوبی سرحدوں کو محفوظ کرنے اور مستقبل کی فوجی کارروائیوں کے لیے اپنے اڈے تیار کرنے کے واسطے ترکوں نے دہلی اور مالوہ کے درمیان اہم قلعوں کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ اس طر 96-1195 میں معزالدین نے بیانہ قلعہ پر قبضہ کیا۔ گوالیار جو سب سے محفوظ قلعہ تھا اس کا محاصرہ کیا گیا۔ یہ محاصرہ ڈیڑھ سال تک چلا جس کے بعد ہی اس کا حکمراں ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہوا۔ کچھ عرصے بعد کالنجر، مہوبا اور کھجوراہو بندیلکھنڈ کے چندیل حکمرانوں سے چھین لیے گئے جو گہدوال کے بعد اس علاقے کے سب سے زیادہ طاقتور حکمراں تھے۔

گنگا کی بالائی وادی اور مشرقی راجستھان سے آگے پھیلاؤ کی کوششیں دو سمتوں میں کی گئیں۔ مغرب میں گجرات اور مشرق میں بہار اور بنگال۔ معزالدین کے غلام نے گجرات میں انہل واڑا پر چڑھائی کی جو دراصل رائے کے خلاف ایک انتقامی کارروائی تھی جس نے راجپوت باغیوں کی مدد کی تھی جس کی جہ سے ایبک کو اجمیر میں پناہ گزیں رہنا پڑا جب تک کہ غزنی سے بھیجی ہوئی فوجیں وہاں نہ آ گئیں۔ رائے کو شکست ہوئی اور انہل واڑا پر قبضہ کر لیا گیا لیکن ترک اس پر زیادہ عرصے تک قبضہ نہیں رکھ سکے۔ اس سے ہندوستان میں ترکوں کی طاقت کی حد کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اس وقت تک بھی اتنے مضبوط نہیں تھے کہ اپنے مرکز دہلی سے دور دراز کے علاقوں پر اپنا قبضہ قائم رکھ سکیں۔ محمد بن بختیار خلجی کے ذریعہ بہار اور بنگال کی فتح ایک مخصوص واقعہ تھا جس کا ذکر ہم الگ کریں گے۔

1204 میں معزالدین کو زبردست پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔ آکسس دریا کے قریب اندخوئی کے مقام پر سمرقند کے بت پرست کراخانی ترکوں کے ساتھ ایک عظیم جنگ میں اسے شکست ہوئی اور مرو اور خراسان کے بیشتر علاقے اس کے قبضے سے نکل گئے۔ معزالدین کی وفات

سہروردی صوفیاء:

حالانکہ سہروردی سلسلہ بھی صوفیاء کا ہی سلسلہ تھا اور یہ بھی عارفانہ راہ پر گامزن تھے۔ مگر چشتیوں سے یہ کئی اہم معاملات میں مختلف تھے۔ چنانچہ بہاء الدین زکریا جو ہندوستان میں اس سلسلے کے بانی تھے' وہ بھوک یا خود اذیتی کے قابل نہیں تھے بلکہ کھانے کپڑے کے معاملے میں عام زندگی گزارنا صحیح سمجھتے تھے۔ نہ وہ غربت و افلاس کو روحانی زندگی کی ترقی کے لیے کوئی ضروری راہ تصور کرتے تھے۔ چشتیوں کے برخلاف جو اقطاع کے عطیات یا خانقاہوں میں صوفیوں کی زندگی گزارنے کے لیے دوسری بخششوں کو قبول نہیں کرتے تھے اور صرف بے طلب تحائف (فتوح) یا ایسی غیر مزروعہ زمینوں (احیاء) کو قبول کرتے تھے جہاں صوفی خود محنت مزدوری کر سکیں' سہروردی صوفی شاہی عطیات و امداد قبول کر لیتے تھے۔ چنانچہ بہاء الدین زکریا رئیس آدمی تھے اور خوشحالی زندگی گزارتے تھے۔ وہ اپنے مال و دولت کے جواز کے لیے یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ اس سے انھیں ان غریبوں کی خدمت کا زیادہ بہتر موقع ملتا ہے جو ان کے پاس جمع ہوتے ہیں۔ راسخ العقیدہ علماء کے احترام میں بہاء الدین زکریا مذہب کے تمام خارجی یا ظاہری عملوں نماز روزہ وغیرہ پر بھی زور دیتے تھے۔ وہ علم اور صوفیت کے ایک امتزاج کے ماننے والے تھے۔ وہ سماع یا محفلِ موسیقی کو بھی مسترد نہیں کرتے تھے مگر ان میں خود کبھی بھی شریک نہیں ہوتے تھے۔ اس سب کے باوجود راسخ العقیدہ علماء کی بہاء الدین زکریا سے مخالفت ختم نہیں ہوئی۔ بہاء الدین زکریا کے جانشین پنجاب اور سندھ میں ان کی موت کے ڈیڑھ سو سال بعد تک اہم کردار ادا کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ سہروردیوں کا حلقہ اثر گجرات' بنگال اور کشمیر میں بھی پھیل گیا۔ سہروردی صوفیا کچھ ہندو عملوں کو چشتیوں کے اپنا لینے کے بھی مخالف تھے، جیسے اپنے شیخ کے سامنے جھکنا، ملنے آنے والوں کو پانی پیش کرنا، صوفیاء کے حلقے میں تازہ طور پر داخل ہونے والے کا سر منڈوانا وغیرہ۔ یہ لوگ تبدیلیِ مذہب کے بھی زیادہ خواہشمند تھے۔ چنانچہ سہروردی صوفی شیخ جمال الدین جو بنگال میں رہتے تھے، وہ جبریہ تبدیلیِ مذہب سے بھی نہیں ہچکچاتے تھے اور انھوں نے پانڈوا کے نزدیک دیوتالا میں اپنی خانقاہ بنوانے کے لیے ایک ہندو مندر کو منہدم کرانے میں بھی کوئی برائی نہ سمجھی۔

حکومت کے سلسلے میں بھی چشتی اور سہروردی طرزِ فکر میں ایک بڑا اختلاف تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ چشتی صوفیا خود کو بادشاہوں، سیاست اور سرکاری خدمات سے بھی بالکل الگ تھلگ

رکھنے کے قابل تھے کیونکہ اُن کے مطابق سرکاری ملازمت صوفی کو سچے دل سے "صرف خدا کے لیے جینے" کے بنیادی اصول سے "دور رکھتی" ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے فلسفی، جیسے امام غزالی، حکومت وقت کی ہر طرح کی آمدنی کو ممنوعہ ذرائع سے آمد تصور کرتے تھے اور اس طرح ان ذریعوں کی آمدنی سے ہر طرح کی ادائیگیاں بھی ناجائز مانتے تھے۔ اُن کے نزدیک دربار سے ملحق پوری زندگی کا انداز اور حکومت وغیرہ سب کچھ اسلام کی حقیقی روح کے منافی تھے۔ چنانچہ امام غزالی نے آگے کہا تھا کہ "کسی کو بھی نہ ان (حکومتوں، درباروں وغیرہ) کے باقی یا جاری رہنے کی خواہش کرنی چاہیے، نہ ان کی مدح وثنا کرنی چاہیے، نہ ان کے معاملات کے بارے میں چھان بین کرنی چاہیے اور نہ ان سے ملحق ومددگار لوگوں سے تعلق رکھنا چاہیے۔"

بہر حال اس سلسلے میں اسلامی طرزِ فکر یا روایات یکساں نہیں ہیں۔ ایک طرف کچھ راسخ العقیدہ علماء نے پہلے چار خلفاء کے بعد قائم ہوئی حکومت کے کچھ بالکل غیر اسلامی رخوں کی نشاندہی بھی کی ہے لیکن خود علماء اور کچھ صوفیوں نے ہی اس پر بھی زور دیا ہے کہ دنیا بھر کے حکمراں خدا کے ہی چنے ہوئے ہوتے ہیں اور اسلامی شریعت میں ان کی تحقیر کرنے یا اُن کی حکم عدولی کی کسی طرح بھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ یہ لوگ اس سلسلے میں ایک حدیث کا حوالہ بھی دیتے ہیں کہ رسولؐ نے فرمایا تھا کہ جو اپنے سلطان کا حکم مانتا ہے وہ خدا کا حکم مانتا ہے اور جو خدا کا حکم مانتا ہے اس کو نجات حاصل ہوتی ہے۔

چنانچہ سہروردی سلسلے کے صوفیا سرکاری خدمات کو مسترد نہیں کرتے۔ اس سلسلے کے بانی شہاب الدین سہروردی خود خلیفہ سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ دربار کی سرپرستی میں تبلیغ کا کام کرتے تھے اور سرکاری خدمات میں ہی مصروف تھے۔ بہاء الدین زکریا، جنھوں نے ہندوستان میں اس سلسلے کی بنیاد رکھی انھوں نے اپنے پیر کی روایت کو قبول کیا اور اس سلسلے میں یہ دلیل دی کہ صوفیا کے دربار میں آتے جاتے رہنے سے انھیں سلطان سے مل کر غریبوں کے مسائل کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ سلطان اور اس کے لواحقین کو صوفیاء کے فیض اور دستگیری کی برکت سے کیوں محروم رکھا جائے۔

سہروردی صوفیوں نے سیاست میں بھی پوری طرح حصہ لیا۔ چنانچہ بہاء الدین زکریا

نے کھل کر التتمش کا ساتھ دیا اور جب التتمش نے قباچہ کو ہٹا کر سندھ کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا ارادہ کیا تو بہاءالدین نے انھیں وہاں آنے کی دعوت دی۔ یہ اس کے باوجود ہوا تھا کہ شیخ کو قباچہ کی پوری پوری حمایت اور سرپرستی حاصل تھی۔

حکومت اور سیاست کے سلسلے میں سہروردی صوفیا کے اس اندازِ فکر کو صرف یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ابتدائی دور میں ترکی سلطانوں کو مذہبی طبقوں کی حمایت درکار تھی تاکہ وہ اپنی طاقت کو مضبوط کر کے ایک مستحکم اور گٹھی ہوئی ریاست قائم کرلیں، چونکہ یہی دلیل چشتیوں کے لیے بھی مساوی طور پر پیش کی جاسکتی تھی۔ جیسا اوپر بتایا گیا راسخ العقیدہ مذہبی افراد اور بہت سے صوفی حضرات دونوں ہی ریاست کے معاملے میں دونوں طرح کا نظریہ رکھتے تھے۔ زیادہ تر لوگ اِسے ناگزیر برائی یا مصیبت تصور کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ سلطان سے عدل وانصاف کی توقع رکھتے تھے اور غریبوں اور کمزوروں کے لیے تحفظ چاہتے تھے۔ ایک چشتی صوفی نے پیغمبر کی ایک حدیث کا حوالہ دیا تھا کہ: ''اگر کسی سلطنت کے کسی بھی شہر میں کوئی عورت بھوکی سوتی ہے تو وہ روزِ حشر اپنے حکمراں کا گریبان پکڑے گی اور اس دن کا آنا یقینی ہے۔''

اس طرح چشتی بھی سلطان کو کریم النفس اور رحم دل دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے لیے حکومت سے معاندانہ طرزِ فکر مستقل طور پر برقرار رکھنا بھی مشکل تھا۔ کچھ جدید مورخوں کی چشتی صوفیاء کو عوام کے نمائندے یا ترجمان کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش، جب کہ حکمراں طبقہ کو اس کی ماہیت کے اعتبار سے ہی استحصال کرنے والا طبقہ سمجھا جائے، اور اس سے تعلق یا رشتہ رکھنے کا مطلب صرف استحصال کرنے والوں کا ساتھ دینا مانا جائے، یہ خیال بھی اس صورتِ حال کا ایک غلط تصور پیش کرنے کے مترادف ہوگا۔ یقیناً چشتی صوفیا نے عوام سے ایک قریبی رشتہ قائم رکھنے کی کوشش کی لیکن انھیں ایک سرکاری عالم دین سے زیادہ عوام کا نمائندہ سمجھنا بھی غلط ہوگا۔ وسطِ ایشیا کے برخلاف جہاں بہت سے صوفی مختلف پیشوں سے تعلق رکھتے تھے جیسے عطار (عطر فروش)، حلاج (دُھنیا) قصاب (قصائی)، حدّاد (لوہار) وغیرہ، ہندوستان میں زیادہ تر صوفی حضرات مذہبی طبقے سے آئے تھے۔ شاید نصیر الدین چراغ دہلی ایک واحد استثناء تھے جن کے والد پشمینہ کی شالوں کا کاروبار کرتے تھے ۔ ۔ ۔ کر عطیات کو مسترد کر کے چشتی حضرات 'فتوح' یا بے

طالب عطیات پر انحصار رکھتے تھے۔ اس کے لیے اہم ترین ذریعہ یا ماخذ یقیناً طبقۂ امراء تھا جس میں تاجروں کے عطیات بھی شامل ہو جاتے تھے۔ موخرالذکر یعنی تاجر ایک اہم ذریعہ تھے اور زیادہ تر خانقاہیں خاص طور پر اہم تجارتی شاہراہوں کے کنارے پر قائم کی گئی تھیں۔ بہر حال ان دونوں میں سے کوئی طبقہ بھی انھیں 'فتوح' کے عطیات نہ دیتا اگر اس دور کے حکمراں کا انداز ان کے مخالف یا معاندانہ ہوتا۔ عام طور پر حکمراں صوفیوں کا خیر مقدم ہی کرتے تھے کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ ان کی برکت اور عوام میں ان کی مقبولیت اور قربت صرف ان (حکمرانوں) کی عزت ووقار میں ہی اضافہ کا باعث نہیں ہوگی بلکہ اُن کی حاکمانہ حیثیت کے لیے ایک جواز بھی فراہم کرے گی۔ پھر صوفیا سماجی میل ملاپ اور قربت کا بھی ایک ذریعہ تھے اور سماجی تناؤ اور بے چینی کے جذبات اور جوش و خروش کو کم کرتے رہنے کے لیے ایک آلۂ کار کا کام بھی دیتے تھے۔

بہر طور چشتی صوفیا بھی، جیسا کہ بعض موقعوں پر ظاہر کیا جاتا ہے، سرکاری خدمات اور خود حکومت کے اتنے مخالف بھی نہیں تھے۔ سرکاری خدمات یا حکمرانوں سے تعلق رکھنے پر مکمل پابندی صرف اُن شاگردوں یا مریدوں پر عائد ہوتی تھی جنھیں کوئی روحانی امتیاز عطا کیا جاتا تھا یا جنھیں دوسروں کی روحانی ہدایت کا فرض سونپا جاتا تھا۔ عام مریدوں پر سرکاری ملازمت کے سلسلے میں اتنی سخت پابندی نہیں تھی۔ شیخ نصیرالدین چراغ دہلی کہتے تھے کہ ضروری نہیں کہ سرکاری ملازمت کسی کے گیان دھیان اور روحانی نشوونما میں رکاوٹ بنے۔ چشتی صوفیاء جس چیز پر سب سے زیادہ زور دینا چاہتے تھے وہ محنت مزدوری تھی اور جیسا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں وہ حرفوں اور زراعت کو ترجیح دیتے تھے۔

چشتی صوفیاء جو کیفیت پیدا کرنا چاہتے تھے اُس میں حکومت اور حکمراں طبقے سے ایک خاص حد تک دوری رکھتے ہوئے خود حکومت کو زیادہ انسان دوست انداز میں کام کرنے کے لیے تیار کرنا مقصود تھا۔ ان دونوں صورتوں میں کوئی بنیادی تضاد نہیں ہے صرف طریقۂ کار کا فرق ہے۔ روحانیت کی راہ پر سکون سے گامزن رہنے کے لیے حکومت کے کاموں کا صحیح ڈھنگ سے چلتے رہنا ضروری تھا۔ ادھر عام لوگوں میں بھائی چارہ اور محبت پیدا کرنے کے سلسلے میں صوفیوں کی کوششوں سے خود حکومت اور مسلم معاشرے کے گٹھاؤ اور استحکام میں مدد ملتی تھی۔

چشتیوں کی مختلف عقیدوں اور مذہبوں کے درمیان رواداری اور میل جول بڑھانے کی کوشش، اپنی خانقاہوں کے دروازے بلا تفریق مذہب وعقیدہ ہر شخص کے لیے کھلے رکھنے، سب کے ساتھ رحم دلی اور نیکی کا سلوک، ہندو اور جین یوگیوں سے متواتر تعلق، اپنی گفتگو، نصیحتوں اور موسیقی کی محفلوں میں ہندوی زبان کا استعمال وغیرہ ان تمام چیزوں نے ایک ایسا مناسب ماحول پیدا کر دیا جس میں ان دو اہم فرقوں ہندوؤں اور مسلمانوں میں سماجی تحمل یا لین دین بڑھ سکا۔ اس رویے نے ترکوں کے کرخت انداز کے اثرات، اور کچھ ترک جنگجوؤں نے اسلام کا جو رُخ پیش کیا تھا اس کے منفی اثرات کو کم کرنے میں بھی کسی قدر مدد کی۔ مگر اس بات پر یقین کر لینا بھی مبالغہ ہوگا، جیسا کہ کچھ نئے مورخ یقین دلانا چاہتے ہیں، کہ صوفیاء ہندوستانی معاشرے میں ایک سماجی اور ثقافتی انقلاب لانے کا ذریعہ بنے۔ اس قسم کے انقلاب کے لیے سماج کی بنیادی ساخت میں ایک تبدیلی آنی ضروری تھی جو اُن حالات میں لگ بھگ ناممکن تھی۔ یہ تبدیلی کم سے کم یہ صوفیاء تو پیدا کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ملک کے مختلف حصوں میں مقیم اور مختلف علاقوں میں گشت لگانے والے صوفی حضرات دونوں اپنے ایک مخصوص نظام کی پابندی کرتے۔ تھے جو کبھی آزاد اور کشادگی لیے ہوتا تھا اور کبھی راسخ العقیدہ کا اظہار کرتا تھا اور کبھی ان دونوں رخوں کا مجموعہ۔ ان کیفیات کے مطالعے کی ضرورت ہے اور ان سے مجموعی قسم کے فیصلے صادر نہیں کرنے چاہئیں۔ پھر بھی یہ بات کہنے میں ہم سچائی سے بہت دور نہیں ہوں گے کہ یہ صوفی، کچھ استثنائی مخصوص صورتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے، تنگ نظری کے بجائے عام طور پر کشادہ قلبی کی راہ پر گامزن رہے۔

صوفی طرزِ فکر کے کچھ منفی اثرات کو یکسر نظر انداز کر دینا بھی صحیح نہیں ہوگا۔ صوفیوں کو مبالغہ آمیز تقدس اور احترام دینے کی روایت سے بہت سے معتقدین شخصیت پرستی کی حد پر پہنچ گئے خصوصاً جب کسی صوفی کے انتقال کے بعد اس کے مزار کی لگ بھگ پرستش شروع ہو جاتی تھی۔ کسی صوفی کی ان خواہشات یا فرمائشوں کو پورا کرنے میں، جن کے اسرار سے عام لوگ واقف نہیں ہوتے، ایک چاپلوسی اور تصنع کا ماحول پیدا ہو جاتا تھا اسی لیے گھومنے پھرنے والے، قلندر قسم کے صوفی، خانقاہوں کے شدید مخالف تھے۔

بہت زیادہ کتابی علم حاصل کرنے کی مخالفت کے ساتھ صوفی حضرات فلسفے یعنی عقل یا

معقولیت پسندی کے بھی خلاف تھے۔ راسخ العقیدہ علماء اور صوفی دونوں فلسفوں کے زُمرے میں قدرتی سائنس کے ماہرین کو بھی شامل کرتے تھے۔ نظام الدین اولیا کے سوانح نگار کے مطابق، انھوں نے ایک کہانی سنائی کہ کس طرح ایک فلسفی بہت سی کتابیں لیے ایک خلیفہ کے پاس پہنچا اور اُسے بتایا کہ کائنات میں حرکت یا جنبش تین قسم کی ہوتی ہے قدرتی، خود اختیاری اور غیر اختیاری۔ اگر ایک پتھر ہوا میں اچھالا جائے تو وہ لازمی طور پر زمین پر گرے گا، یہ قدرتی حرکت ہے۔ مگر انسان اپنے ارادہ اور اختیار سے حرکت میں آتے ہیں۔ غیر اختیاری حرکت انسان کے قابو سے باہر ہے۔ اس دلیل کی بنیاد پر آسمانوں کی حرکت غیر اختیاری ہے۔ اس پر شیخ شہاب الدین سہروردی اس کی تردید کرنے فوراً خلیفہ کے پاس پہنچے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ کائنات میں غیر اختیاری جنبش اللہ کے حکم سے فرشتوں کے معجزاتی عمل سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے مابعد الطبیعاتی یعنی اپنی کرامت سے فرشتوں کو کائنات کو حرکت میں لاتے دکھادیا۔

فی الحقیقت صوفیوں کے اثر سے معجزات اور کرامتوں کا ماحول اور سائنس دانوں کے بارے میں شکوک و شبہات بڑھے۔ ان نامساعد حالات میں ہی وسط اور مغربی ایشیا اور ہندوستان میں فلسفے اور سائنس کی اُٹھان ہوئی تھی۔

(ب) بھکتی تحریک: ابتدا

بھکتی تحریک انسان میں باطنی طور پر خدا کو پہچاننے یا عرفان پر زور دیتی تھی۔ اس کے مطابق خدا کا سچا متلاشی یا بھکت محبت بھری تپسیا اور خدا کی نظر کرم (پرشاد) کی بنیاد پر، خود اُس عظیم ذاتِ واحد میں سما جاتا ہے۔ یہ تحریک، خود اسلام میں تصوف کی ابتدا اور اس کی ہندوستان میں آمد سے کافی پہلے سے یہاں موجود تھی۔ بھکتی کی بنیاد حقیقت میں خود ویدوں میں ہی دیکھی جاسکتی ہے جہاں کچھ اشلوکوں میں اُس ذاتِ عالی کی کچھ چیزوں پر صرف حیرت یا اپنی کم فہمی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ صرف باطنی ادراک سے ان کا عرفان حاصل کرنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایسے جذبات و محسوسات اپنشدوں میں بھی ملتے ہیں۔

ویدوں کے بعد کے دور میں جیسے جیسے برہم، وشنو، مہیش کی 'ذاتی بھگوان' کے روپ میں پوجا بڑھی، بھکتی یا ان سے ذاتی یا انفرادی لگاؤ کا تصور بھی بڑھا۔ اس طرح ہمیں 'بھاگوت' تحریک

میں بھی بھکتی کے اثرات نظر آتے ہیں جو موریا عہد کے بعد کے دور میں واسودیوا (جو بعد میں کرشن سے مربوط ہوئے) کی طرف رجوع کرتی تھی اور یہی 'پشوپت' مکتبِ فکر میں نظر آیا جو شیو کے پجاری تھے۔ منکسر مزاج (اواکو کیتا) بدھ جنھوں نے انسانوں کو اُن کے دُکھ درد میں مدد پہنچانے کی خاطر نروان تک کو ٹھکرادیا تھا اُن کی پوجا بھی اسی زمانے میں شروع ہوئی۔ رامائن اور مہابھارت کے آخری روپ میں، جس کا اہم حصہ بھگوت گیتا پر مشتمل ہے بھکتی کو بھی گیان، اور کرم کے ساتھ نجات حاصل کرنے کا ایک راستہ تسلیم کیا گیا ہے۔

اس موقعے پر بھکتی کے دو رُخوں کی وضاحت اور ان میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔ ایک تپسیا اور ریاضت کا طریقہ تھا جس کی بنیاد بھگوان کی عبادت پر تھی جس میں بھکت خود کو پوری طرح خدا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا تھا۔ یہ خود سپردگی یا پراپتی کا راستہ تھا۔ اس سلسلے میں یہ بھی دلیل دی گئی کہ لفظ بھکت بھائی لفظ سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے حصہ رسد تقسیم کرنا اور لفظی معنی ہیں وہ جو کسی حصے کا مالک ہو، بھکت کا لفظ بنیادی طور پر اس ملازم یا گھریلو خادم کے لیے استعمال ہوتا تھا جو اپنے مالک کے مال و دولت میں شریک ہوتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے مطلب میں تبدیلی آئی اور یہ کسی ایسے معتقد کے لیے استعمال ہونے لگا جو 'داس بھاؤ' یا خدمت کا جذبہ دل میں رکھتا ہو۔ بہر حال پراپتی کا مسلک بڑا سیدھا سادا تھا اور اسے غلام، ملازم اور بالکل نچلے طبقے کے لوگ بھی اپنا سکتے تھے چونکہ نہ اس میں کسی کتابی علم کی ضرورت تھی نہ کسی خاص تیاری کی۔

بھکتی کا دوسرا رُخ ایک عہد کی صورت میں ہوتا تھا جس کی بنیاد خالص محبت پر ہوتی تھی۔ یہ خدمت یا تپسیا کی بجائے برابری یا مساوات کے تصور پر مبنی تھا۔ اس کا مقصد بھی نجات حاصل کر لینے کی بجائے مقدس ذات میں شامل ہو جانا تھا۔ اس کی مثال پرہلاد کی روایت میں ملتی ہے جو وشنو پران میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں پرہلاد دعا کرتا ہے کہ اسے ایسی ہی اٹل لگن اور بھگوان سے لگاؤ نصیب ہو کہ وہ جہاں بھی پیدا ہو اُس میں کمی نہ آئے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ عہد روحانی لگن کی بجائے جسمانی یا نفسانی محبت میں بدلتا چلا گیا جیسی کسی محبوبہ سے عاشق کو ہوتی ہے۔ اس کے لیے جو مثال پیش کی گئی وہ رادھا اور گوپیوں سے کرشن کے رشتے کی تھی۔ یہ سب سے پہلے بھگوت پران میں بیان کی گئی تھی جو عام طور پر نویں صدی کی تخلیق مانی جاتی ہے۔

بھکتی کے اس موخرالذکر رخ، شیو اور وشنو سے محبت میں ڈوب جانے کے روپ پر سنتوں کے ایک خاصے طویل سلسلے نے زور دیا جو جنوبی ہندوستان میں چھٹی صدی کے آخری حصے سے دسویں صدی کے درمیان پھیلا ہوا تھا۔ پلّاوا حکمرانوں کے تحت تامل علاقوں سے شروع ہو کر بھکتی جنوبی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیل گئی جس میں جنوبی تامل علاقوں کی پانڈیا حکومت اور کیرالہ کی چیرا حکومت بھی شامل تھیں۔ اس تحریک میں کچھ نئی خصوصیات بھی تھیں۔ اس کی تبلیغ اور اسے دور نزدیک پہنچانے کا کام بہت سے ایسے سنتوں نے انجام دیا جو عوام میں بہت مقبول تھے۔ انھیں اڈیار یا نینار جو شیو بھکت تھے۔ اور الوار - جو وِشنو بھکت تھے۔ کہا جاتا تھا، ان میں ہمیں صرف برہمن ہی نہیں بلکہ بہت سے نیچی ذاتوں کے سنت بھی نظر آجاتے ہیں۔ ان میں ایک عورت اِنڈال بھی تھی جس کا کہنا تھا کہ بھگوان سے محبت کرنے والے کا رشتہ بھگوان سے ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ پتی ورتا بیوی کا اپنے شوہر سے ہوتا ہے۔ سنتوں کے بہت سی مختلف ذاتوں سے تعلق رکھنے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا عقید تمندانہ محبت کا پیغام کسی ایک طبقے یا فرقے کے لیے نہیں تھا بلکہ اِسے ہر طبقے کے لوگ اپنا سکتے تھے خواہ وہ کسی ذات، خاندان یا صنف سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس حد تک یہ تحریک بہر طور ترقی پسندانہ یا جدید تھی کہ یہ ذات پات کے فرق کو نظرانداز کرتی تھی۔

نیناروں اور الواروں کا خصوصی حملہ یا مخالفت بدھ مت یا جین مت سے تھی جو اس دور میں یہاں چھائے ہوئے تھے۔ یہ سنت لوگوں کو اپنی طرف اس لیے مائل یا شامل کر پائے کہ اس عرصے تک پہنچتے پہنچتے بدھ اور جین مت سخت اور تنگ نظر ہو گئے تھے اور ان میں بے معنی قسم کی عبادت کے طریقے اور پابندیاں سرایت کر گئی تھیں اور اس حد تک سادہ، بلکہ تکلیف دہ زندگی پر زور دیا جانے لگا تھا کہ جس سے جسم کو اذیت پہنچے۔ وہ اب عام لوگوں کی جذباتی ضروریات یا آرزووں کو پورا نہیں کر رہے تھے۔ نیناروں اور الواروں نے ایک سیدھے سادے عقیدے کو عام لوگوں کی زبان، تامل، میں پیش کیا اور اس میں عوامی تصورات، روایتوں اور قصوں کہانیوں کو شامل کیا۔ اس طرح وہ ایک مضبوط جذبات کشش یا اپیل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

بہت سے علاقائی حکمرانوں کی حمایت سے یہ تحریک اور تیزی سے آگے بڑھی۔ شروع

میں اس کی حمایت پلوحکمرانوں نے کی۔ حکمرانوں کے رویے میں تبدیلی کی وجہ عام طور پر یہ دی جاتی تھی کہ کوئی حکمراں کسی ایسے مقبول اور ممتاز قسم کے سنت سے متاثر ہو جاتا تھا جس کے تقدس کا شہرہ، معجزے اور کرامات دکھانے کی صلاحیت عام لوگوں میں پھیل چکی ہوتی تھی اور جو جینیوں اور بدھ رہنماؤں کے لیے خفت کا باعث ہوتی تھی۔ ایسے سنت سے مرعوب ہو کر حکمراں اپنا رویہ بدل لیتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی بڑا وزیر یا ملکہ کھلے طور پر اثرانداز ہو جاتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان تمام اسباب نے اپنا اپنا کردار ضرور ادا کیا ہوگا مگر حکمرانوں کے سامنے اپنے مخصوص سیاسی اسباب اور ضرورتیں بھی ہوتی ہوں گی۔ انھیں کسی مقبول عام تحریک کی حمایت کرنے سے خود اپنے لیے جواز حاصل کر لینے کی امید بھی ہوتی ہوگی۔ اس کو ان مندروں کے بڑی تعداد میں وجود میں آنے سے بھی تقویت ملی جو سماج کو مستحکم کرنے، زراعت کی توسیع، یہاں تک کہ تجارت میں شریک ہو کر معاشرے میں ایک اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ شاہی تحفے تحائف کی مدد سے مندروں کو اور مضبوط کیا گیا، ان بخششوں میں زمین کے عطیات بھی شامل تھے۔ دوسری طرف حکمرانوں کو برہمنوں سے تقویت اور استحکام ملا جو اُن کی حیثیت کو جائز قرار دے کر اُن کے اقتدار کو اور مضبوط کر رہے تھے۔ بہر طور زیرِ نظر مسئلے میں بھی شاہی حمایت کو موقع بموقع جینیوں اور بودھوں کو کچلنے میں استعمال کیا گیا۔ چنانچہ پلوّ بادشاہ مہندر ورمانے جینیوں کو اپنے دربار سے نکال دینے کے بعد اُن کی خانقاہ کو تباہ کیا۔ ایک اور حکمراں نیدورمن کئی ہزار جینیوں کے جسم میں میخیں ٹھکوا کر انھیں ہلاک کرنے کے لیے مشہور ہے۔

عقلی سطح پر، بدھ تصورات اور عقائد پر، سنکرا کی طرف سے آخری فیصلہ کن وار ہوا۔ سنکرا کو آٹھویں صدی کے آخر اور نویں صدی کے ابتدائی دور میں مانا جاتا ہے۔ سنکرا نے ویدانت کے اصولوں کو منظم کیا۔ وہ غیر دوئی (اُدویتا) کے فلسفے کا زبردست مبلغ تھا۔ اس کے خیال کے مطابق خدا اور ظاہری دنیا کو جہالت یا کم علمی کی وجہ سے الگ الگ سمجھا جاتا ہے اور نجات کا راستہ یہ بات پوری سمجھ لینے یا اس واقفیت (گیان) سے حاصل ہوتا ہے کہ خدا اور اس کی پیدا کی ہوئی دنیا ایک ہی ہیں۔ اُس نے بدھ تصورات کو مسمار کرنے اور اس بات کو پوری طرح ثابت کرنے کے لیے کہ وید علم کا سرچشمہ ہیں منطقی مناظرہ کا استعمال کیا۔

بدھ اور جین متوں پر فتح پانے کے بعد جنوبی ہندوستان میں بھکتی تحریک رفتہ رفتہ اپنی کشادگی اور ترقی پسندانہ آزاد روی کو فراموش کرتی چلی گئی جبکہ سنت عام طور پر ذات پات کے بندھنوں کو نظرانداز کردیتے تھے، مگر انھوں نے ذات پات کے پورے نظام کو کبھی چنوتی نہیں دی اور برہمنوں کی اعلیٰ حیثیت پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ مندروں میں، جو اس دور میں بڑی تیزی سے پھل پھول رہے تھے، دیوتا کے ساتھ جیتے جاگتے بادشاہ کا سا سلوک کیا جاتا تھا اور اس کی حیثیت کو ذہنوں پر پختگی سے جمانے کے لیے ظاہری رکھ رکھاؤ اور تقریب جیسے عملوں کا ایک پورا نظام تیار کیا گیا تھا۔ ان تقریبات کی نگرانی بلکہ صدارت برہمن کرتے تھے جو اب ذات پات کی روایتی بندشوں کی پوری پابندی کرتے تھے۔ اس صورتِ حال میں کچھ تبدیلی لانے کی کوشش رامانجا نے کی جو گیارھویں صدی میں بتائے جاتے ہیں۔ رامانجا کہتے تھے کہ نجات کے لیے خدا کا رحم و کرم اس کے بارے میں واقفیت سے زیادہ اہم ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ بھکتی کی راہیں ذات پات کی تفریق کے بغیر سب کے لیے کھلی ہیں، چنانچہ انھوں نے تمام ذاتوں کے لوگوں کو اپنا چیلا بھی بنایا۔ نیناروں اور الواروں کے برخلاف، جو کتابی علم پر یقین نہیں رکھتے تھے، رامانجا نے بھکتی کو ویدوں کی روایت سے جوڑنے کی کوشش کی۔

اس طرح رامانجا کو مقبولِ عام بھکتی تحریک اور خدا کی مکمل اطاعت اور خود سپردگی (پراپتی) اور ویدوں پر مبنی اعلیٰ ذاتوں کو تحریک کے درمیان ایک پل کہا جاسکتا ہے۔ اس طرح سنکرا کی بجائے رامانجا کو وہ شخصیت مانا جائے گا جو اُس تحریک کی روحِ رواں یار ہنما تھی جس نے عام مذہب، خدا کے لیے لوگوں کے رویے، اور انسانوں سے خدا کے رشتوں کے سلسلے میں اہم تبدیلیاں پیدا کیں۔ انھوں نے اصل میں وہ میدان ہموار کیا جس کے نتیجے میں نئے دور کی چنوتیوں کا مقابلہ ممکن ہو سکا۔

اس موقعے پر صرف ایک اور ترقی پسند اور بنیادی اہمیت کی تحریک جس کی نمائندگی ویر شیوا یا لنگایت کرتے ہیں آج کے کرناٹکا کے شمالی حصوں میں بارھویں صدی میں ابھری تھی۔ ایک پرانا فرقہ لنگایت جسے چالوکیہ حکمرانوں کے برہمن بساوا نے دوبارہ متحرک کیا یہ لوگ شیو کے پجاری تھے اور خدا سے محبت پر زیادہ زور دیتے تھے اور انسانی زندگی کے مقاصد کے حصول کے لیے

کی افواہ سن کر پنجاب میں کھوکروں نے بغاوت کر دی۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے معزالدین پھر ہندوستان آیا۔

ہمیں بتایا گیا ہے کہ معزالدین سمرقند کے کراخانیوں سے پھر مقابلہ کرنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے آکسس دریا پر کشتیوں کا ایک پل بھی بنایا گیا تھا لیکن معزالدین پنجاب سے واپسی پر دریائے سندھ کے کنارے (1206 میں) کراماتیوں کے ایک گروہ کے ہاتھوں مارا گیا۔ یہ لوگ، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ پاگل پن کی حد تک کٹر عقیدے والے لوگ تھے جنہوں نے ہندو اور بدھ مذہب کی بہت سی باتوں کو اپنا رکھا تھا اور جنہیں معزالدین ہمیشہ دبا کر رکھتا تھا۔

معزالدین محمد اور محمود غزنوی:

معزالدین محمد بن سام کا محمود غزنوی سے مقابلہ کرنے کا ایک عام رجحان رہا ہے یہ کہا جاتا رہا ہے کہ محمود غزنوی معزالدین سے بہتر جنرل تھا کیونکہ اسے کسی بھی جنگ میں شکست نہیں ہوئی۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ معزالدین اپنی شکست سے سبق لے کر سنبھل جاتا تھا اور اپنی پوری حکمت عملی کو بدل دیتا تھا۔ یہ اس بات کا مظہر ہے کہ اس میں اپنے مقصد پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنے اور سیاسی طور پر حقیقت پسند ہونے کا شعور تھا۔ اس لیے گجرات میں انہل واڑا میں اپنی شکست کے بعد اس نے ہندوستان کی طرف اپنا پورا رویہ بدل دیا اور راجستھان کے بدلے پنجاب کی طرف اپنے حملے کا رُخ موڑ دیا۔ جس رفتار اور مہارت کے ساتھ وہ پرتھوی راج کے ہاتھوں ترائن کی پہلی لڑائی میں شکست کے بعد اُبھرا تھا وہ اس کی دلیری اور سخت جانی کی مظہر ہے۔

محمود غزنوی اور معزالدین دونوں نے ہی مذہب کا استعمال اپنے غیر مذہبی مقاصد کے لیے کیا۔ دونوں ہی کے لیے وسطی اور مغربی ایشیا میں اپنے منصوبوں کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان سے جمع کی ہوئی دولت ضروری تھی۔ بہر حال یہ سمجھنا بھی غلط ہوگا کہ محمود محض ایک لٹیرا اور ہندوستان میں تباہی مچانے والا تھا۔ یہ وہی تھا جس نے افغانستان کے ہندو شاہیوں کو نکال کر ہندوستان کے سرحدی تحفظ کا خاتمہ کر ڈالا تھا اور پنجاب کو فتح کر کے مستقبل میں ترکوں کے ہندوستان میں پھیلاؤ کے لیے ایک مضبوط اڈا مہیا کر دیا تھا۔ یوں محمود کی مہیا کردہ بنیاد پر ہی معزالدین نے حکومت کھڑی کی تھی اس کے باوجود دونوں نے اپنا اپنا کام بالکل مخالف حالات میں

بھگتی کو سب سے اہم مانتے تھے۔ یہ لوگ اپنے گرو کو بھی سب سے اہم مانتے تھے اور برت' دعوتوں اور یاتراؤں کو مسترد کرتے تھے۔ یہ بدھ اور جین مذہبوں کے سخت مخالف تھے اور ساتھ ہی برہموں اور ان سے ملحق تمام قدروں' روایات اور اداروں کے بھی مخالف تھے۔ یہ انسانی مساوات کو عظیم مانتے تھے اور ذات پات کے نظام کو مسترد کرتے تھے۔ جو بھی اس حلقے میں شامل ہوتا تھا اُسے ساتھ بیٹھ کر کھانا ہوتا تھا، آپس میں شادی کرنی ہوتی تھی، اور مل جل کر رہنا ہوتا تھا۔ یہ کم عمری کی شادی کے بھی خلاف تھے، طلاق کی اجازت دیتے تھے، بیواؤں کا احترام کیا جاتا تھا اور انھیں دوسری شادی کی بھی اجازت تھی۔

شمالی ہندوستان میں بھگتی تحریک کی مقبولیت:

حالانکہ بھگتی کے جذبات اور تصورات ابتدائی دور میں شمالی ہندوستان میں ہی ابھرے تھے مگر جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس کی عوامی شکل جنوبی ہندوستان میں ہی میں بنی۔ بھگتی تحریک کا عوامی روپ جو شمالی ہندوستان میں چودھویں اور پندھویں صدی سے شروع ہوا اسے کبھی کبھی جنوبی ہند کی بھگتی تحریک کی شاخ بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان میں ثقافتی تمثل یا کلچرل لین دین ایک متواتر جاری رہنے والا عمل تھا جو خود ہندوؤں کے درمیان اور بدھ اور جین دونوں کے درمیان متواتر چلتا رہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نویں صدی میں سنکرانے شمال کا سفر بھی کیا تھا تاکہ ان دو خطوں کے درمیان عالمانہ گفتگو کی جائے' جو روایات کے مطابق اس لیے ضروری تھی کہ شمال اور جنوب کے درمیان عقیدوں یا خیالات کا ایک باقاعدہ نظام مرتب کیا جاسکے۔ مگر اس سلسلے میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس قدر مضبوط راویت اور اس حقیقت کے باوجود کہ بھگتی کی ابتدا شمالی ہندوستان میں ہی ہوئی تھی' بھگتی شمالی ہندوستان میں ایک عوامی سطح کا تخیل' پندرھویں صدی تک نہ بن سکی۔ پانچ سو سال سے زیادہ عرصے کے اس خلا یا تاخیر کی وجوہات صرف ان دو علاقوں میں اس وقت موجود سماجی' سیاسی اور ثقافتی حالات میں ہی نظر آتی ہیں۔ جنوبی ہندوستان میں بھگتی تحریک بدھ اور جین مت کی بے لچک پابندیوں اور سختیوں کے ردِ عمل کے طور پر شروع ہوئی۔ شمالی ہندوستان میں بدھ اور جینیوں کو بہت پہلے ہی ان کی ممتاز حیثیت سے پیچھے دھکیلا جا چکا تھا۔ گپتا حکمراں ہندو دھرم کے بڑے مضبوط حامی اور آگے بڑھانے والے تھے۔ ہرش' گو کہ شو کا ماننے والا تھا' مگر اس نے

بدھوں کے خلاف تعصب نہیں برتا' پھر بھی بدھ مت میں تنزل برقرار رہا۔ ہرش کے بعد کے دور میں بہت سی ریاستیں ابھریں جنہیں راجپوت ریاستوں کا نام دیا جاتا ہے۔ راجپوتوں کی ابتدا یا بنیاد کے بارے میں اختلاف رائے رہا ہے' لیکن اتنی بات پر ضرور اتفاق ہے کہ یہ ہندو سماج کے مختلف حصوں سے تعلق رکھتے تھے۔ کچھ برہمن اور دوسری ذاتوں سے اور کچھ الگ الگ قبیلوں سے، جو مختلف علاقوں یا پٹیوں پر راج کرتے تھے اور ان میں سے کچھ ٹکڑے غیر ملکی بھی تھے۔ بنیادی طور پر لفظ 'راجپوت' کے معنی 'گھوڑوں کے تاجر' کے ہیں۔ لیکن جیسے ان کی کچھ ٹکڑیوں نے زمینوں قبضہ کر کے رفتہ رفتہ سیاسی اقتدار حاصل کیا اور ان کے پیروکار جنگجو ہونے لگے، برہمنوں نے انہیں کھتریوں کا درجہ دینا شروع کر دیا۔ اس کے بدلے میں برہمنوں کو زمین کی بڑی بڑی جاگیریں اور مندروں کی تعمیر اور دیکھ ریکھ کے لیے بڑی رقمیں عطا ہوئیں۔ انہیں حکومت میں بڑے بڑے عہدے، جیسے 'راج پروہت' اور مذہبی اور عوامی زندگی کے معاملات کے 'مشیر وغیرہ' کے ملے۔ بعض موقعوں پر انہیں سفیروں کی حیثیت سے بھی دوسری حکومتوں میں بھیجا گیا۔ ان کی زمینوں پر لگان بھی رعایتی دروں پر لگایا جاتا تھا۔ اور یہ وہ روایت تھی جو بعض راجپوت ریاستوں میں آزادی کے بعد ان ریاستوں کے 'ہندیونین' میں ضم ہوتے وقت تک بدستور باقی تھی۔ بہر حال ترکوں کی ہندستان میں آمد تک راجپوتوں اور برہمنوں کے درمیان بھی علاقائی گٹھ جوڑ پورے سماج اور شمالی ہندستان کے ثقافتی منظرنامے پر چھایا ہوا تھا۔ مندروں کی برابر بڑھتی ہوئی تعداد اور ان کی دولت فی الحقیقت برہمنوں کی خوشحالی اور راجپوت سیاست میں ان کی ممتاز حیثیت اور اقتدار کا پیمانہ تھی۔

اس راجپوت، برہمن گٹھ جوڑ کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ راجپوت حکمراں اس چار ورنوں کے نظام کے ممتاز محافظ بن کر اُبھرے، جو برہمنوں کو ملی ہوئی اعلا حیثیت اور مراعات، اور سماج میں ایک مضبوط درجہ واری تقسیم، کو جائز قرار دیتا تھا۔ کوئی بھی مسلک یا فلسفیانہ طرزِ فکر جو اس سماجی درجہ واری تقسیم یا برہمنوں کو حاصل مراعات اور حیثیت کو للکارتا تھا یا تنقید کرتا تھا، اسے صرف اس مضبوط برہمن طبقے کی ہی مخالفت نہیں برداشت کرنی ہوتی تھی جس کی سیاسی بنیادیں بہت گہری اور مضبوط تھیں بلکہ اسے اس وقت کے سیاسی اقتدار کی مخالفت اور دباؤ کا بھی مقابلہ کرنا ہوتا تھا۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ بات بہ آسانی واضح ہو جاتی ہے کہ شمالی ہندستان میں، بھکتی

تحریک کی ابتدائی جنبشوں اور تصورات کے ابھرنے کے باوجود اس میں وسعت کیوں نہ پیدا ہو سکی۔ پھر بھی سنسکرت میں بھکتی کے تصورات پر تحریری کام ہوتا رہا۔ بالکل عوامی اور نچلی سطح پر بھی اس دور میں کچھ ایسی تحریکوں کو ابھرتے ہوئے بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے جو کسی قدر آزاد خیال، غیر مقلدانہ یا روایتی فکر کے مخالف تھیں۔ ان میں تانترک اور 'ناتھ پنتھی' تحریکیں بھی شامل تھیں۔ 'تانترک سدھا' عام طور پر نچلی ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے اور ذات پات یا صنف (مرد عورت) کی تفریق کیے بغیر کوئی بھی اس مسلک میں شامل ہو سکتا تھا۔ یہ لوگ مونث دیویوں کی پوجا میں عقیدہ رکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ کچھ مخصوص طریقے جن میں تپسیا اور تیاگ بھی شامل تھے، اپنا کر جادوئی طاقت حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ سماجی نابرابری کے نظام کے سخت مخالف تھے اور برہموں کے عاید کردہ زندگی کے رسم ورواج اور پابندیوں اور مذہبی رسوم کو بالکل نہیں مانتے تھے۔ اس وقت موجود سماجی نظام کی مخالفت کے اظہار کے لیے ان میں سے کچھ لوگ ممنوعہ کھانے پینے کی چیزیں بھی کھاتے تھے اور کچھ علم وعرفان کے اعلا درجے تک پہنچنے کے لیے آزادانہ عشق ومحبت تک کی وکالت کرتے تھے۔ برہموں سے مخالفت اور سیاسی دباؤ کے خوف کی وجہ سے ان میں سے کچھ لوگ گھما پھرا کر اور مبہم سے انداز میں بات کہتے تھے جنھیں صرف ان کے رازوں کے جاننے والے ہی سمجھ سکتے تھے۔ حالانکہ ناتھ پنتھی مسلک کے لوگ اعلا کردار کی خصوصیات کا مظاہرہ کرتے تھے مگر برہمن ان سب کو بدکردار بلکہ حکومت اور سماج کا دشمن ہی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر بھی ناتھ پنتھی سارے ہندستان میں پھیل گئے تھے اور اپنے صدر مقام پیشاور سے پورے مغربی اور وسط ایشیا میں پہنچ چکے تھے۔

ترکوں کی آمد اور بہت سے راجپوت راجاؤں کی شکست، مندروں کی تباہی اور بربادی اور بہت سے ایسے دیوی دیوتاؤں کو پیروں تلے روندے جانے سے جنھیں برہمن صرف بھگوان کی علامت یا روپ ہی نہیں خود بھگوان کہا کرتے تھے، اور ان کی اسی انداز میں سیوا کرتے تھے، ان تمام چیزوں سے صرف برہمن راجپوت گٹھ جوڑ کو ہی زبردست دھکا نہیں لگا بلکہ خود برہموں کی اعلا حیثیت واقتدار کو بھی خاصا نقصان پہنچا۔ اصل میں یہی وہ نئی صورتِ حال تھی جس میں شمالی ہندستان کے بہت سے علاقوں میں عوام میں بھکتی کے تصورات پھلے پھولے۔

ایک بہت مشہور ماہر سماجیات، میکس ویبر کا کہنا ہے کہ بھکتی جیسی الہامی یا کشفی قسم کی

تحریک اصل میں شکست خوردہ حکمراں طبقے کی ذہنی کیفیت کا اظہار کرتی ہے جس میں توکل اور بہ رضا و رغبت صعوبتیں جھیلنے وغیرہ کو اہمیت دی جاتی ہے۔ بہر طور اس خیال سے اتفاق کرنا بھی مشکل ہے چونکہ اس بنیاد پر جنوبی ہندستان میں بھکتی تحریک کے ابھرنے کے اسباب کا تجزیہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شمال میں بھکتی تحریک ایک طرح کا تحفظی آلہ کار تھی جو ترک حکمرانوں کے سیاسی دباؤ اور خاص طور پر اس اسلامی طرزِ فکر کی چنوتی کے خلاف ایک قسم کا تحفظ فراہم کر رہی تھی جو بالکل سیدھا سادا لگتا تھا اور اس میں آپسی برادری اور مساوات پر زور دیا جاتا تھا۔ بہر حال، یہ خیال بھی اس دور کی مجموعی صورتِ حال پر احاطہ نہیں کرتا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ترک عہد کے ابتدائی جنگ و جدال والے دور کے بعد ہندوؤں کے سامنے تبدیلی مذہب کا کوئی فوری خطرہ بھی موجود نہیں تھا گو کہ جنگی قیدی اور عورتیں اور بچے جو جنگ کے دوران گرفتار ہوتے تھے انہیں غلام بنا کر مسلمان کر لیا جاتا تھا۔ حکمرانوں اور صوفی نظام الدین اولیا، دونوں نے یہ بات تسلیم کر لی تھی کہ ہندو مذہب دھمکیوں یا طاقت کے استعمال، ہر طرح کے حربوں کے خلاف زیادہ مضبوط ہے اور برادری اور مساوات کا وہ تصور جو اسلام پیش کر رہا تھا وہ بھی بہت زیادہ کارگر نہیں تھا۔ یوں بھی اسلام میں سماجی مساوات بہت پہلے ختم ہو چکی تھی اور ترک حکمراں ہندو نو مسلموں کو، خصوصاً کاریگر، دستکار اور نچلی ذات سے تعلق رکھنے والوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ بھکتی سنتوں کا واحد مقصد صرف ان اصلاحات کو شروع کرنا تھا جن سے انہیں اسلامی چنوتی کا مقابلہ کرنے میں مدد مل سکے۔ مگر یہ تصور بھی کچھ یک طرفہ سا لگتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ہندو اور بدھ تصورات نے صوفی تحریک کی صرف ابتدائی منزل میں اس پر اپنے اثرات چھوڑے تھے۔ ہندستان میں صوفی طرزِ فکر میں وحدت پرستی، پیر یا گرو کے کردار کی اہمیت، 'محبوبِ حقیقی' سے وصال کا تصور وغیرہ ہندو طرزِ فکر کے عناصر اور بہت سے پرانے مسلکوں سے کافی حد تک متوازی ہیں۔ اسلام کی آمد سے ان مشترکہ عناصر کو ہندو طرزِ فکر میں بھی ایک نئی تقویت حاصل ہوئی۔

اس طرح بھگتی تحریک مشترکہ نشو ونما کے ایک ایسے رخ کی مظہر ہے جس میں مختلف النوع طرز فکر میں ملتے جلتے تصورات کو ابھارا گیا۔ یہ رخ اس تصور سے زیادہ اہم ہے کہ کس طرز فکر نے دوسرے سے کیا حاصل کیا۔ جس میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ شمالی حصے میں شاید جس جگہ اس تحریک کی ابتدائی جنبش نظر آتی ہے وہ مہاراشٹر کا علاقہ تھا۔ سنت جنیشور (بارہویں صدی) نے گیتا کی ایک تفسیر لکھی جس میں 'گیان' 'کرم' اور بھگتی کو یکساں اہمیت دی گئی تھی۔ ایک اور اہم قدم یہ تھا کہ انہوں نے سنسکرت کی بجائے عوامی زبان 'مراٹھی' میں لکھا۔ جنیشور کے جانشین نام دیو (چودہویں صدی) تھے جن کی شاعری میں بھگوان (خدا) سے گہری محبت اور خود سپردگی کی سب سے زیادہ گونج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نام دیو نے دور دراز کے سفر بھی کیے تھے اور دہلی کے صوفی حضرات سے بھی گفتگو کی تھی۔ ایک اور سنت، رامانند، جو رامانجا کے پیروکار تھے، پریاگ (الہ آباد) میں پیدا ہوئے تھے اور بنارس میں رہتے تھے، انہوں نے وشنو کے اوتار کے روپ میں رام کی پرستش کا پرچار کیا۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اصولوں کی چاروں ورنوں میں تبلیغ کی اور مختلف ذاتوں کے آپس میں ملنے جلنے اور ساتھ ساتھ کھانے پرپابندی کو بالکل نظرانداز کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تمام ذاتوں کے لوگوں کو اپنی شاگردی میں لیا۔ جن میں نیچی ذات کے لوگ بھی شامل تھے۔ چنانچہ ان کے شاگردوں میں روی داس، جو ذات کے اعتبار سے چمار تھے، کبیر، جولاہے، سینا، نائی اور سدھانا، قصائی سب شامل تھے۔ نام دیو بھی اپنے شاگرد بنانے کے سلسلے میں اتنے ہی فراخ دل تھے۔

عوام میں جن سنتوں نے بھگتی کے پیغام کو پہنچایا ان میں جو سنت کرامات و معجزات کے عقیدوں کے سخت ناقد تھے، مورتی پوجا اور ذات پات کے نظام کے سخت مخالف تھے اور ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد کے بھی مضبوط حامی تھے، ان میں سب سے جانے مانے نام کبیر اور نانک کے ہیں۔

کبیر کی ابتدائی زندگی اور ان کے زمانے کے تعین کے سلسلے میں بھی کافی اختلاف ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہ ایک برہمن بیوہ کے بیٹے تھے جس نے انہیں چھوڑ دیا تھا اور یہ ایک مسلم جولاہے کے گھر میں پلے بڑھے تھے۔ انہوں نے اپنے منہ بولے باپ کا پیشہ سیکھا لیکن کاشی میں رہائش کی وجہ سے ان کا تعلق ہندو سنتوں اور مسلمانی صوفیوں، دونوں سے رہا۔ ان پر ناتھ پنتھیوں کا

بھی بڑا گہرا اثر پڑا تھا۔ کبیر خدا کی وحدانیت پر بہت زور دیتے تھے اور اسے مختلف ناموں سے یاد کرتے تھے جیسے رام، ہری، گووند، اللہ، سائیں، صاحب وغیرہ وغیرہ۔ وہ مورتی پوجا کے سخت مخالف تھے اور اسی طرح مذہبی یاتراؤں یا سفروں، دریاؤں پر اشنان اور باقاعدہ اور منظم قسم کی عبادت، جیسے 'نماز' کو بھی مسترد کرتے تھے۔ وہ سنت سادھوئی زندگی کے لیے عام گھریلو زندگی کو ترک کردینا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ ناتھ پنتھیوں کی بتائی ہوئی یوگ کی ریاضتوں سے واقف تھے مگر وہ علم وعرفان کے لیے تیاگ وتپسیا اور کتابی علم کو اہم نہیں مانتے تھے۔

کبیر کے سب سے چبھتے ہوئے نشتر ان ہندو اور مسلمان مذہبی رہنماؤں کے لیے وقف تھے جو لوگوں کی خوش اعتقادی کو اپنی مقصد براری کے لیے استعمال کرتے تھے اور اپنے کتابی علم کو مذہب کی حقیقی روح سمجھے بغر عائد کرنا چاہتے تھے۔ کبیر خدا کی وحدانیت کے اپنے تصور کے واسطے سے انسانی مساوات تک پہنچے۔ اس کی بنیاد پر انہوں نے اپنے وقت کے معاشرے کی طبقہ واری تنظیم یا ڈھانچے پر اور ان لوگوں پر حملہ کیا جنہیں اپنی دولت، نسل، زمین کی ملکیت خاندان اور خانوادے وغیرہ پر گھمنڈ تھا۔ اور چونکہ حکومت اس غیر منصفانہ اور غیر مساوی سماجی ڈھانچے کی پشت پناہی کرتی تھی اس لیے کبیر سنتوں کو شاہی درباروں سے دور رہنے کا مشورہ دیتے تھے۔

خدا کی وحدانیت کے تصور اور یقین نے ہی کبیر کو اس نتیجے پر پہنچایا کہ تمام مذاہب ایک ہی منزل پر پہنچنے کے لیے مختلف راستے ہیں۔ اس طرح وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاف کو بے معنی سمجھتے تھے۔ چونکہ کبیر ان پڑھ تھے اور ان کے خیالات کا پرچار صرف زبانی ہی ہوتا تھا اور اسے بہت بعد میں قلمبند کیا گیا، اس لیے ان کے پیغام میں بہت سی کمی بیشی ہوئی، یہاں تک کہ اب یہ جاننا بھی مشکل ہے کہ اس میں سے کیا کم ہوا اور کیا بڑھایا گیا۔ کبیر کوئی سماجی مصلح نہیں تھے مگر وہ اس بات کو ضرور اہم سمجھتے تھے کہ انسانوں کے طرزِ عمل سے ہی معاشرے کی اچھی بری تشکیل ہوتی ہے۔

ہندو اور مسلم عوام پر کبیر کے خیالات کے کیا اثرات مرتب ہوئے اس سلسلے میں مختلف خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ کبیر کے باوجود دونوں مذہب اپنے مقررہ طریقہ کار اور فکر پر برقرار رہے اور نہ ذات پات کے نظام میں کوئی فرق پیدا ہوا۔ وقت گزرنے پر کبیر کے پیروکار۔ 'کبیر پنتھی'

ایک چھوٹا سا الگ مسلک بن کر رہ گئے۔ بہر حال کبیر کے مشن کو ایک وسیع زاویہ نگاہ سے دیکھا جانا چاہئے۔ انہوں نے عام خیالات اور تصورات کا ایک ماحول سا پیدا کر دیا جو کافی طویل عرصے تک بر قرار اور اثرانداز رہا جس سے کبیر کا نام انسانی مساوات کی علامت، ہندو مسلم اتحاد، ظاہر داری اور منافقت کی مخالفت کا ایک مظہر بن گیا۔

گورو نانک جن کی تعلیمات سے بعد میں سکھ مذہب اخذ کیا گیا 1469 میں راوی کے کنارے تلونڈی نام کے گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ ایک کھتری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ حالانکہ ان کی شادی ابتدائی عمر میں ہوگئی تھی اور انہیں فارسی میں اپنے باپ کے پیشے، محاسبی (اکاؤنٹنسی) کی تربیت دی گئی تھی لیکن ان کے یہاں شروع سے ہی الوہیت اور غور و فکر کا رجحان تھا اور یہ سنتوں سادھوؤں کی صحبت پسند کرتے تھے۔ کچھ عرصے بعد ان میں صوفیانہ بصیرت پیدا ہوگئی اور انہوں نے دنیاوی معاملات میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ انہوں نے حمد و ثنا کے گیت (شبد) لکھے جنہیں وہ خود گاتے تھے اور ان کا ایک بہت معتقد شاگرد مردانا رباب (ایک تاروں والے ساز) پر ان کی سنگت کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نانک نے پورے ہندستان اور بیرون ملک بہت دور دراز کے سفر کیے اور جنوب میں لنکا اور مغرب میں مکہ اور مدینہ تک گئے۔ انہوں نے بہت بڑی تعداد میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور 1538 میں اپنی موت تک ان کا نام اور شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔

کبیر کی طرح نانک بھی ایک خدا پر یقین رکھتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ پوری لگن اور محبت سے اگر انسان اس ذات کو اپنے دل میں بسالے تو بلا تفریق نسل، ذات پات یا مذہب نجات پا سکتا ہے۔ بہر طور نانک کردار کی پاکی اور صاف ستھرے رکھ رکھاؤ پر بہت زور دیتے تھے اور یہی خدا تک پہنچنے کی پہلی شرط تھی۔ وہ انسان کی ہدایت کے لیے گورو کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ کبیر کی طرح وہ بھی مورتی پوجا کو نہیں مانتے تھے اور مختلف مذہبوں میں رائج مذہبی اعمال و رسوم اور یاتراؤں وغیرہ کے بھی قائل نہیں تھے۔ وہ ایک ایسے درمیانی طریقہ حیات کی وکالت کرتے تھے جس میں گھریلو زندگی کے ساتھ روحانی زندگی بھی شامل کی جا سکتی تھی۔

نانک کا کوئی نیا مذہب قایم کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ ان کے طرز فکر میں ایک ہمہ گیریت

یا کثیر المشربی کا انداز تھا جس کا مقصد تھا ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز یا خلاء کو پُر کرنا تھا تاکہ امن وسکون، ایک دوسرے کے لیے نیک خواہشات اور آپسی سماجی لین دین کی فضا قائم ہو جائے۔ کبیر کی طرح نانک بھی انسانی مساوات، بھائی چارے اور محبت میں یقین رکھتے تھے اور ذات پات کی تفریق کو بڑی سختی سے مسترد کرتے تھے۔ وہ اپنے دور کے حکمرانوں کو لامذہب اور ظالم مانتے تھے۔ لیکن کبیر کے برخلاف وہ ایک ایسی حکومت یا ریاست کا تصور ضرور ذہن میں رکھتے تھے جس کا سربراہ اعلیٰ ایک "فلسفی بادشاہ" ہو جو اپنے عمل اور طرزِ حکومت کو اخلاقی قدروں، عدل وانصاف اور مساوات کے اصولوں پر قائم رکھے۔

آزاد منش صوفی اور 'نرگن' سادھو سنت اسلام اور ہندو مذہب دونوں میں راسخ العقیدہ عناصر کے لیے ایک چنوتی تھے۔ راسخ العقیدہ زمرے کا ردعمل مختلف تھا جو کھلی مخالفت اور دشمنی سے لے کر ایسی کیفیت تک نظر آتا تھا جس میں کچھ نکتوں پر ایک دوسرے سے اتفاق واتحاد اور خود مذہب کے کچھ پرانے اصولوں کی ایسی توضیح وتشریح کرنا بھی شامل تھا جن کے ذریعے اس چنوتی کا کامیابی سے مقابلہ کیا جا سکے۔ ان دو رجحانوں کے درمیان متواتر کشمکش رہی۔ ان میں ایک کنارے پر آزاد خیال اور غیر فرقہ وارانہ تصورات تھے اور دوسرے سرے پر روایت پرستانہ اور راسخ عقیدے کے رجحانات تھے۔ یہی کشمکش سولہویں اور سترہویں صدی اور اس کے بعد بھی بہت سی فکری تحریکوں اور مذہبی اختلافات کی تحریک رہی۔ اس متواتر کشمکش یا جدوجہد میں کبیر، نانک اور اسی نہج پر سوچنے والوں کا کردار کسی طرح غیر اہم نہیں مانا جا سکتا۔

ویشنو تحریک:

کبیر اور نانک کی غیر فرقہ وارانہ تحریکوں کے علاوہ شمالی ہندستان میں بھکتی تحریک رام اور کرشن کی پوجا کے چاروں طرف ابھری جو وشنو دیوتا کا مجسم روپ ہیں۔ کرشن کی بچپن کی شوخیاں اور گوکل کی گوالنوں، خصوصاً رادھا سے ان کی دل لگی اور راز ونیاز سنت شعراء کی شاعری کا ایک خاص موضوع بن گئے اور اسے انہوں نے کسی فردِ واحد کی روح کے کسی اعلاترین روح سے محبت کے مختلف رخوں اور رویوں کے اظہار کے سلسلے میں ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا۔ چیتنیہ ناڈیا میں پیدا ہوئے تھے جو اس وقت ویدوں کی معقولیت پسندی کا مرکز تھا۔ چیتنیہ کی زندگی کا

پورا رنگ اس وقت بدل گیا جب وہ 22 برس کی عمر میں گیا پہنچے اور وہاں ایک تارک الدنیا سنت نے انہیں کرشنا مسلک میں داخل کیا۔ ان پر اس مسلک کا نشہ سا چڑھ گیا اور وہ متواتر کرشنا کا نام جپتے رہے۔ ابتدائی دور کے صوفیوں کی طرح چیتنیہ نے موسیقی کی محفلوں کو عام کیا۔ یہ ایک خاص طرح کی موسیقی کے کیرتن ہوتے تھے جس میں سننے والا بھگوان کا نام جپتے جپتے بیرونی دنیا سے بے پرواہ ہو کر ایک مخصوص روحانی سرور حاصل کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ چیتنیہ نے پورے ہندستان کا چکر لگایا جس میں ورنداون بھی شامل تھا جہاں انہوں نے کرشنا مسلک کو پھر سے زندہ کیا۔ مگر ان کا زیادہ وقت گیا میں ہی گزرا۔ انہوں نے لوگوں کے ذہنوں پر بڑا گہرا اثر چھوڑا جس میں مشرقی ہندوستان زیادہ متاثر ہوا۔ یہاں ان کے معتقدوں کی تعداد بہت بڑھی جن میں کچھ مسلمان اور نچلی ذاتوں کے ہندو بھی شامل تھے۔ انہوں نے مذہبی کتابوں اور بت پرستی کو بالکل مسترد بھی نہیں کیا لیکن اس کے باوجود انہیں رسوم وروایت پرستوں کے زمرے میں بھی شمار نہیں کیا جاسکتا۔

گجرات میں نرسنہا مہتا، راجستھان میں میرا بائی، مغربی اترپردیش میں سورداس اور بنگال اور اڑیسہ میں چیتنیہ کی تحریروں اور گیتوں میں شعری جوش اور محبت کا والہانہ پن اس غیر معمولی حد تک بڑھا کہ اس نے تمام حدود اور بندشوں کو توڑ دیا جس میں ذات پات اور نسل کے بندھن بھی شامل تھے۔ یہ سادھو سنت اپنے مسلک میں بلا تفریق ذات و نسل ہر شخص کو گلے لگانے کو تیار تھے۔ بہر حال اوپر گنائے گئے سنت شاعروں میں سب کے سب ہندو دھرم کے وسیع دائرے میں ہی رہے۔ ان کے فلسفیانہ تصورات وعقائد حقیقت میں ویدوں کے وحدت الوجود کی ایک شاخ تھے جس میں بھگوان یا خالق و مخلوق میں بنیادی وحدت پر زور دیا جاتا تھا۔ ویدوں کے فلسفے کو یوں تو بہت سے مفکروں نے بیان کیا ہے مگر جس شخص نے ان سنت شاعروں کے ذہنوں پر سب سے گہرا اثر چھوڑا وہ ولبھ تھے جو ایک تلنگ (Tailang) برہمن تھے جو پندرہویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی کے ابتدائی حصے میں گزرے ہیں۔

ان سنت شاعروں کا طرز فکر بنیادی طور پر انسان دوستی یا انسان سے محبت کرنے والا تھا۔ یہ انسان کے وسیع ترین اور کشادہ دلی کے جذبات پر خاص زور دیتے تھے جس میں محبت اور خوبصورتی کے جذبات کے تمام رخ شامل تھے۔ بے مسلک، 'نرگن سنتوں' کی طرح ان کی

تنقیدوں نے بھی ذات پات کے نظام کو کوئی خاص طور پر کمزور نہیں کیا مگر انہوں نے کچھ مخصوص انداز میں سوچنے والوں کے لیے ایک راہِ فرار یا بچ نکلنے کی صورت ضرور پیدا کر دی، خاص طور پر ان کے لیے جو ذات پات کے نظام میں عدم مساوات کی بندشوں سے دوچار تھے۔ ان بزرگوں کے دلوں میں انہوں نے نجات (موکش) کی ہی امید پیدا نہیں کر دی بلکہ 'بھگت' کی حیثیت سے انہیں ظاہری دنیا میں بھی ایک اعلا درجہ بخش دیا۔ چنانچہ روی داس کہتے ہیں:۔

"میری ذات، میرے کام سب نیچ ہیں،
اور میرا پیشہ بھی نیچ ہے،
اور اس پستی سے،
بھگوان نے مجھے اعلیٰ درجہ پر لا کھڑا کیا۔
روی داس چمار کہتا ہے۔"

سنت شعراء کے بنیادی تصورات اس دور کے صوفیوں اور صوفی شعراء کے خیالات و تصورات میں غیر معمولی حد تک نظر آئے۔ پندرہویں صدی میں عرب کے عظیم فلسفی ابنِ عربی کے وحدت الوجود کے تصورات ہندوستان میں ایک بہت وسیع حلقے میں عام ہوئے۔ عربی کے راسخ العقیدہ عناصر نے سخت تنقید و تردید بھی کی اور اس کے ماننے والوں کو سزائیں اور صعوبتیں بھی دیں کیونکہ عربی کا کہنا تھا کہ تمام وجود (دنیا میں نظر آنے والی ہر چیز) بنیادی طور پر ایک ہے، اور ہر چیز اس ذاتِ واحد کا ہی مظہر ہے۔ اس طرح، اس کے نظریے کے مطابق تمام مذاہب یکساں یا متوازی ہیں۔ ابن عربی کا یہ فلسفہ یا تصور 'توحید وجودی' (ہر چیز کا ایک ہونا) کے عنوان سے جانا جاتا ہے۔ یہ فلسفیانہ تصور ہندوستان میں متواتر مقبول ہوتا رہا اور اکبر سے پہلے صوفیانہ تصورات کی بنیاد بنا رہا۔ یوگیوں اور ہندو سنتوں سے متواتر تعلق کی وجہ سے وحدت الوجود یا 'ہمہ اوست' کا تصور بھی عام ہوا۔ ہندوستانی صوفیوں نے ہندی اور سنسکرت میں زیادہ دلچسپی لینا شروع کی اور ان میں سے کچھ ملا داؤد اور ملک محمد جائسی نے اپنے تحریری کام اور شاعری ہندی میں ہی کی۔ ویشنو سنتوں کے علاقائی زبانوں میں لکھے ہوئے گیتوں کا اثر ہندوستانی صوفیوں کے دلوں پر فارسی شعروں سے زیادہ ہوتا تھا۔ ہندی گیتوں کا استعمال اتنا مقبول اور عام ہوا کہ ایک مشہور صوفی

انجام دیا تھا۔

دونوں نے ہی اپنی اپنی دارالسلطنتوں میں بہترین عمارتیں بنوائیں اور شاعروں اور عالموں کی سرپرستی کی لیکن ہمیں ان کے انتظامی کارناموں کی بہت کم معلومات ہیں۔ جیسا کہ ہم نے دکھایا ہے دونوں ہی اپنے اقتصادی استحصال اور لٹیرے پن کے باعث خراسان میں نامقبول تھے۔ پنجاب میں غزنویوں کے انتظامی ڈھانچے کے بارے میں معلومات بہت کم ہیں۔ معزالدین کو ہندوستان میں کوئی نیا انتظامیہ قائم کرنے کا وقت نہیں ملا۔ شاید اس نے رائج انتظامیہ میں تھوڑی بہت تبدیلیاں کی تھیں اور یہ اپنے امیروں پر ہی چھوڑ دیا تھا کہ وہ رائج طریقوں کے ذریعہ ہی ٹیکس وصول کرنے کا بہتر سے بہتر انتظام کریں۔

۷-راجپوتوں کی شکست کی وجوہات:

راجپوتوں کی شکست اور ترکوں کی فتح کے اسباب کو محض 1173 میں معزالدین کے غزنی کو فتح کرلینے یا 1181 میں ہندوستان کے شمالی مغربی علاقے (پشاور) میں پہلی بار اس کے داخلے کے بعد کے واقعات کے پس منظر میں نہیں تلاش کرنا چاہیئے۔ ایک تاریخ داں اے۔بی۔ایم۔ حبیب اللہ نے صحیح کہا ہے: ”معزالدین کی فتح اس عمل کا اتلاف ہے جو پوری بارہویں صدی میں جاری رہا۔“ دراصل سندھ کے باہر ہندوستان میں قدم ٹکانے کے لیے فوجی تمہیدی معائنہ کی کارروائیاں تقریباً ایک صدی پہلے محمود غزنوی کے عروج کے ساتھ ہی شروع ہو چکی تھیں۔

افغانستان اور پنجاب پر محمود غزنوی کی فتح نے ہندوستان کی باہری دفاع میں دراڑ ڈال دی تھی اس کی وجہ سے حملہ آور طاقتوں کو اس علاقے میں اپنی فوجیں لاکر اور ہندوستان کے اہم علاقوں میں جب جی چاہے حملہ کر بیٹھنے کا موقع ملا۔ جنگ کے اس نقشے میں ہندوستان کی حیثیت مصلحتاً اپناد فاع ہی کرنے کی تھی۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس پورے عرصے میں اس علاقے کی راجپوت ریاستوں میں صورتِ حال کو سمجھنے اور اس کے مقابلے کے لیے تدبیریں کرنے کی صلاحیت کا فقدان نظر آتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ محمود کی موت کے بعد، جب اس کے جانشینوں کے درمیان خانہ جنگی پھوٹ پڑی تھی جس کی وجہ سے مغربی اور وسطی ایشیا کے بیشتر علاقوں میں وہ اپنا اثر کھو چکے تھے، انھوں نے یہ کوشش نہیں کی کہ سب مل کر غزنویوں کو پنجاب سے باہر نکال دیے۔

عبدالوحید بلگرامی نے ایک رسالہ 'حقائق ہندی' نام سے لکھا جس میں انہوں نے کرشن، مرلی، گوپی، رادھا، جمنا، وغیرہ کی صوفیانہ اصطلاحوں کے روپ میں وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

اس طرح پوری پندرہویں صدی اور سولہویں صدی کے درمیان بھگتی سنتوں اور صوفیوں نے حیرتناک طور پر ایک ایسی فضا یا مشترکہ پلیٹ فارم پیدا کر لیا تھا جہاں مختلف ذاتوں اور نسلوں کے لوگ ایک ساتھ جمع ہو سکتے تھے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کر سکتے تھے۔

iii- ادب اور فنونِ لطیفہ:

سنسکرت ادب:

زیرِ نظر عرصے کے دوران سنسکرت ہی اعلیٰ خیالات کے اظہار اور ادبِ عالیہ کی تخلیق کا وسیلہ رہی تھی۔ فی الحقیقت ادب کی مختلف شاخوں میں سنسکرت ادب کی تخلیق کا کام زبردست مقدار میں اور شاید اس سے پہلے دور سے زیادہ ہی عمل میں آیا۔ عظیم سنکرا کے بعد 'ادویتا' فلسفے کے میدان میں رامانج، مادھو، ولبھ وغیرہ نے جو تحریری کام کیے وہ متواتر سنسکرت میں ہی ہوئے۔ ان لوگوں کے خیالات جس تیز رفتار سے ملک کے مختلف حصوں میں پھیلے اور ان پر بحثیں ہوئیں اس سے اس بات کا بخوبی اظہار ہو جاتا ہے کہ سنسکرت اس دور میں کتنا اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ ملک کے مختلف حصوں میں، جن میں مسلم اقتدار والے علاقے بھی شامل تھے، کچھ مخصوص قسم کے اسکولوں اور علمی اداروں کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔ ان اداروں کے کام میں کسی قسم کی مداخلت یا رکاوٹ پیدا نہیں کی جاتی تھی اور یہ متواتر پھلتے پھولتے رہے۔ ان میں سے بہت سے اداروں نے کاغذ کے آنے سے بھی فائدہ اٹھانا شروع کیا اور اسے قدیم تحریروں کو دوبارہ لکھ کر مختلف جگہوں تک پہنچانے میں استعمال کیا۔ اس طرح رامائن اور مہابھارت کے کچھ قدیم ترین نسخے، جو آج موجود ہیں، وہ گیارہویں، بارہویں اور اس کے بعد کے عرصے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

فلسفے کے علاوہ کاویہ (شاعرانہ بیان) ڈرامہ، فکشن، علم ادویہ (میڈیسن)، علم فلکیات (آسٹرونومی) موسیقی وغیرہ میں بھی تحریری کام جاری رہا۔ ہندو قوانین (دھرم شاستر) پر بہت سی تفسیریں اور تلخیصیں (ڈائجسٹ) بارہویں سے سولہویں صدی کے درمیان تیار کی گئیں۔ وجنانیشور کی عظیم 'متاکشر' جو ہندو قوانین کے دو بنیادی مکاتیب فکر میں سے ایک کی تشکیل کرتی

ہے،اس کی تیاری کو بھی بارہویں صدی سے پہلے نہیں ماناجاسکتا۔دھرم شاستروں کاایک اور مشہور ومعروف مفسر بہار کا 'چندیشور' تھا جوچودہویں صدی کا تھا۔ زیادہ تر تحریری کاموں کی تخلیق ہندو حکمرانوں کے تحت جنوبی ہندوستان ،اس کے بعد بنگال ،پھر متھیلا اور مغربی ہندوستان میں ہوئی۔ سنسکرت کی نشوونما میں جینیوں کا حصہ رہا۔ان میں سب سے مشہور نام ہیم چندرسوری کا آتا ہے۔یہ بات خاصی عجیب لگتی ہے کہ انہوں نے عام طور پر ملک میں مسلمانوں کی موجودگی کو نظر انداز کیا ہے۔اسلامی ادب یافارسی ادب کو سنسکرت میں ترجمہ کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔شاید ایک واحد استثناء جامی کی تحریر کردہ یوسف وزلیخا کی کہانی کے ترجمے کی تھی۔اسے ہندوؤں کی طرز فکر کی تنگ نظری یاگھرے پن کی ایک اور مثال سمجھا جاسکتا ہے جس کا ذکرالبیرونی پہلے ہی کرچکا تھا۔اس دور کی موجود حقیقتوں کو نظر انداز کرنایاان سے منہ موڑلیناشایداس حقیقت کے لیے ذمے دار ماناجائے گاکہ اس دور کے ادب میں زیادہ تر مواد دہرایا گیاہےاوراس میں تازگی،بصیرت، تخلیقی جدت کی کمی ہے۔

عربی فارسی ادب:

حالانکہ مسلمانوں کا تخلیق کردہ ادب زیادہ تر عربی میں تھا جوان کے پیغمبر کی زبان تھی'اورادب اور فلسفے کی زبان کی حیثیت میں اسپین سے بغداد تک استعمال ہوتی تھی'مگر جب ترک ہندوستان آئے توان پر فارسی کا بڑاگہرااثر تھا کیونکہ دسویں صدی کے بعد سے یہی زبان وسط ایشیا اورایران میں ادب اور حکومت کے انتظامیہ کی زبان ہوگئی تھی۔ہندوستان میں عربی کااستعمال عام طور پر علماء اور فلاسفہ کے ایک محدود حلقے میں باقی رہا۔وقت کے ساتھ ساتھ اسلامی قوانین کی تلخیصیں اور ترجمے فارسی میں بھی تیار ہوتے رہے جنھیں خود ہندوستان کے علماء نے ہی تیار کیا تھا۔ان میں سب سے مشہور 'فقہہ فیروز شاہی' ہے جسے فیروز تغلق کے عہد میں تیار کیا گیا تھا۔بہر حال'عربی تلخیصیں تیار کرنے کا کام بھی جاری رہا'چنانچہ ان میں سب سے مشہور 'فتاوائے عالمگیری ہے جو اورنگ زیب کے دور میں فقیہوں کے ایک حلقے کے تیار کیے ہوئے اسلامی قوانین کا مجموعہ ہے۔

دسویں صدی میں ترکوں کی آمد سے ملک میں ایک نئی زبان 'فارسی' بھی پہنچی۔اسی زمانے میں ایران اور وسطِ ایشیا میں بھی فارسی میں ایک نئی زندگی اور توانائی آئی اور فارسی زبان کے

کچھ عظیم ترین شعراء فردوسی اور سعدی اور عشقِ حقیقی اور صوفیانہ شاعری کے عظیم شعراء 'ثنائی'، 'عراقی'، 'جامی'، 'حافظ' وغیرہ ہوئے اور دسویں سے چودھویں صدی کے درمیان ان کا زبردست کلام منظرِ عام پر آیا۔ ترکوں نے بالکل ابتدا ہی سے ادب اور انتظامیہ کے لیے فارسی زبان کو اپنا لیا تھا۔ اس طرح اس زبان کی نشوونما کے لیے ہندوستان میں سب سے پہلا مرکز لاہور بنا حالانکہ اس ابتدائی دور کے فارسی لکھنے والوں میں سے بہت کم لوگوں کا کام اب باقی ہے لیکن ان میں سے کچھ لکھنے والوں جیسے مسعود سعد سلمان کی تحریروں میں لاہور سے ایک گہرے لگاؤ اور محبت کا احساس ہوتا ہے۔ بہرحال اس دور کے سب سے قابلِ ذکر لکھنے والے امیر خسرو تھے۔ 1252 میں پٹیالی (مغربی اتر پردیش میں بدایوں کے پاس ایک مقام) میں پیدا ہوئے اور انھیں اپنے ہندوستانی ہونے پر بڑا ناز تھا۔ وہ کہتے ہیں، "میں نے ہندوستان کی تعریف و توصیف دو وجہوں سے کی ہے، چونکہ ہندوستان میری جائے پیدائش اور میرا ملک ہے، اور اپنے ملک سے محبت ایک اہم فریضہ ہے۔۔۔ ہندوستان جنت جیسا ہے۔ اس کی آب و ہوا خراسان سے بہتر ہے۔۔۔ یہ پورے سال ہرا بھرا اور ہمیشہ پھولوں سے بھرا رہتا ہے۔ یہاں کے برہمن اتنے ہی لائق و فاضل ہیں جیسے ارسطو، اور یہاں بہت سے علموں کے بہت بڑے بڑے عالم موجود ہیں۔۔۔"

ہندوستان سے خسرو کی اس والہانہ محبت سے اظہار ہوتا ہے کہ ترک خود کو اب ایک غیر ملکی حکمراں طبقے کے روپ میں دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھے اور اب ان کے اور ہندوستانیوں کے درمیان ایک طرح کی ثقافتی مصالحت اور قربت کے لیے میدان ہموار ہو گیا تھا۔

خسرو نے بہت بڑا شاعرانہ ذخیرہ تیار کیا جس میں تاریخی رومانی کہانیاں بھی شامل تھیں۔ انھوں نے شاعری کی ہر صنف میں لکھا اور فارسی کا ایک نیا طرز ایجاد کیا جسے 'سبکِ ہندی' یا ہندوستانی طرز کے نام سے جانا جاتا ہے۔

خسرو نے ہندوستان کی زبانوں کی تعریف کی ہے جس میں ہندی (جسے انھوں نے 'ہندوی' لکھا ہے) بھی شامل تھی۔ اُن کے کچھ متفرق ہندی اشعار بھی اُن کی تحریروں میں نظر آجاتے ہیں، لیکن 'خالق باری' جس کی تالیف کو اُن سے منسوب کیا جاتا ہے، اس کے متعلق اغلب خیال یہی ہے کہ وہ کسی بعد کے اِسی نام کے شاعر کی تیار کی ہوئی ہے۔ وہ ایک باکمال موسیقار بھی

تھے اور مشہور صوفی نظام الدین اولیا کی 'سماع' کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جس دن خسرو نے اپنے پیر نظام الدین کے انتقال (1325) کی خبر سنی، اُسی دن ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ انھیں بھی نظام الدین اولیا کے مقبرے کے احاطے میں ہی دفن کیا گیا۔

شاعری کے علاوہ اس دور میں فارسی میں تاریخ نویسی کی بھی ایک مضبوط روایت اُبھری۔ اس دور کے سب سے مشہور تاریخ نویس منہاج سراج، ضیاء الدین برنی، عفیف اور عصامی تھے۔

فارسی زبان کے توسط سے ہی ہندوستان کے وسط ایشیا اور ایران سے گہرے ثقافتی تعلقات قائم ہوئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ فارسی صرف انتظامیہ اور سیاسی امور کی زبان ہی نہیں رہی، بلکہ معاشرے کے اعلیٰ طبقے اور اُن سے ملحق اور منحصر حلقے کی زبان بھی ہو گئی۔ یہ صورتِ حال شمالی ہندوستان سے شروع ہوئی اور بعد میں دہلی سلطنت کی جنوب میں توسیع اور ملک کے مختلف حصوں میں مسلم ریاستوں یا بادشاہتوں کے قائم ہونے سے لگ بھگ پورے ملک میں پھیل گئی۔

ملک میں سنسکرت اور فارسی نے خاص طور پر سیاست، مذہب اور فلسفے کے میدانوں میں خاص طور پر رشتے یا واسطے کی زبان کا کام انجام دیا اور ادبی تخلیقات کی بھی یہی زبانیں رہیں۔ شروع شروع میں ان دونوں زبانوں میں بہت کم لین دین تھا۔ ضیاء نقشبندی (فوت 1350) نے سب سے پہلے سنسکرت سے فارسی میں وہ کہانیاں ترجمہ کیں جو ایک طوطے نے اس عورت کو سنائی تھیں جس کا شوہر سفر پر گیا ہوا تھا۔ 'طوطی نامہ' کتاب جو محمد تغلق کے زمانے میں تیار ہوئی تھی بے حد مقبول ہوئی اور فارسی سے ترکی اور بعد میں بہت سی یوروپی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔ اس نے ہندوستان کی قدیم جنسی کتاب کوک شاستر کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا۔ بعد میں فیروز شاہ کے زمانے میں علم طب یا ادویہ، اور موسیقی کی کتابیں بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئیں۔ کشمیر کے سلطان زین العابدین نے مشہور و معروف تاریخ کی کتاب 'راج ترنگنی' اور 'مہابھارت' کا فارسی میں ترجمہ کروایا۔ اسی کی فرمائش پر علم طب اور موسیقی کی کتابیں بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہوئیں۔

علاقائی زبانیں:

اس زمانے میں بہت سی علاقائی زبانوں میں بھی اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق ہوا۔ کچھ

علاقائی زبانوں ہندی بنگالی، مراٹھی وغیرہ کی ابتدا بھی آٹھویں صدی میں ہی تلاش کی گئی ہے۔ کچھ دوسری زبانیں جیسے تامل بہت پرانی زبانیں ہیں۔ بودھ، جینیوں اور ناتھ پنتھی 'سِدھاؤں' نے کچھ "ملی جلی یا بگڑی ہوئی زبانوں" (اپ بھرنش) اور علاقائی زبانوں کو سنسکرت کے استعمال پر ترجیح دی۔ چودھویں صدی کے شروع میں امیر خسرو نے علاقائی زبانوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے: "اس زمانے میں ملک کے ہر صوبے میں اس کی ایک مخصوص زبان ہے، جو کسی دوسرے سے مستعار نہیں لی گئی ہے۔ سندھی، لاہوری، کشمیری، کبارِ (جموں کے علاقے کی ڈوگری)، دُھر سمندری (کرناٹکا کی کنڑ)، تلنگی (تلگو)، گوجر (گجراتی)، ماباری (تامل)، گوری (شمالی بنگال) بنگالی، اودھ اور دہلی اور اس کے آس پاس بولی جانے والی (ہندوی)" انھوں نے آگے بیان کیا "یہ زبانیں زمانۂ قدیم سے ہی زندگی کے عام کاروبار میں ہر طرح استعمال ہوتی رہی ہیں۔"

کچھ جدید علاقائی زبانیں، جیسے آسامی، اُڑیا، ملیالم وغیرہ کا ذکر نہیں ملتا۔ بہر حال خسرو نے اس اہم صورت حال، یعنی جدید علاقائی ہندوستانی زبانوں کی نشوونما کی طرف صحیح نشاندہی کی ہے۔ ان میں سے بہت سی زبانوں کا پختگی کی سطح تک پہنچ جانا اور ان کا ادبی تخلیقات میں استعمال ہونا عہد وسطیٰ کی بڑی ممتاز اور قابلِ ذکر خصوصیت مانی جائے گی۔ اس کی وجوہات متعدد اور مختلف تھیں۔ ممکن ہے برہمنوں کی بالادستی اور حیثیت میں کمی آنے سے سنسکرت کی حیثیت میں بھی کسی قدر کمی آئی ہو۔ بھگتی سنتوں کی طرف سے علاقائی اور عام زبان کا استعمال بھی ان زبانوں کی ترقی کی ایک یقینی وجہ تھی۔ فی الحقیقت، ملک کے بہت سے علاقوں میں سنتوں سادھوؤں نے ہی ان زبانوں کو ادب کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترکوں کی آمد سے پہلے بہت سی علاقائی حکومتوں میں سنسکرت کے ساتھ تامل، کنڑ، مراٹھی وغیرہ بھی استعمال ہوتی تھیں۔ ترکی حکومت کے دوران بھی یہ طریقہ جاری رہا ہوگا کیوں کہ ہمیں دہلی سلطنت میں ہندی جاننے والے محاسبوں (اکاؤنٹنٹس) کے تقرر کا ذکر ملتا ہے۔ بعد میں جب دہلی سلطنت منتشر ہوگئی، تب بھی انتظامی امور میں بہت سی علاقائی حکومتوں میں فارسی کے ساتھ علاقائی زبانوں کا استعمال جاری رہا۔ چنانچہ جنوبی ہندوستان میں وجے نگر کے حکمرانوں کی سرپرستی میں تلگو ادب کی نشوونما ہوئی۔ مراٹھی بہمنی سلطنت کی انتظامیہ کی زبانوں میں سے ایک تھی اور اس کے بعد بیجاپور کے دربار میں

بھی یہ صورت برقرار رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب یہ زبانیں ترقی کر کے ایک خاص درجے پر پہنچ گئیں تو کچھ مسلم حکمرانوں نے ان کے ادبی استعمال کے سلسلے میں بھی سرپرستی کی۔ مثال کے طور پر بنگال کے حکمراں نصرت شاہ نے رامائین اور مہابھارت کا بنگالی میں ترجمہ کروایا۔ اسی کی سرپرستی میں مالادھر باسو نے 'بھگوت' کا ترجمہ کیا۔ بنگالی شعراء کو اس کی جو سرپرستی ملی اس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔

صوفیوں کی موسیقی کی محفلوں میں بھکتی سنتوں کی ہندی نظموں اور گیتوں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مشرقی اترپردیش میں 'چندراین' کے مصنف ملّا داؤد، ملک محمد جائسی وغیرہ نے ہندی میں ہی لکھا اور صوفیانہ تصورات اور خیالات کو اس انداز میں بیان کیا کہ انہیں عام آدمی بھی سمجھ سکے۔ انہوں نے شاعری کی کچھ صنفوں جیسے مثنوی کو بھی عام کیا۔

فنونِ لطیفہ (موسیقی):

ایک دوسرے کو سمجھنے، قربت اور میل جول کے رجحانات صرف مذہبی اعتقادات اور رسوم، طرزِ تعمیر اور ادب میں ہی نظر نہیں آتے بلکہ یہ فنونِ لطیفہ، خاص طور پر موسیقی کے میدان میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ترک جس وقت ہندوستان آئے تھے تو انھیں موسیقی کی بھرپور روایت عربوں سے ورثے میں مل چکی تھی جس کی ایران اور وسطِ ایشیا میں مزید نشوونما ہوئی تھی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ نئے ساز بھی لائے تھے، جیسے رباب اور سارنگی اور کچھ نئے طرز اور اصول بھی اُن کے پاس تھے۔ بغداد کے خلفاء کے دربار میں ہندوستانی موسیقی اور موسیقاروں نے شاید وہاں موسیقی کی نشوونما پر بھی اثر ڈالا تھا۔ بہر حال، ان دونوں کے درمیان باقاعدہ تعلق سلطنت دور میں ہی عمل میں آیا۔ امیر خسرو کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ خسرو جنھیں 'نایک' یعنی موسیقی کے اصول اور ریاض دونوں کے استاد کا خطاب دیا گیا تھا، انھوں نے بہت سے فارس۔ عرب راگ شروع کیے۔ جیسے ایمن، گورا (غارا) سنم وغیرہ۔ قوالی کی ابتدا بھی انھیں سے منسوب کی جاتی ہے۔ ستار کی ایجاد کا سہرا بھی انھیں کے سر رکھا جاتا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ طبلے کو بھی اُن سے منسوب کیا جاتا ہے مگر اس کی نشوونما غالباً سترھویں صدی کے آخری حصے میں یا اٹھارویں صدی کے شروع میں ہوئی تھی۔

موسیقی میں قربت اور تکمیل کا عمل فیروز کے عہد میں جاری رہا۔اس کے عہد میں ہندوستانی کلاسیکی تحریر 'راگ درپن' کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ موسیقی کی محفلیں صوفیوں کی خانقاہوں اور بسیروں سے باہر نکل کر امراء کے محلوں تک پہنچ گئیں۔ جونپور کا حکمراں سلطان حسین شرقی موسیقی کا بڑا مربی اور سرپرست تھا۔اس دور کے سب سے بڑے موسیقار کے بعد صوفی پیر بودھن کو ہی اگلے نمبر پر مانا جاتا ہے۔ایک اور علاقہ جہاں موسیقی کی زبردست آبیاری اور نشوونما ہوئی وہ گوالیار کی ریاست تھی۔ گوالیار کا راجہ مان سنگھ موسیقی کا زبردست دلدادہ تھا۔ 'مان کوتوہال' نام کی کتاب، جس میں مسلمانوں کی اختراع کی ہوئی تمام طرزوں کو جمع کیا گیا ہے، وہ اسی کی سرپرستی اور نگرانی میں تیار کی گئی تھی۔ یہ نہیں معلوم کہ شمال ہندوستان کی موسیقی کی طرز جنوبی ہندوستان کی طرز سے کب الگ ہوئی۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ طرز میں یہ فرق زیادہ تر شمالی ہندوستان میں فارس۔ عرب راگوں اور تالوں کی وجہ سے ہی پیدا ہوا۔

سلطنت کشمیر میں ایک بالکل الگ یا ممتاز طرز اُبھرا جس پر ایرانی موسیقی کا زیادہ اثر تھا۔ جون پور کو فتح کرنے کے بعد سکندر لودی نے وہاں کی پرانی روایت، موسیقی کی سرپرستی کو بڑے شاہانہ انداز میں برقرار رکھا۔ بعد میں اِسے افغان حکمرانوں نے بھی اپنایا اور اس روایت کو اور آگے بڑھایا۔ چنانچہ شیر شاہ کا جانشین عدالی خود موسیقی کا بڑا استاد تھا۔ بہرحال موسیقی کا نقطہ عروج مغل دور میں پہنچا۔

■■■

-14-

سلطنت عہد میں ریاست

کسی ریاست کو اس کے عوام کی روایات، تصورات اور عقائد کے تناظر میں ہی دیکھا جانا چاہیے۔اِسی تناظر میں اس کی سماجی ساخت بھی آتی ہے جس میں اس کا حکمراں طبقہ اور اس طبقے کے دوسرے طاقتور زمروں اور ان کے عوام سے تعلقات اور رشتے بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس معاشرے کے پیداواری نظام اور نظام میں پیداواری رشتے، یہی خاص زاویے ہیں جن سے ہم کسی ریاست کے معاشرے کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے اتنا مکمل اور جامع مطالعہ کسی ایک خاکے یا مختصر بیان میں ممکن نہیں ہے۔ یہاں اس کے صرف کچھ بنیادی نکات کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں ریاست کی ماہیت یا ساخت، اس کی ابتدا، شخصی حکمرانی (مونارکی) کی کیفیت، حکومت کا اپنے عوام کے لیے طرزِ فکر، مذہب اور مختلف مذہبی نظاموں سے اس کا رشتہ، بغاوت یا مخالفت کے حقوق وغیرہ وغیرہ، ان تمام نکات پر پرانے وقتوں ہی سے برابر بحث ہوتی چلی آرہی ہے۔ یہ نکتہ (بحث کی قدامت) کوٹلیا کی ارتھ شاستر میں اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اُس نے بھی ریاست کے بارے میں ایسے کئی قدیم مکاتیبِ فکر کا ذکر کیا ہے جو اب ہمارے لیے معدوم ہو چکے ہیں۔ بہر حال یہ بحث کہ ریاست کیسی ہو، متواتر جاری رہی ہے اور اِسی لیے ہمیں مہابھارت، جین مفکرین اور یہاں تک کہ دھرم شاستروں میں بھی اس کا ذکر مل جاتا ہے۔ بہر حال، عام طور پر سیاسی طرزِ عمل (راج نیتی) اور اخلاقی طرزِ عمل (دھرم نیتی) ایک دوسرے سے الگ مگر ایک دوسرے پر منحصر صورتیں سمجھی جاتی تھیں۔

ریاست کا مُسلم تصور اور اس کا ارتقاء کسی قدر الجھا ہوا ہے۔ ابو یوسف الیعقوبی (فوت: 798)، الفارابی (فوت:950)، الماوردی (فوت: 1031) اور الغزالی (فوت 1111)، وغیرہ نے اس موضوع پر مسلم طرزِ فکر کو ایک واضح شکل دی جو خاص طور پر اس تناظر کو پیش کرتی ہے جس میں عباسی خلافت کا زوال ہو کر عملی صورت میں کچھ آزاد ریاستیں وجود میں آئیں۔ گو کہ اس سلسلے میں پرانا تصور، جس میں امام یا خلیفہ کے پاس روحانی معاملات کی سربراہی اور (سیکولر یا عام) حکومت

کی طاقت واقتدار دونوں یکجا رہتے تھے، باقی رکھا گیا، مختلف سلاطین کو ایک آزاد اور خود مختار حیثیت بھی دی گئی بشرطیکہ وہ خلیفہ کی بظاہر اعلیٰ حیثیت کو تسلیم کرتے رہیں۔ اس طرح اسلامی اتحاد کے موہوم سے تصور کے بنیادی اصول کو بظاہر برقرار رکھتے ہوئے عملی طور پر سلاطین کو اپنے سیاسی معاملات میں اس وقت تک بالکل خود مختار چھوڑ دیا گیا تھا جب تک وہ اعلانیہ طور پر شریعت کی خلاف ورزی نہ کریں۔

جو ترک ہندوستان آئے ان کے ذہنوں پر ریاست کے سلسلے میں اسلامی تصور یا اس سلسلے میں عمل کا بڑا گہرا اثر تھا، لیکن وہ اپنے قبائلی اور خاندانی رسوم و رواج کو بھی پوری طرح فراموش یا مسترد نہیں کر پائے تھے۔ انہوں نے سیاسی معاملات اور ان کو حل کرنے کے سلسلے میں عملی پختگی کا بھی اظہار کیا اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی قوانین (شرع) کے حلقے میں باقی رہنے کی بھی متواتر کوشش کی۔

أ- ریاست کا قانونی، سیاسی اور سماجی کردار:

قانونی نقطہ نگاہ سے دہلی سلطنت کو اس وقت سے ایک آزاد اور خود مختار ریاستی اکائی مانا جاسکتا ہے جب معزالدین محمد بن سام کا غلام قطب الدین ایبک 1206 میں غزنی کی ماتحتی سے آزاد ہو کر تخت نشین ہوا۔ پھر بھی جب تک التتمش نے اقتدار پر اپنی گرفت پوری طرح مستحکم نہ کر لی غزنی کے حکمرانوں نے ان علاقوں پر اپنی محدود فرمانروائی (سوورانٹی) کا دعویٰ نہیں چھوڑا جو دہلی سلطنت کی تشکیل کرتے تھے۔ اصل میں یہ بھی چنگیز خاں کے ہاتھوں خود غزنی فتح کر لیے جانے کا نتیجہ تھا۔ اس کے اثر سے معزالدین محمد بن سام کا جانشین یلدوز وہاں سے دہلی کی طرف فرار ہوا اور التتمش نے اسے ہرا کر گرفتار کر لیا۔

گو کہ دہلی کے سلاطین اپنی خود مختاری کو تسلیم کرانے کے لیے کوشاں تھے مگر ساتھ ہی وہ باقی اسلامی دنیا سے بھی اپنا تعلق بنائے رکھنا چاہتے تھے۔ اس کا ایک طریقہ بغداد کے خلیفہ سے اپنے لیے (سلطان) کے خطاب کا ایک باقاعدہ منشور حاصل کر لینا تھا۔ چنانچہ 1229 میں التتمش کو باضابطہ مسند نشینی کا پروانہ اور شاندار خلعت وغیرہ بغداد کے خلیفہ سے حاصل بھی ہو گئے۔ اس کے بعد سے دہلی کے سلطانوں نے اپنے سکوں پر بغداد کے خلیفہ کا نام لکھوانا شروع کر دیا اور جمعے

کے خطبے میں ان خلفاء کا نام شامل کیا جانے لگا۔ سلطانوں نے اپنے لیے 'ناصر امیر المومنین' یا 'خلیفہ کا مددگار' کا لقب اپنالیا۔ اس طرح دلیل دی جاتی ہے کہ دہلی کے سلاطین قانونی اعتبار سے خلیفہ کے ماتحت ہو گئے۔ بہر حال اس دور کے ہم عصروں میں یہ قانونی رخ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ خلیفہ کا منشور حاصل ہونے سے پہلے بھی کسی نے سلطان کی قانونی خود مختاری پر انگلی نہیں اٹھائی تھی۔ نہ اس وقت کسی نے سلطان کی قانونی حیثیت پر کوئی اعتراض کیا جب علاء الدین خلجی کے جانشین مبارک شاہ نے خلیفہ کی تابعداری کو مسترد کر کے خود اپنے امام اور خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ خلیفہ سے اجازت نامہ یا منشور حاصل کر لینا صرف ایک اخلاقی سوال تھا۔ اس سے اس تصور کو بھی مدد ملتی تھی جس کے ذریعے سے 'اسلام کے اتحاد' کا مبہم سا نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی جس کا سربراہ خلیفہ ہوتا تھا۔ مگر یہ 'اتحاد' بہت پہلے ٹوٹ چکا تھا۔ کچھ تو اسلام میں مختلف فرقوں کے وجود میں آنے کی وجہ سے اور کچھ ترک اور ایسے ہی دوسرے قسمت آزما سورماؤں کے ہاتھوں مختلف ریاستیں اور بادشاہتیں قائم کر لینے کے نتیجے میں۔ منگولوں کے عروج نے اس اتحاد کو اور زیادہ مجروح کر دیا تھا۔

جس وقت محمد بن تغلق اندرونی بغاوتوں کے ایک طویل سلسلے میں پھنسا ہوا تھا تو اس نے 1343 میں عباسی خلیفہ کے اس وارث سے اپنے حق میں ایک باقاعدہ منشور مانگا اور حاصل بھی کر لیا جو 1259 میں خلیفہ کے ہلاکو خاں کے ہاتھوں قتل کر دیے جانے کے بعد سے قاہرہ میں مقیم تھا۔ اس سے پہلے وہ (محمد بن تغلق) اپنے سکوں سے اپنا نام ہٹا کر اس کی جگہ خلیفہ کا نام ڈلوا چکا تھا۔ مگر ان اقدامات نے بھی باغی سرداروں پر بہت کم اثر ڈالا فیروز تغلق اس سے بھی پہلے، جب اس نے اپنے راسخ العقیدہ اور اسلام کا رہنما یا چیمپئن ہونے کا دعویٰ کیا تھا، دوبار خلیفہ سے منشور اور اعزازی خلعت حاصل کر چکا تھا، مگر خود عباسی خلیفہ کے اقتدار و حیثیت میں ہی رفتہ رفتہ گراوٹ آتی چلی گئی اور پھر تیمور کی مثال کو اپناتے ہوئے بعد میں مغل حکمرانوں نے خود ہی امام اور خلیفہ کے خطابات اپنا لیے، اس طرح سلطنت دور اور پھر مغل دور میں خلافت کا سلسلہ یا ادارہ بہت کم اہمیت کا حامل رہا۔

ترکوں کی آمد سے شمالی ہندوستان میں ایک نئی طرح کی ریاست وجود میں آئی۔ اس

اس کے برعکس محمود کے جانشینوں نے اپنے کمزور حالات کے باوجود جارحانہ حکمتِ عملی جاری رکھی اور راجستھان میں اجمیر اور اس سے آگے تک اور گنگا کے علاقوں میں قنوج اور بنارس تک لوٹ مار کرتے رہے۔ اس دور کے راجپوت اپنا کوئی کارنامہ گنا سکتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ وہ "ہمیرہ" کے لوٹ مار کے حملوں کو روکتے رہے تھے جو دنیا کے لیے پریشانی کا باعث بن چکا تھا۔

اس جنگی داؤں پیچ کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ان میں سیاسی یکجہتی کی کمی تھی یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان میں کسی مضبوط طاقت کی کمی تھی۔ بہر حال اسے وسائل اور وسعت سے نہیں جوڑنا چاہیئے۔ وسائل اور وسعت کے اعتبار سے بہت سے راجپوت آبادی اور سالانہ آمدنی کے اعتبار سے ان جانشین حکمرانوں کی کسی بھی ریاست سے بہتر تھے جو عباسی حکومت کے زوال کے بعد مغربی اور وسطی ایشیا میں برسر اقتدار آئیں۔ خراسان، ماوراءالنہر، اور خوارزم جیسے چند زرخیز علاقوں کے علاوہ زیادہ تر علاقے پہاڑی یا بنجر تھے جن سے کچھ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ آمو دریا کے دوسری طرف بہت عرصے تک غز قبیلوں نے بار بار حملے بھی کیے تھے۔ دوسری طرف راجستھان اور بندیلکھنڈ سے آگے وہ علاقے بہت زرخیز تھے جو راجپوتوں کے قبضے میں تھے۔ انسانی وسائل یا آبادی کے لحاظ سے بھی راجپوتوں کے قبضے والے علاقے بہت بہتر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کسی بھی جنگ میں راجپوتوں کی طرف انسانوں اور جنگی سازوسامان کی تعداد ترکوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی تھی۔ اس لیے یہ سوچنا بھی غلط ہوگا کہ غیر مساواتی ذات پات کے نظام کی وجہ سے راجپوت راجاؤں کو اپنی فوج کے لیے کافی سپاہی مہیا نہیں تھے۔ درحقیقت یہ سوچنا بھی صحیح نہیں ہے راجپوت فوجوں میں صرف راجپوت سپاہی ہی ہوتے تھے کیونکہ جنگی جتھے جیسے جاٹ، مینا اور وہ گروپ جو کورن (نیچی ذات) کہلاتے تھے، راجپوت فوجوں سے باہر نہیں تھے۔

راجپوتوں کی شکست کی وجہ ترکوں کے مقابلے میں جنگی جذبہ، ہمت یا بہادری کی کمی بھی نہیں تھی۔ جنگ راجپوتوں کے لیے ایک کھیل تھا، ایران جیسی دوسری قدیم تہذیب کی آسانی سے شکست کے مقابلے میں راجپوتوں کی ایک طویل عرصے تک ترکوں کی یورش کی مزاحمت اور ترکوں کے خلاف مختلف جنگوں میں ان کی فتح سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان میں جنگی جذبہ کا فقدان تھا۔

کے ابتدائی دور میں اس کے فوجی سرداروں کو ہر ممکن آزادی دی گئی تھی کہ وہ ملک کے مختلف حصوں میں فتوحات کرتے چلے جائیں، مگر ساتھ ہی ایک بہت مضبوط دستہ یا فوجی ٹکڑی ہمیشہ دارالسلطنت میں سلطان کی براہِ راست گرفت اور کمان میں بھی رہتا تھا۔ اس قسم کی ایک ڈھیلی یا غیر مرکزی مطلق العنانیت کو بلبن نے اپنے دور میں ایک گٹھی ہوئی اور پوری طرح مرکزیت پر مبنی ریاست میں تبدیل کر دیا، کچھ چھوٹے ہوئے خللوں یا رکاوٹوں کے ساتھ۔ (مثال کے طور پر جلال الدین خلجی کے تحت) دہلی سلطنت نے اپنا اعلیٰ درجے کا مرکزی کردار، چودھویں صدی کے آخر میں اس وقت تک برقرار رکھا، جب تغلق خاندان کے زوال کے بعد اور لودیوں کے اقتدار سنبھال لینے تک ایک غیر مرکزی مطلق العنانیت کو اپنانے کا ایک مختصر سا تجربہ پھر کیا گیا جس میں افغان قبیلوں کے سرداروں نے اقتدار میں زیادہ حصہ لینے کا دعویٰ کیا۔ اس کے اثر سے سلطان اور اس کے امراء میں ٹکراؤ اور کشمکش بڑھی جس کا نتیجہ 1526 میں ابراہیم لودی کی پانی پت کے میدان میں شکست کی شکل میں ظاہر ہوا۔

گو کہ سلطنت دور میں سلطان اور امراء کے درمیان کشمکش ایک مستقل صورتِ حال رہی اور مرکزیت کتنی اور کس حد تک برقرار رہی، اس کا معیار بھی ہر حکمراں کی اپنی صلاحیت کے ساتھ تبدیل ہوتا رہا، لیکن بلبن کے تخت نشین ہونے کے بعد امراء اور سلطانوں کے درمیان اقتدار کی اس کشمکش کا آخری فیصلہ سلطان کے حق میں ہو گیا۔ ترکی امراء ایک گٹھا ہوا مضبوط دستہ بنا لینے، اپنی پسند کے کسی وزیر کے ہاتھ مضبوط کرنے، یا کوئی ایسا سلسلہ یا ادارہ قائم کر لینے میں ناکام ہو گئے جو سلطان کے اقتدار و اختیارات پر کوئی بندش عاید کر سکے۔

اپنی ظاہری صورت کے باوجود تیرہویں اور چودھویں صدی کے درمیان سلطنت کے کردار میں خاصہ بین فرق پیدا ہوا۔ تیرہویں صدی میں ریاست غیر ملکیوں کے فتح کیے ہوئے علاقوں کی صرف شعبہ واریت پر مبنی ایک تنظیم تھی۔ اس دور کے امرا جن میں زیادہ تر ترک بنیاد رکھتے تھے اور ملک میں پھیلے ہوئے دیہی علاقوں پر اپنی ان فوجی چھاؤنیوں میں ہی رہتے ہوئے انتظام اور گرفت قائم رکھتے تھے جو شہروں اور دور دراز قلعوں میں منتشر تھیں۔ اسی دور میں صوفیوں نے جن میں چشتی صوفیاء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، حکمراں طبقے اور عوام میں ایک رشتہ اور تعلق قائم

کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا، اسے ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔

تیرہویں صدی فی الحقیقت ریاست پر ترکوں کے صرف قبضے یا غلبے کا دور تھا۔ زیادہ ترامراء جو معزالدین محمد بن سام کے ساتھ ہندوستان آئے تھے، خواہ وہ آزاد تھے یا غلام، وہ نو مسلم ترک تھے۔ دوسرا اہم گروہ خلجیوں کا تھا جنہیں ترک نہیں ما ا جاتا تھا۔ مگر اس گروہ کو دہلی میں قطب الدین ایبک کے جانشینوں کی خوشنودی حاصل نہ ہو سکی چنانچہ انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ شمالی بنگال میں وہ ایک نیم آزاد ریاست علیحدہ قائم کر لیں۔

ایک دوسرا گروپ جو التتمش کے دور میں اُبھرا اور اہمیت حاصل کی وہ تاجیکیوں کا تھا۔ پھر عرب، یمنیوں وغیرہ کے بھی کچھ گروہ تھے جو عام طور پر 'صدر' کے شعبے میں مقرر کیے جاتے تھے۔ ترک، جو اکھڑ قسم کے جنگباز تھے، ان کے برخلاف تاجیک لوگ جن کی زبان فارسی تھی تہذیب یافتہ اور شستہ لوگ تھے۔ اس لیے عام طور پر انہیں مرکزی حکومت میں انتظامیہ کے شعبوں میں رکھا جاتا تھا۔ التتمش کا وزیر نظام الملک جنیدی بھی تاجیک تھا۔ آزاد اور غلام ترک دونوں تاجیکیوں سے متنفر رہتے تھے اور ان کی اعلیٰ مرکزی عہدوں پر پہنچنے کی کوششوں کی ہر ممکن مخالفت کرتے تھے۔ یہ نفرت اور دوری التتمش کے بعد اس وقت پوری طرح اُبھر کر سامنے آئی جب ترکوں نے زیادہ تر تاجیکیوں کو قتل کر ڈالا۔ وزیر نظام الملک بچ تو گیا مگر اس کے بعد کسی نے اس کا نام نہ سنا۔ اس کے بعد سے ترکوں کے لیے تاجیکیوں کی چنوتی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

اعلیٰ عہدوں پر کسی اور کو نہ پہنچنے دینے کی ترکوں کی دیرینہ خلش اور جوش و خروش حبشیوں کے خلاف اس وقت ظاہر ہوئے جب رضیہ نے ملک یاقوت کو امیر آخور (شاہی اصطبل کا افسر اعلیٰ (سپرنٹنڈنٹ) مقرر کیا۔ بہرحال ترک امراء نے 'چہلگانی غلام' حکام کو ہٹا کر سلطان پر خود اپنی گرفت مضبوط کرنے کی غرض سے ایک ہندوستانی مسلمان عماد الدین ریحان کو استعمال کرنے میں بھی کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کی۔

بلبن کے عہد میں بہت سے تضاد بھی نظر آتے ہیں۔ بلبن نے 'چہلگانی ترکوں' کی گرفت کو ختم کیا اور ساتھ ہی ساتھ اس نے انتظامیہ کے چھوٹے درجوں پر بھی "کمتر نسل" کے ہندوستانی مسلمانوں کا تقرر کرنے کی ٹھانی۔ اس سے وہ ریاست پر مکمل ترکی غلبہ قائم کرنے کے

کے چمپئن کے طور پر سامنے آیا۔ پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے خود کو ایران کے مشہور ہیرو افراسیاب کا بھی وارث ظاہر کرنے کی کوشش کی اور قدیم ایران میں محدود فرمانروائی کے جو طریقے اور علامتیں استعمال ہوتی تھیں، انہیں اپنایا۔ اس طرح اس نے ترکی کے غلبے اور اقتدار میں ایرانی طریقہ کار کو ایک دوسرے میں ضم کرنے کی کوشش کی۔

گو کہ غلامی کے سلسلے میں مسلمانوں میں مختلف نسلی گروہوں۔ خصوصاً ترک، جو قبیلوں اور علاقائی حلقوں میں کٹے ہوئے تھے۔ انہیں ایک دوسرے میں سمو دینے کے سلسلے میں بھی ایک اہم کردار ادا کیا، لیکن ہندوستانی ریاست کے لیے مشکل سے ہی 'غلام ریاست' کی وہ اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے جسے شروع کے انگریز مورخوں نے استعمال کیا تھا اور جسے اب مسترد کیا جاچکا ہے۔ سلطنت کے بہت سے امراء نے اپنی خدمات کسی سلطان یا امیر کے غلام کی حیثیت سے شروع کیں لیکن وہ اپنی متواتر ترقی پذیر زندگی کے سفر میں کسی نہ موقعے پر آزاد کر دیے گئے تھے۔ چنانچہ التمش نے ان علماء کے سامنے اپنا پروانہ آزادی پیش کیا تھا جو اس کی تخت نشینی کے بعد اس کے پاس آئے تھے، چونکہ اسلامی نظریے کی رو سے صرف ایک آزاد شخص ہی تخت و تاج سنبھال سکتا ہے۔ اسطرح بھی اسے 'غلام خاندان' کہنا غلط ہے۔

بلبن کی متواتر کوششوں کے باوجود ریاست پر ترک غلبہ اس کی زندگی میں ہی ختم ہونا شروع ہو گیا تھا چنانچہ اسے اپنے دور حکومت کے آخری برسوں میں منگولوں کے ایک گروہ کو اپنے حلقہ امراء میں مجبوراً شامل کرنا پڑا تھا۔ اس سے پہلے اپنے بیٹے شاہزادہ محمد کی موت کے بعد اسے منگولوں سے لڑنے کے لیے جلال الدین خلجی کے ماتحتی میں خلجیوں کو بھی بھرتی کرنا پڑا تھا۔ پھر زندگی کے آخری حصے میں بنگال کی مہم کے دوران جب اسے خود ترک امراء اور فوج کا ایک حصہ غیر مستعد اور ناقابلِ اعتماد محسوس ہوا تو اس نے ترکی امراء اور سپاہیوں کی سرزنش کی اور انہیں سزا دی۔ مگر پھر اسے مشرقی اتر پردیش کے کچھ "رئیسوں" کی مدد حاصل کرنے کی طرف رجوع ہونا پڑا اور بنگال کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقامی سپاہیوں کی عام بھرتی کی راہ تک اپنانی پڑی۔

ترکی غلبے یا 'خالص ترک' پالیسی کو 'خلجیوں' نے ختم کیا۔ انہوں نے ترکوں کے خلاف کوئی خصوصی تعصب نہیں برتا لیکن مسلمانوں میں تمام باصلاحیت زمروں کے لیے دروازے کھول

دیے۔ چنانچہ علاء الدین کا وزیر نصرت خان جلیسر تھا اور میر ارض ظفر خان تھا۔ دونوں مشہور جنگباز تو تھے مگر ترک نہیں تھے۔ غالباً ہندوستانی مسلمان تھے۔ ایک اور غیر ترک جو اعلیٰ حیثیت تک پہنچا وہ ملک کافور تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ علاء الدین خلجی کے عہد حکومت کے آخری برسوں میں طبقہ امراء میں خاصی بڑی تعداد میں غیر ترکوں کا داخلہ ہوا جن میں ہندوستانی مسلمان بھی شامل تھے۔ صرف یہی ایک چیز اس صورت حال کی وجہ نظر آتی ہے کہ 1320 میں مبارک خلجی کے قتل کے بعد خسرو خاں کے تحت 'باراووس' - راجپوتوں کا ایک ان پڑھ مگر جنگ باز گروہ - بہت مختصر سے عرصے کے لیے اقتدار کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچ سکا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خلجیوں کے برسر اقتدار آنے کے ساتھ جس کی وجہ سے اعلیٰ عہدوں پر ترکوں کی اجارہ داری ختم ہوئی، اور ایک "ہندوستان مسلم مکمل یا سالم ریاست "ہندوستان میں وجود میں آگئی جس میں مسلمانوں کے مختلف طبقوں کو حلقہ امراء میں شامل کیا گیا اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر نسلی بنیاد کی بجائے صلاحیت ولیاقت اور سلطان کے ذاتی میلان یا پسندیدگی کی بنیاد پر تقرر ہونے لگے۔ اس نکتے کو پوری طرح ثابت کر دینے یا مسترد کر دینے کے لیے ابھی پوری تحقیقات نہیں ہوئی ہے۔ بہر حال اتنا ہم ضرور جانتے ہیں کہ ہندوستان میں حکمراں طبقہ اور بذاتِ خود حکمراں 'اعلیٰ خون' کے اصول پر سختی سے یقین رکھتے تھے جس کے نتیجے میں صرف ان ہی لوگوں کا حکومت میں اعلیٰ عہدوں۔ مذہبی یا غیر مذہبی دونوں پر۔ تقرر کیا جاتا تھا جو اپنا رشتہ کسی 'باعزت' خاندان سے ثابت کر دیتے تھے۔ ہندستان میں سب سے پہلے مسلمان سیاسی مفکر، فقیر مدبر نے التتمش کے دور میں لکھا تھا:

"دیوان، شاگرد اور محرر' (شعبہ محاصل کا عہدہ) کے عہدوں پر صرف اہل قلم (پڑھے لکھے) اور ایسے لوگ مقرر کیے جائیں جن کے بزرگ کسی بادشاہ یا امیر کی خدمات انجام دے چکے ہوں۔

ضیاء الدین برنی، جس نے فیروز تغلق کے عہد حکومت کے ابتدائی حصے میں، قید میں، سیاسی رسالہ 'فتاوائے جہاں داری' مرتب کیا تھا، اس کے یہاں بھی یہی طرز فکر نظر آتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ انسان کی تخلیق کے وقت ہی کچھ دماغ ادب اور تحریر کے فن سے متاثر کیے گئے تھے، کچھ دوسرے گھوڑ سواری یا جنگبازی سے، کچھ بُننے، سینے پرونے، بوھئی کے کام، بال کاٹنے اور چمڑا کمانے

وغیرہ سے۔ اس لیے لوگوں کو صرف وہی حرفے اور پیشے اپنانے چاہئیں "جن کے لیے ان کے دماغ تیار ہوئے ہیں (اور) وہ ان پیشوں میں کام کرتے رہے ہیں۔" پھر وہ آگے کہتا ہے: "کسی نچلے درجے کی پیدائش کے انسان پر اگر سو فضیلتیں بھی لاد دی جائیں تو وہ توقع کے مطابق نہ ملک کو منظم رکھ سکتا ہے نہ اسے چلا سکتا ہے یا اسے سیاسی رہنما اور اعتماد کے قابل سمجھا جاسکتا ہے"۔

اس موقع پر برنی صرف حکمراں طبقے کے رجحانات یا ترجیحات کو پیش کرتا محسوس ہوتا ہے۔ مگر ایسے تصورات کا اثر ریاست کے کردار پر بہر صورت ہوتا تھا۔ ریاست یا حکومت صرف "باعزت" طبقوں کے لیے ہی وقف رہی۔ اس پالیسی میں اگر کسی حکمراں نے کچھ رخنہ پیدا کرنے کی کوشش کی تو وہ محمد بن تغلق تھا جس نے ہندو مسلمان دونوں مذہبوں کے ایسے لوگوں کو خاصی بڑی تعداد میں صرف ان کی مستعدی اور کارکردگی کی بنیاد پر سرکاری خدمتوں پر مقرر کیا جو 'نچلے طبقے' کے لوگ کہلاتے تھے۔ اس کے خلاف جانے پہچانے اور پہلے سے جمے حکمراں طبقوں کی طرف سے کافی شدید ردعمل بھی ہوا۔ چنانچہ فیروز تغلق کے زمانے میں ہندو یا مسلمان کسی بھی مذہب کے ایسے لوگوں کی تقرری کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

اس لیے ایسے منتشر، یا طبقوں میں منقسم، معاشرے میں کسی "سالم" ہندستانی مسلم ریاست کی بات کرنا محال محسوس ہوتا ہے۔ ہندوستانی نومسلموں کی حیثیت میں بھی مشکل سے ہی کوئی فرق آیا۔ ایک نومسلم تلنگ برہمن، خان جہاں مقبول کے فیروز تغلق کے دور میں اتنی اعلیٰ حیثیت تک ترقی کرلینے، یا عین الملک 'ہندستانی' کے محمد بن تغلق کے عہد میں اودھ کا گورنر ہو جانے اور بعد میں فیروز کے عہد میں 'مشرف ممالک' (آڈیٹر جنرل) بن جانے کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اعلیٰ طبقے کے نومسلموں نے طبقہ امراء میں کوئی بااثر یا غالب قسم کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ محمد بن تغلق کے بڑی تعداد میں غیر ملکیوں کو حلقہ امراء میں داخل کرلینے اور انہیں "اعزاء" کہنے سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اب بھی ہندوستانیوں پر غیر ملکیوں کو ترجیح دینا برابر جاری تھا۔ انہی غیر ملکی امراء میں سے ایک امیر نے بعد میں دکن میں بہمنی سلطنت قائم کی اور ایک اور امیر نے گجرات میں۔

ہر وقت حرکت یا سفر پر مستعد اشراف کا ایک مرکزی طبقہ، جسے معاوضے کے طور پر

غیر موروثی اقطاع عطا ہوتے تھے، جس کی پشت پر ایک مضبوط اور مسلح سوار فوج رہتی تھی، اور جو مقامی قسم کے ذاتی اغراض مقاصد سے بالکل آزاد ہوتا تھا، یہی مرکزی حلقہ ترک سلطنت کی مرکزیت کا سب سے مضبوط اور قابلِ اعتماد آلۂ کار تھا۔ ریاست درجاتی تقسیم پر مبنی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ معاشرے اور ریاست میں ایک واضح اور پختہ درجہ وار تقسیم موجود تھی۔ امراء تین درجوں میں منقسم تھے۔ خان، ملک اور امیر اور یہی ریاست اور معاشرے کے اعلیٰ ترین زمرے کی تشکیل کرتے تھے۔ یوں علماء اور مشائخ (صوفیاء) کو بھی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

ii- علماء سے رشتہ:

کسی ریاست میں علماء کی حیثیت اور ان کے اختیارات کیا ہوں، اور ریاست کا سیکولر حکمرانوں سے کیا رشتہ ہو؟ یہ مسائل اسلامی دنیا میں متواتر زیر بحث رہے ہیں۔ مکہ میں پہلے چار خلفاء کے بعد روحانی یا مذہبی اور ریاستی یا حکومتی اقتدار کو تقسیم کر دیا گیا تھا، جس کے اثر سے زیادہ تر مذہبی رہنما اور علماء، مکہ (اور مدینہ) میں رہ گئے تھے اور نبوامیہ خلیفہ دمشق منتقل ہو گئے تھے۔ عباسی خلفا، جو خود کو رسول کے خاندان کا بتاتے تھے، ان کے ہاتھوں سیاسی اقتدار کو بغداد منتقل کردیے جانے کے بعد سے یہ کوشش بھی کی گئی کہ روحانی یا مذہبی اور ریاستی یا حکومتی، دونوں سربراہوں کو ایک بار پھر ایک ہی ذات یا مرکز میں مرکوز کر دیا جائے، مگر اس کا حقیقی اثر بہر حال یہ ہوا کہ عام طور پر سیاسی عناصر مذہبی عناصر پر غالب رہنے لگے۔ یہ برائے نام یا محدود سا اتحاد بھی نویں صدی کے آخری حصے میں عباسی خلافت کے ٹوٹنے اور زیادہ تر ترکوں کی آزاد ریاستیں وجود میں آجانے سے ختم ہو گیا۔ ترک جو تازہ تازہ مسلمان ہوئے تھے وہ مذہبی رہنماؤں کا کافی احترام بھی کرتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ اسلام کی تشریح وتفسیر کرنا ان ہی کا کام ہے۔ پھر بھی انہوں نے سیاسی گرفت کو پورے موثر انداز میں اپنے ہی ہاتھوں میں رکھا۔ ان حکمرانوں کا علماء اور چھوٹے موٹے افسروں (نویسندہ۔ کلرک) کے لیے جو حقارت اور توہین آمیز انداز تھا اس کا اندازہ دہلی کے کوتوال، علاء الملک کو علاء الدین خلجی کے دیے ہوئے اس جواب سے بخوبی ہو جاتا ہے جو اس نے علاء الملک کو اس مشورے کے خلاف دیا تھا کہ منگولوں پر سیاسی اور دوسرے قسم کے یعنی مالی دباؤ ڈال کر یہاں سے چلے جانے کے لیے تیار کیا جائے۔ علاء الدین نے اس مشورے کو "تازیبا" کا لفظ

کہہ کر مسترد کیا تھا اور ساتھ ہی اس کی دلیل کو اس تیکھے تبصرے کے ساتھ خارج کیا تھا کہ "تم یہ بات اس لیے کہہ رہے ہو کہ تم نویسندہ ابن نویسندہ (کلرک ابن کلرک) ہو"۔ کسی اور جگہ برنی نے کہا ہے کہ یہ گروہ گھوڑے کے منہ اور دم میں بھی تمیز نہیں کر سکتا۔

ایک دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ ترکوں کی قائم کردہ سلطنت ایک دینی حکومت (تھیوکریسی) تھی کیونکہ اس کی بنیاد مسلم قانون (شرع) پر تھی جس کی صرف علماء ہی تشریح و تفسیر کر سکتے ہیں۔ بہر طور، اس سلسلے میں یہ بات واضح کردینی ضروری ہے کہ 'تھیوکریسی' کی اصطلاح حضرت موسیٰ کے وقت سے لے کر شخصی حکومت یا مطلق العنانیت کے دور تک یہودی مشترک ریاستوں (کامن ویلتھ) کے لیے استعمال ہوئی ہے اور اس سے "براہ راست خدا کے احکامات یا ایک مذہبی زمرے کے احکامات سے چلنے والی حکومت" کا مفہوم لیا جاتا تھا۔ اسی نظریے میں یہ بات بھی مضمر تھی کہ حکومت کرنے والا یہ زمرہ یا گروہ خود باضابطہ اور قانون کے مطابق منظم کیا گیا ہو، جیسا کہ یہودی اور عیسائی حکومتوں میں ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ چونکہ مسلم علماء کے یہاں کلیسا جیسا کوئی منظم ادارہ موجود نہیں ہے، اس لیے مسلمانوں کی کوئی "تھیوکریسی" (مذہبی حکومت) قائم ہی نہیں ہو سکتی۔

اس طرح یہ ساری بحث کچھ مصنوعی سی لگتی ہے کیونکہ اول تو کوئی تھیوکریٹک (مذہبی) حکومت کسی قابلِ ذکر مدت تک کہیں رہی ہی نہیں، اور دوسرے 'تھیوکریٹک ریاست کا جو تصور اوپر بیان کیا گیا ایسا قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان میں کبھی زیر بحث بھی نہیں آیا۔ جو بات یہاں مناسب ہے اور جو اس دور میں زیر بحث بھی آئی وہ یہ ہے کہ کیا ہندوستان میں کوئی خالص اسلامی ریاست قائم کی بھی جاسکتی تھی یا نہیں۔ اور اس کے پس منظر میں وہی مسئلہ یا اختلاف رائے ہے کہ راسخ العقیدہ علماء کی پیش کردہ شروع پر ہندوستان میں کس حد تک عمل کیا جاسکتا تھا۔

اس مسئلے پر خود سلطنت دور میں بھی زبردست بحث ہوئی، پھر اسے مغل دور میں دوبارہ چھیڑا گیا اور یہ برطانوی دور تک بھی جاری رہی اور آخر آج بھی کسی نہ کسی شکل میں نظر آجاتی ہے۔

عام صورتِ حال میں ہندوستان کے سلاطین علماء کے لیے عزت واحترام کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو اس کا پابند نہیں سمجھتے تھے کہ ان مسئلوں میں جن کا تعلق ریاست یا حکومت سے

ہو، علماء سے مشورہ کریں یا ان کے مشورے پر لازمی طور پر عمل کریں۔ چنانچہ التتمش نے رضیہ کو اپنا جانشین مقرر کرتے وقت علماء سے رجوع نہیں کیا تھا۔ بلبن نے اپنے دربار میں کئی قبل اسلام رسوم اور عمل شروع کیے۔ جیسے 'سجدہ' یا 'پابوس' جنہیں علماء غیر اسلامی کہتے تھے۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں قاضی مغیث نے فتویٰ دیا کہ دیوگیر سے لوٹے ہوئے خزانے، بیت المال، یا سرکاری خزانے کی ملکیت ہیں اور سلطان کو ان میں سے صرف اتنا ہی لینے کا حق ہے جتنا کسی عام سپاہی کو ہوتا ہے۔ علاء الدین نے قاضی کے مشورے کو مسترد کر کے کہا:

"حالانکہ میں نے کتاب (قرآن) نہیں پڑھی ہے نہ میں (دینی مسائل کا) عالم ہوں، میں عام مسلمانوں جیسا ایک مسلمان ہوں۔ ایسی بغاوتوں کو کچلنے کے لیے جن میں ہزاروں انسان تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، میں حکومت اور ملک کے عوام کی بھلائی کے خیال سے احکامات صادر کرتا ہوں۔ لوگ ان پر کان نہیں دھرتے اور میرے احکامات کی حکم عدولی اور نافرمانی کرتے ہیں۔ چنانچہ میں سختی یا زیادتی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں اور انہیں تابعدار بناتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ شرع کے مطابق ہے یا مخالف۔ میں حکومت کے لیے جو چیز صحیح اور مناسب سمجھتا ہوں ویسا ہی فرمان جاری کر دیتا ہوں"۔

چونکہ برنی نے علاء الدین خلجی کے پچاس سال بعد یہ بات لکھی تھی تو ممکن ہے علاء الدین خلجی نے بالکل یہی الفاظ نہ کہے ہوں اور یہ وہ تصورات ہوں جنہیں خود برنی نے علاء الدین سے منسوب کیا تھا یا پھر یہ ایک مخصوص صورت حال کے سلسلے میں ادا کیے گئے تھے جب اسے بغاوتوں کے کچلنے کے سلسلے میں کڑی سزائیں دینی تھیں اور اپنے احکامات کے پورا کیے جانے کو یقینی بناتا تھا۔ ان کا مطلب یہ نہیں لیا جا سکتا کہ علاء الدین مستقلاً اور عملاً شرع کے خلاف عمل کرتا تھا۔ برنی اس صورت حال کی وضاحت یا صفائی ان الفاظ میں دیتا ہے۔ "جب اس (علاء الدین) نے بادشاہت حاصل کی تو اسے یقین تھا کہ حکومت اور انتظامیہ شریعت کے قواعد و قوانین سے بالکل آزاد ہیں اور اول الذکر (حکومت و انتظامیہ) کا تعلق بادشاہوں سے ہے اور موخر الذکر کو قاضیوں اور مفتیوں کو سونپ دیا گیا ہے۔"

حکمراں اس مسئلے پر جس طرح سوچتے تھے اور علماء کا جو موقف تھا ان میں اختلاف یا بعد

کوئی علاء الدین کے لیے مخصوص نہیں تھا۔ محمد بن تغلق نے شریعت کی مدد کے لیے کتنے ہی 'ضوابط' فرمانوں کے روپ میں جاری کیے۔ فیروز جیسے راسخ العقیدہ حکمراں نے مجرموں کے ہاتھ، ٹانگ، ناک وغیرہ کاٹنے کی مخالفت کردی جس کے لیے شریعت نے منظوری دی ہے۔

ان تمام حالات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے برنی اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ایک صحیح معنوں میں اسلامی ریاست، جس کی بنیاد خالص عقیدے (دین داری) پر ہو ہندوستان میں قائم ہونا ممکن نہیں ہے۔ جو کچھ ان حالات میں ممکن ہے وہ ایک ایسی اسلامی ریاست ہے جس کی بنیاد دنیاوی معاملات (دنیاداری) پر ہو۔ ایسی ریاست کے سربراہ یا حکمراں کو خدا سے خوف کھانے والا مسلمان ہونا چاہئے۔ اس میں سیدوں، مذہبی علماء اور رہبروں، شیخوں وغیرہ کو احترام اور ملازمتیں دی جانی چاہئیں۔ آس پڑوس کے ہندو راجاؤں اور سرداروں کے خلاف مقدس جنگیں اور فوجی مقابلے (جہاد) جاری رکھنے چاہئیں اور مسلمانوں کو علانیہ یا عام لوگوں کے سامنے شریعت کی خلاف ورزی کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہئے تاکہ ملک سے گناہ، ناپاکی، بے ایمانی، چالبازی اور غلط کاری وغیرہ گھٹتی چلی جائیں۔ برنی نے یہ بھی وضاحت کردی تھی کہ سلطان جو کچھ اپنی نجی زندگی میں، یا کوئی شہری اپنے گھر میں کرتا ہے اس کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس طرح سلطنت دور کی ریاست 'تھیوکریٹک' بھی نہیں تھی نہ نسلی بنیاد پر مبنی (ایتھنوسنٹرک) چونکہ علماء کی بیان کردہ شرع سے اس کا مشکل سے ہی کوئی اہم یا بنیادی قسم کا تعلق تھا۔ یہ رسمی طور پر نام کے لیے اسلامی ضرور تھی مگر سماجی مساوات کے اصول کی بجائے درجہ یا طبقے واریت پر مبنی تھی۔ عملی طور پر کسی عام آدمی۔ ہندو یا مسلمان۔ کی زندگی میں کوئی امتیاز یا فرق نظر نہیں آتا تھا۔ علماء کو عزت واحترام تو دیا جاتا تھا مگر حکومت ان کے مشورے پر نہیں چلتی تھی۔ حکومت سیاسی ضرورت اور حکمراں طبقے کے مفادات کے خیال پر چلتی تھی۔ جیسا ہم دیکھیں گے یہ طریقہ کار کوئی آسان راستہ بھی نہیں تھا اور کبھی کبھی علماء اور سلطان کے درمیان بڑا تیکھا اور سخت اختلاف رائے بھی پیدا ہو جاتا تھا خاص طور پر اس مسئلے پر کہ ہندوؤں کو کتنی مذہبی آزادی دی جائے اور حکومت کے کاروبار میں ان کی کتنی حصہ داری ہونی چاہیئے۔

iii- ہندوؤں کی حیثیت:

جیسا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ان ہندوؤں کو کافی حد تک مگر واضح طور پر بیان کی ہوئی آزادی دینا بھی حکومت نے اپنا فرض قرار دے لیا تھا جنہوں نے مسلمان حکمرانوں کا غلبہ اور تسلط تسلیم کر لیا تھا اور حکمراں کے عاید کردہ قواعد ضوابط کی تابعداری کرنا قبول کر لیا تھا۔ ایسے لوگوں کو 'ذمی' یا زیر تحفظ زمرہ کہا جاتا تھا۔ ذمیوں کو اپنے رسم ورواج کے مطابق عبادت یا پوجا کرنے کی آزادی تھی اور چونکہ "عمارتیں ہمیشہ قائم نہیں رہتیں" اس لیے ان کی دیکھ ریکھ اور مرمت کروانے کی اجازت تھی۔ بہر حال انہیں "اسلام مخالف" نئے مندر بنوانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس قانون میں کسی قدر ابہام موجود تھا کیونکہ ہندوؤں کو اپنے گھروں یا ایسے دیہات میں نئے مندر بنوانے کی اجازت تھی جہاں مسلمان آباد نہ ہوں۔ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے تھے کہ ہندوؤں کی طرف سے مخالفت کی صورت میں پرانے مندر بھی مسمار کیے جا سکتے تھے اور جیسا ہم دیکھ چکے ہیں جنگ کے دوران پرانے پرانے مندروں کو لوٹا بھی گیا اور مسمار بھی کیا گیا۔ بالکل شروع کے دور میں ان میں سے کچھ کو مسجدوں میں بھی تبدیل کیا گیا یا ان کے ملبے کو مسجد کی تعمیر میں استعمال کیا گیا۔ مگر یہ سلسلہ اس وقت رک گیا جب ترک اپنی مسجدیں تعمیر کرنے کی منزل پر پہنچ گئے۔ لیکن علاقائی سرداروں یا پڑوسی حکمرانوں سے جنگ کی صورت میں ان کے مندروں کو تباہ کرنا مذہبی لحاظ سے ثواب کا عمل ہو جاتا تھا۔ بہر طور یہ عمل بھی اس وقت بالکل ختم ہو گیا جب ترک حکمرانی پورے ملک پر قائم ہو گئی۔

حکمراں سے وفاداری اور اس کی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو 'جزیہ' بھی ادا کرنا ہوتا تھا۔ جزیہ کی بنیاد یا ابتداء کا مسئلہ واضح نہیں ہے۔ کچھ محقق اس ٹیکس کو یونان کے 'انتخابی ٹیکس' سے اور اس سے بھی پہلے قبل اسلام کے ایران سے حاصل کیا ہوا بتاتے ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ یہ فوجی خدمات کے بدلے میں عاید کیا جاتا تھا۔ بعض اسے لگان یا خراج کے متوازی مانتے ہیں۔ اس الجھن یا انتشار کو نویں صدی کے آخر اور دسویں کے ابتدائی حصے میں شریعت کے کچھ مکاتیب فکر نے واضح کرنے کی کوشش کی۔ کچھ نے عرب کے بت پرستوں اور رسول اسلام کے دور کی مثال دیتے ہوئے یہ دلیل دی کہ بت پرستوں کے سامنے صرف

یہ سوچنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ترکوں کے پاس جو ہتھیار تھے وہ راجپوتوں سے اعلیٰ تھے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ترک آہنی رکاب کا استعمال کرتے تھے جس کی وجہ سے گھوڑے سے گرے بغیر گھوڑوں پر بیٹھ کر بھی وہ بھالوں کا استعمال تیزی سے کیا کرتے تھے حالانکہ آہنی رکاب جو غالباً چین یا کوریا سے آتی تھی ہندوستان میں آٹھویں صدی سے ہی پھیل چکی تھی۔ بہر حال ہمیں اس کا علم نہیں ہے کہ ان کا استعمال کتنا ہوتا تھا۔ وسطی ایشیا کے گھوڑے ہندوستانی گھوڑوں سے بہتر تھے۔ اسی وجہ سے زمانۂ قدیم سے ہندوستان اور مغربی، وسطی ایشیا کے درمیان بحری اور بری راستوں سے گھوڑوں کی تجارت ہوتی تھی۔ اسلام کے عروج کے بعد گھوڑوں کی تجارت ختم نہیں ہوئی۔ در حقیقت بارہویں صدی میں شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گھوڑوں کی تجارت کرنے والے مسلمان خاندان آباد تھے۔ اسی وجہ سے ہمیں بتایا گیا ہے کہ محمد بن بختیار خلجی سین حکمراں لکشمن سین پر حملہ کرنے سے پہلے ایک گھوڑوں کے تاجر کی حیثیت سے پُرنیا تک پہنچ گیا تھا۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ وہ کون سی وجوہات تھیں جن کی وجہ سے راجپوتوں کو شکست اور ترکوں کو فتح حاصل ہوتی تھی۔ سب سے اہم اور اول وجہ یہ تھی کہ اگرچہ راجپوت فوج انسانی و مادّی وسائل اور جنگی مہارتوں میں کسی سے کم نہیں تھی لیکن وہ تنظیمی امور اور سربراہی میں یقیناً کمتر تھے۔ بڑی بڑی راجپوت فوجیں جنہوں نے ترکوں کا مقابلہ کیا ان کا کوئی ایک سربراہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کی سربراہی وہ ماتحت راجہ کیا کرتے تھے جو انہیں میدانِ جنگ میں لاتے تھے۔ اس طرح ایک بڑی اور ملی جلی فوج کو سنبھالنا مشکل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ راجپوتوں نے سپاہیوں کی حرکت سے زیادہ وزن پر توجہ دی۔ ترکی سپاہی تیزی سے حرکت کرنے کے عادی تھے، تیزی سے آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹنا، گھوڑوں پر سوار رہ کر تیروں سے حملہ کرنا جانتے تھے جبکہ راجپوت فوجیں بھاری بھر کم سازو سامان کے ساتھ آہستہ روی سے حرکت کرتیں۔ ان کے مرکز میں عموماً ہاتھی ہوا کرتے تھے اسی وجہ سے انہیں ترکی پھرتیلے فوجی دستوں سے مات کھانی پڑتی جو ان کے پہلوؤں پر اور عقب سے حملہ کرتے۔ ہاتھی اگرچہ بذاتِ خود شکست کی وجہ نہیں تھے بلکہ اہم یہ تھا کہ ان کا استعمال کس طرح کیا گیا۔ یہ اس وقت موثر ہوتے اور فوج کو استحکام مہیا کرتے جب ان کے ساتھ باصلاحیت اور سبک رفتار فوجی دستہ ہوتا۔ ترک دنیا کے سب سے بہترین گھوڑ سوار سمجھے جاتے تھے اس کے علاوہ وہ ایک

دو صورتیں تھیں۔ اسلام یا موت، کچھ دوسروں نے ایک تیسرا متبادل 'جزیہ' پیش کیا۔ حنفی مسلک نے جسے عام طور پر ہندوستان میں اپنایا گیا، "اسلام موت یا جزیہ" کا فارمولا استعمال کیا۔ ہمیں اس کا علم نہیں ہے کہ جزیے کی مقدار سلطنت دور میں کس طرح متعین کی جاتی تھی اور اسے کس طرح حاصل کیا جاتا تھا۔ برنی کے کچھ بیانات میں یہ بھی ملتا ہے کہ کسانوں کو خراج یا جزیے میں سے کوئی ایک ادا کرنا ہوتا تھا یعنی یہ دونوں ایک ہی سمجھے جاتے تھے اور گاؤوں سے ایک مجموعی رقم کے طور پر حاصل کیے جاتے تھے۔ اس طرح علاء الدین خلجی اور فیروز تک کے عہد میں جو ٹیکس وصول کیے جاتے تھے ان میں جزیہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ قصبات یا شہروں میں یہ کس طرح جمع کیا جاتا تھا اس کی معلومات بھی موجود نہیں ہیں۔ شرعی اعتبار سے عورتیں، بچے، دیوانے اور نادار و مفلس قسم کے لوگ جزیے کی ادائیگی سے مستثنا تھے۔ ان کے بعد حرفہ نگار یا کاریگر اور تاجر باقی بچتے تھے۔ فیروز تغلق کے عہد تک اس سے برہمن بھی مستثنا تھے۔

سلطنت دور میں ٹیکس کے روپ میں جزیہ شہروں کی آبادی کے ایک چھوٹے سے حصے پر عاید ہوتا تھا۔ اس صورت میں اسے اسلام قبول کروانے کا کوئی موثر آلہ کار مشکل سے ہی تصور کیا جاسکتا ہے۔ راسخ العقیدہ علماء کا ایک زمرہ جزیے کو ہندوؤں کو عاجز کرنے، ان کی تحقیر اور تذلیل کا بھی ایک طریقہ مانتا تھا۔ چنانچہ قاضی مغیث اس سلسلے میں اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ اگر جزیہ جمع کرنے والا کارندہ (کلکٹر) جزیہ دینے والے ہندو کے منہ میں تھوکنا چاہے تو اسے اپنا منہ کھول دینا چاہیے۔ یہ انداز منو کی دی ہوئی اس ہدایت کے خطوط پر ہی ہے کہ اگر کوئی شدر ویدوں کو سن لے تو اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دینا چاہیے۔ دونوں باتیں ناقابلِ عمل تھیں مگر ان سے اپنے وقت کی ذہنیت کا ضرور اظہار ہوتا ہے۔

کچھ علماء کا خیال تھا کہ ہندو، جو بت پرست ہیں اور ان کے پاس قرآن جیسی کوئی الہامی کتاب نہیں ہے (اہل کتاب نہیں ہیں) اس لیے انہیں جزیے کا متبادل نہیں دیا جانا چاہیے صرف اسلام یا موت، دو متبادل دیے جاسکتے ہیں۔ اگر برنی کے بیان پر یقین کیا جائے تو یہ صورت التتمش کے سامنے کچھ علماء نے رکھی بھی تھی۔ نظام الملک جنیدی، وزیر سلطنت نے سلطان کی طرف سے جواب دیا کہ ایسی پالیسی روایت کے خلاف ہوگی اسے اسلام کے ہیرو یا غازی محمود نے بھی عاید نہیں

کیا اور یہ ناقابل عمل بھی ہے کیونکہ مسلمان تعداد میں اتنے کم ہیں "جیسے (کھانے) کی قاب میں نمک"۔

برنی کو شاید یہ علم نہیں تھا کہ ترک سلطان صرف سندھ کے عرب حکمرانوں کی روایت پر عمل کر رہے تھے جنہوں نے اپنے علاقے کے ہندوؤں کے سامنے جزیہ کو بھی متبادل کے طور پر رکھا تھا اور اپنے شہری انتظامیہ میں بہت سے ہندوؤں کو ملازم بھی رکھا تھا۔

یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ دہلی سلطنت کی آبادی میں ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت تھی اور پوری سلطنت کے دل، دہلی میں بھی یہی صورت تھی۔ بیرونی اور دیہی علاقوں میں 'خوطوں، مقدموں، چودھریوں، راناؤں، ٹھاکروں، وغیرہ کے روپ میں اب بھی انہی کا غلبہ تھا۔ اسی طرح شہروں کی مالیات کے معاملات، پھر ذرائع آمدورفت (بنجاروں کے روپ میں)، تجارت پر بہت بڑی تعداد میں بھی یہی قابض تھے۔ جیسا کہ علاء الدین نے قاضی مغیث کو بتایا تھا دارالسلطنت سے سو کوس کے علاقے میں 'خوط' اور 'مقدم' بہترین گھوڑوں پر سواری کرتے ہیں، بہترین لباس پہنتے ہیں، ایرانی کمانوں سے تیر اندازی کرتے ہیں، ایک دوسرے سے جنگیں لڑتے ہیں اور شکار پر نکلتے ہیں، دعوتیں دیتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ "'فتاوائے جہاں داری' میں برنی ان کا ذکر کرتے ہوئے اظہار افسوس کرتا ہے۔

"......صرف اس بات کے لحاظ میں کہ یہ ملحد اور کثرت پرست خراج دیتے ہیں اور زیر تحفظ 'لوگ (ذمی) ہیں، ان کافروں کو عزت دی جاتی ہے، امتیازات بخشے جاتے ہیں، ان کی طرف داری کی جاتی ہے اور انہیں اوپر اٹھایا جاتا ہے۔ سلاطین انہیں نوبت و نقارہ، طبل و علم زیورات، کمخواب کی خلعتیں اور مرصع زین سے لیس گھوڑے عطا کرتے ہیں اور گورنر اور دوسرے اعلیٰ عہدوں اور حیثیتوں پر ان کا تقرر کرتے ہیں"۔

یقیناً اس بیان میں مبالغے کا عنصر کافی ہے کیونکہ محمد بن تغلق کے عہد کے علاوہ مشکل سے ہی کسی ہندو کا تقرر کسی اعلیٰ عہدے پر ہوا تھا، مگر ہندوؤں کے ایک طبقے کی مالی خوشحالی کے بارے میں شبہ کرنا مشکل ہے کیونکہ ہمیں خود برنی کے بیان سے ہی پتہ چلتا ہے کہ 'ساہا' (بینک کار) مہتا (انتظامیہ کے کارکن۔ ایڈمنسٹریٹر) اور پنڈت "محلوں جیسے گھر بنواتے ہیں، آرام و آسائش کی

زندگی گزارتے ہیں ۔ وہ مسلمانوں کو اپنے خدمتگاروں میں ملازم رکھتے ہیں اوراسلام کے دارالسلطنت میں انہیں اپنے گھوڑوں کے آگے دوڑاتے ہیں"۔

یقیناًاس خوشحالی کااثرہندوؤں کے ایک چھوٹے سے طبقے تک ہی محدود تھا۔عام لوگوں کی بڑی تعداد۔ہندو مسلمان دونوں-غریب تھے اور حکمراں طبقے کے ظلم وزیادتی کامتواتر شکار رہتے تھے۔

سلطنت نے ایک اوسط ہندو کی روزانہ زندگی پر کتنااثرڈالا تھا،اس سلسلے میں اب بھی اختلاف اور بحث باقی ہے۔ایک خیال یہ ہے کہ اس کی زندگی پر مشکل سے ہی کسی قسم کااثرپڑاتھا کیونکہ جب تک کوئی شخص محصول ادا کرتا رہتا تھا حکومت اس کے ذاتی معاملات میں کسی طرح دخل نہیں دیتی تھی۔ان محصولوں کوگاووں میں ُخوط مقدم،رئیس اور ٹھاکر جمع کرتے تھے۔عام آدمی کوپریشانی کاسامنااس وقت کرناہوتاتھاجب کوئی علاقائی جنگ شروع ہو جائے،قحط پڑجائے یا کوئی علاقائی سردار محصول کی ادائیگی میں تاخیر کردے یاادائیگی روک لے۔ذاتی اور شہری قوانین کے معاملے میں ہندوؤں پران کی ذات برادری کی پنچایتوں،یاگاؤں کے زمیندار یا علاقے کے سردار کی گرفت رہتی تھی۔ قاضی مسلم قوانین اور قضیوں کونپٹاتے تھے یاصرف وہ مقدمہ سنتے تھے جس میں ہندواور مسلمان دونوں ملوث ہوں۔

لیکن مرکزیت پر مبنی ریاست میں حکومت کااثربڑھنالازمی تھاجیساکہ علاءالدین خلجی اور محمد بن تغلق کی شروع کی ہوئی زرعی پالیسیوں سے ظاہر ہوا۔مذہبی معاملات میں کافی حد تک آزادی دی گئی تھی۔ جلال الدین خلجی کا یہ بیان کہ لوگ اس کے محل کے باہر سے گھنٹے بجاتے، شور مچاتے جلوس کی شکل میں اپنی مورتیوں کوجمنا میں نذرِ آب کرنے نکلے،اس آزادی کی مثال ہے۔محمد بن تغلق توہندو تہواروں ہولی وغیرہ میں بھی حصہ بھی لیتاتھااور جوگیوں اور جین سنتوں سے گفتگو بھی کرتا تھا۔بہر حال کسی مطلق العنان ریاست میں اس طرح کی آزادی کومہربانی یاکرم ہی سمجھا جاسکتا ہے اس سے کوئی حق ثابت نہیں ہوتا۔یوں مطلق العنان حکمراں کسی وقت بھی کوئی کام بالکل من مانے انداز میں کرگزرتے تھے،خاص طور پراس صورت میں کہ جب علماء کاایک طبقہ ہندوؤں پر سختی اور دباؤ بنائے رکھنے کی متواتر وکالت کرتا رہتا تھااوراسے جائز قرار دیتا تھا، چنانچہ انہوں نے اس الزام میں کہ ایک برہمن نے ایک مسلمان کا مذہب تبدیل کروایا تھااسے

لوگوں کے سامنے زندہ جلانے اور اس الزام پر کہ دہلی کے ارد گرد نئے مندر تعمیر ہوئے ہیں اور ان کے آس پاس ہونے والے تہواروں میں مسلمان بھی شریک ہو جاتے ہیں کئی مندروں کو مسمار کروا دینے کو جائز قرار دیا تھا۔ شاید ایک واحد موقع، جس میں علماء نے مداخلت کی اور کسی حکمراں کو ہندوؤں کے خلاف اپنی من مانی کرنے سے باز رکھا، اس وقت نظر آتا ہے جب سکندر لودی کو کوروکشیتر کے پرانے مندر اور تالاب کی بے حرمتی کرنے، اسے مسمار کرنے اور یاتریوں پر حملہ کرنے سے باز رکھا، جس کے لیے یہ دلیل دی گئی کہ یہ قدیم زمانے کا مندر ہے اور اس سے پہلے گزرے سلاطین ہندوؤں کو اس میں اشنان کرنے کی اجازت دیتے رہے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ مذہبی رواداری کی روایات اس وقت تک کافی پختگی سے قائم ہو چکی تھیں۔

تمام شرائط اور حد بندیوں کے باوجود یہ ماننا پڑتا ہے کہ سولہویں صدی تک کے یورپ میں غیر عیسائی لوگوں اور خود عیسائیت کے ہی حریف فرقوں کو جتنی آزادی نصیب تھی اس سے زیادہ مذہبی آزادی سلطنت دور میں ریاست اپنی رعایا کو دے دیتی تھی۔ اس دور میں ریاست اس حد تک بنیادی طور پر باقاعدہ اسلامی حکومت تھی جیسی برنی نے وضاحت کی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ مسلمان ایک ترجیحی زمرہ تھے اور حکومت کا یہ خصوصی فرض تھا کہ وہ ان کی اخلاقی اور مادی فلاح و بہبود کا خیال رکھے۔ یہ چیز بھی ہندوستان میں کسی طرح نئی نہیں کہی جا سکتی تھی کیونکہ اس سے پہلے راجپوتوں نے بھی اپنا ایک ترجیحی زمرہ بنا لیا تھا اور برہمنوں کو ملنے والی مراعات کو تو پورا معاشرہ ایک حق کی طرح تسلیم کر چکا تھا۔

iv- جبر و استبداد، لطف و کرم اور ارتقاء:

ریاست کے موضوع پر غور کرتے ہوئے مسلمان سیاسی مفکروں نے ریاست کی طاقت واقتدار کی ماہیت، اس کے جائز مقاصد اور ریاست اور سلطان کو ملے ہوئے حقوق کے اخلاقی جواز پر بھی سوال اٹھائے تھے۔ ان مفکرین نے نراجیت (انارکی) کے مقابلے میں جس میں ملکیت اور عورتوں کی عزت و آبرو کا تحفظ نہیں کیا جا سکتا شخصی حکومت یا مطلق العنانیت (مونارکی) کو ہی ایک واحد علاج یا تحفظ مانا تھا۔ عام طور پر ان مفکرین نے فرد واحد کی حکومت کو ترجیح دی، جو سلطان تھا اور جو کچھ سماجی اور اخلاقی خصوصیات کا حامل ہوتا تھا اور عالی مرتبہ طبقہ رؤساء پر گرفت رکھنے کے

لیے اس کے پاس ایک طرح کا آسمانی اختیار یا فرمان ہوتا تھا۔ مطلق العنانیت اور شخصی جبر واستبداد کے مسئلے نے بھی عہد وسطیٰ کے مفکرین کو کسی قدر الجھن میں ڈالا۔ ضیاء الدین مطلق العنانیت یا شخصی جبر کو بنیادی طور پر غیر اسلامی تصور کرتا تھا اور کسی حکمراں کے ہاتھوں شخصی طاقت کے ناجائز استعمال یا جبر واستبداد کے خلاف صرف مذہب کو ہی ایک کارآمد روک یا بندش مانتا تھا۔ پھر بھی یہ مفکر کسی غیر عادل حکمراں کے خلاف بغاوت کا حق نہیں دیتے، سوائے بہت مخصوص قسم کے حالات کے جیسے علانیہ اور بے روک ٹوک شرع کی خلاف ورزی کرنا۔ برنی نے شخصی جبر کو اس لیے تسلیم کر لیا کہ ہندوستان جیسے حالات میں سنگین سزائیں دینا بالکل ناگزیر تھا۔ برنی خاص طور پر اس کا یقین رکھتا تھا کہ نیچ اور کمینے یا کم اصل لوگ جنہیں وہ "حیوانوں اور شکاری درندوں" سے مشابہہ کرتا تھا۔ "یہاں ان کی ہر طرف بہتات" ہے۔ انہیں سخت ترین سزائیں دینا اور انہیں سختی سے کچل دینا نہ صرف ناگزیر تھا بلکہ اس کی ضرورت بھی تھی۔ اس طرح برنی نے شخصی جبر واستبداد کے لیے ایک جواز تلاش کر لیا تھا۔

سوال یہ تھا کہ ان حالات میں ریاست کا اخلاقی اقتدار کس طرح برقرار رکھا جائے۔ اصل میں عہد وسطیٰ کے مفکروں نے عدل وانصاف کے جس تصور یا نظریے پر زور دیا ہے وہ اسی سلسلے یا ضرورت کے تحت تھا۔ عدل کا مطلب تھا کہ دولت مند اور مفلس میں، رشتے دار اور اجنبی میں، اشراف یا نچلے درجے کے عوام میں کوئی فرق وامتیاز نہ برتا جائے۔ بہت سے مفکروں نے جن میں برنی بھی شامل ہے عدل وانصاف کو مذہبی فرائض کی ادائیگی سے اوپر درجے پر رکھا ہے۔ برنی کے مطابق کسی حکمراں کے لیے عدل وانصاف کا ایک عمل ستر سال کی نمازوں سے افضل ہے۔ بہر طور عدل وانصاف میں ہی موجودہ سماجی نظام یا اس ڈھانچے کو برقرار اور مستحکم رکھنا بھی شامل تھا، جو پوری سختی سے ایک درجے واری تقسیم پر مبنی تھا اور جس میں نچلے درجے کے عوام، غیر اشراف، دستکار، مزدور اور کسان، سب طاقت واقتدار کے حلقے سے باہر رکھے جاتے تھے اور انہیں ایسی حیثیت میں رکھا جاتا تھا کہ یہ ہمیشہ کسی دوسری طاقت پر منحصر رہیں۔

ان تمام چیزوں کے باوجود عدل وانصاف کے اس تصور نے ہی طاقت واقتدار کے من مانے استعمال، خصوصاً امراء اور چھوٹے درجے کے افسروں پر کسی قدر روک یا بندش بھی عاید کی۔

اسے لطف و کرم اور لوگوں کی خدمت اور بھلائی کے جذبات کے ساتھ بھی دیکھا جانا چاہیے۔ صوفی سنتوں، ہندو اور مسلمان دونوں ہی خود اپنی ذات کے لیے بھی اور حکمرانوں کے لیے بھی متواتر اس بات پر زور دیتے رہے۔ کچھ حدود کی پابندی کے ساتھ انہوں نے معاشرے کی درجہ واری تقسیم پر بھی تنقید اور نکتہ چینی کی اور انسانی مساوات کے تصور کو ابھارنے کی کوشش کی۔ اس حد تک وہ عوام کی توقعات اور احساسات کو پہنچانے کا ذریعہ بھی بنے اور اتنی فراخ دلی کے انداز سے عوام کو کچھ ذہنی راحت اور معاشرے میں شدید عدم مساوات سے کسی حد تک فرار کا راستہ بھی فراہم کیا۔ بہر حال جیسا ہم پہلے دیکھ چکے ہیں سیاسی معاملات میں کریم النفسی یا لطف و کرم کا یہ تصور حکمرانوں میں زبانی جمع خرچ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ جلال الدین خلجی کے بعد فیروز تغلق پہلا ایسا ترک سلطان تھا جس نے اس تصور کو خاص طور پر مسلمانوں کی حد تک اپنانے کی کوشش کی بہر طور غیر مسلموں کو اس کیفیت سے پوری طرح خارج بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ مرکزیت اور فوجی طاقت پر اس حد تک مبنی کوئی ریاست جس کے حکمراں طبقے کی سماجی بنیاد بھی بہت چھوٹی یا محدود ہو، کیا ملک کی معاشی اور ثقافتی نشو و نما کا کام موثر انداز میں انجام دے سکتی ہے؟ پچھلے صفحات میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ان تمام حدود اور بندشوں کے باوجود طرز تعمیر، ادب، موسیقی وغیرہ کی نشو و نما بھی ملک میں ہوئی تھی اور اس میں ہندو اور مسلمان دونوں نے حصہ لیا تھا۔ صوفی تصور اور بھگتی تحریک دونوں نے آپسی دشمنی اور دوری کو کم کرنے کی کوشش کی تھی اور ملے جلے آپسی سماجی لین دین کے لیے ایک پلیٹ فارم بھی فراہم کیا تھا۔ معاشی میدان میں، گو کہ محمد اور فیروز تغلق جیسے چند حکمراں ہی زراعت کی توسیع اور ترقی کے لیے کوشاں رہے، لیکن لگان کے انتظامیہ کی مرکزیت نے ریاست کو دیہی زندگی میں موثر انداز میں دخل دینے کا موقع دیا۔ محاصل سے جمع ہوئی فاضل رقمیں بڑی حد تک حکمراں طبقے کے ہاتھوں میں مرکوز ہوئیں، جس کے نتیجے میں دستکاروں اور فنکاروں کو ترقی یافتہ اور بہتر پیداوار کرنے کا موقع ملا اور اس سے شہروں اور شہریت کو بڑھاوا ملا۔ تجارت کے لیے اپنی سرحدوں کے دوسرے ملکوں پر کھل جانے، اسلامی دنیا سے ثقافتی رشتوں کے پھیلنے، سڑکوں سے آمد و رفت میں بہتری پیدا ہونے، چاندی کے ٹنکے کی بنیاد پر ایک مستحکم اور مضبوط کرنسی کی موجودگی، اور

جنوب مشرقی ایشیا اور چین کے ملکوں سے تیزی سے بڑھتی ہوئی بحری تجارت، ان تمام چیزوں نے ایک نئی اور بہتر صورت حال پیدا کر دی۔ اور جیسا کہ جدید محققوں کی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے، جب پندرہویں صدی کے آخر میں پرتگالی بحر ہند میں داخل ہوئے تو انہیں معلوم ہوا کہ اس پورے خطے میں ترقی اور خوشحالی، جس میں ہندوستان ہی بنیادی کردار ادا کر رہا تھا، اس اعلیٰ منزل پر پہنچ چکی ہیں جس کی کوئی اور مثال موجود نہیں ہے۔ مگر اس ترقی اور خوشحالی میں شریک اور ان سے فائدے اٹھانے والے کون سے زمرے اور کون سے عناصر تھے اور جو اس ترقی اور خوشحالی کے دائرے کے باہر چھوڑ دیے گئے تھے وہ کون تھے، یہ وہ سوال ہے جس کا تجزیہ علیحدہ طور پر کرنا ضروری ہے چونکہ اس دور میں جیسا کہ آج بھی موجود ہے خوشحالی اور بھیانک غربت و افلاس ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

اس طرح سلطنت دور نے جسے بعض لوگ 'عہد تاریک' کہتے ہیں، آٹھویں صدی سے بارہویں صدی کے درمیان عرصے میں پیدا ہوئے بے لچک، محدود اور بند معاشی اور سماجی حلقے کو توڑا اور ترقی اور نشو و نما کے لیے نئے حالات پیدا کیے۔ بہر حال، یہ کافی محدود ضرور تھے۔

■■■

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ واساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

اکبر سے اورنگ زیب تک

مصنف:
ڈبلو۔ایچ۔مورلینڈ
مترجم:
جمال محمد صدیقی
صفحات:436
قیمت:-/93روپے

تاریخ جہانگیر

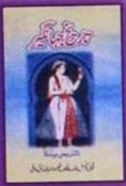

مصنف:
ڈاکٹر بنی پرشاد
مترجم:
رحم علی الہاشمی
صفحات:365
قیمت:-/90روپے

تاریخ شاہجہاں

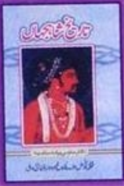

مصنف:
ڈاکٹر بناری پرشاد سکسینہ
مترجم:
ڈاکٹر سید اعجاز حسین
صفحات:466
قیمت:-/109روپے

خلجی خاندان

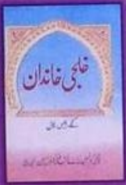

مصنف:
کے۔ایس۔لال
مترجم:
ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
صفحات:416
قیمت:-/88روپے

دربار اکبری

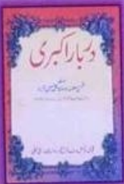

مصنفہ:
شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد
صفحات:927
قیمت:-/154روپے

شیر شاہ اور اس کا عہد

مصنف:
کالکارنجن قانون گو
مترجم:
رام آشرے شرما
صفحات:704
قیمت:-/135روپے

क़ौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066

خاص منصوبے کے مطابق حملہ کرنے کے عادی تھے کیونکہ ترک سلطان بڑی فوج کی تنظیم کے ماہر تھے۔ فوجیوں کو یا تو باقاعدہ تنخواہ دی جاتی تھی یا وہ اقطاع نظام کے تحت تھے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ زیادہ تر ترک سردار غلام ہوا کرتے تھے جن کی پرورش اور جنگی تربیت سلاطین کرتے تھے۔ ایسا خاص طور پر غور کے معز سلطان کیا کرتے تھے۔ حالانکہ ایک ادارے کی حیثیت سے غلامی کو سراہا نہیں جاسکتا لیکن فی الواقع حوالے میں اس نظام سے ترکوں کو باصلاحیت اور وفادار سرداروں کا دستہ دستیاب ہوا۔

اس وقت ہمیں راجپوتوں کے اندرونی انتظام کا علم بہت کم ہے لیکن یہ مان لیا گیا ہے کہ انفرادی طور پر راجپوت حکمرانوں کے پاس تیار فوج میں سپاہیوں کی تعداد مسلسل کم ہوتی گئی۔ اس کو "جاگیرداری نظام" کے فروغ سے بھی جوڑا جاسکتا ہے یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایک ایسے نظام کی ابتدا ہو چکی تھی جس میں انتظامی ذمہ داریاں جس میں زمین کا ٹیکس اور فوج کا انتظام ایسے اشخاص یا گروہ کی ذمہ داری ہوتی تھی جو خاندانی زمیندار ہوتے تھے جنہیں سامنت کہتے تھے۔ ان سامنتوں کو بھی قابو میں رکھنا محال تھا کیونکہ یہ ذرا سا بھی موقع حاصل ہونے پر اپنے آپ کو آزاد حکمراں قرار دے دیتے تھے۔ ترکوں کا سماجی ڈھانچہ مختلف تھا حالانکہ ترکوں میں بھی قبیلوں کی وفاداری کی طرف سے ہمیشہ خطرہ ہی بنا رہتا تھا کیونکہ مقامی حکمرانوں کی مسلسل یہ کوشش رہتی تھی کہ وہ موقع ملتے ہی اپنے آپ کو آزاد حکمراں کی حیثیت دے سکیں۔ اسی طرح غزنوی، غوری، سلجوقی اور خوارزمی جیسی سلطنتیں برسر اقتدار آئیں لیکن جب تک بھی یہ سلطنتیں قائم رہیں یہ راجپوتوں کی بہ نسبت مرکزی نظام حکومت کی طرف زیادہ مائل رہیں یا پھر اقطاع نظام کی وجہ سے بھی ایسا تھا کیونکہ ہر کمانڈر یا امیر جو موروثی نہیں ہوتا تھا اپنی پوزیشن کے لیے سلطان کی مرضی اور خوشنودی کا مرہونِ منت تھا۔

ہمیں یہاں یہ احتیاط برتنی ہے کہ ہم راجپوتوں کے سماجی نظام کی تنقید کا اثر تاریخی فیصلوں پر نہ پڑنے دیں۔ ایک مشہور جدید تاریخ داں نے یہ تجویز کیا ہے کہ ذات پات کے نظام کی وجہ سے اور موروثی جاگیرداری نظام کی وجہ سے ہندوستانی عوام "بیحد لاتعلق" سے ہندوستانی حکمراں طبقوں کا زوال دیکھتے تھے جس کی وجہ سے قصبے پکے ہوئے پھلوں کی طرح گرتے رہے اگرچہ قلعے تھوڑی بہت مزاحمت کرتے بھی تھے لیکن وہ اس صورتِ حال میں اپنے آپ کو بے بس پاتے

جبکہ دشمن پورے علاقے پر قبضہ کیے ہوئے ہوتا۔ اس کی وجہ ہندوستان اور دوسری جگہوں پر عہد وسطیٰ کی سیاست کی نوعیت کی غلط فہمی ہے۔ کے۔ ایس۔ لیمبڈن کے مطابق اس زمانے میں مغربی اور وسطی ایشیا کی ریاستوں میں ”قومیت ایک نامعلوم جذبہ تھا۔ تمام سلاطین اپنے عوام سے یہ توقع کرتے تھے کہ وہ ٹیکس ادا کرتے رہیں اور ان کی خوشحالی کی دعا کریں جبکہ عوام سلطان سے اپنی حفاظت اور انصاف کی ضمانت چاہتے تھے۔ سلطنت ایک عام انسان کی وفاداری کی نہ تو طلب گار تھی اور نہ ہی اسے حاصل تھی۔“ ہندوستان میں حالات تھوڑے سے مختلف تھے۔ وفاداری، ذات، قبیلہ، گاؤں یا شہر، گھربار اور بال بچوں کے تحفظ کے لیے تھی۔ مذہب کے سوال پر ہم بعد میں بحث کریں گے۔ جہاں تک قلعوں یا قلعہ بند شہروں کا تعلق ہے تو ان کی حفاظت بھی گشتی فوج سے جڑی ہوئی تھی۔ یہ راجپوتوں کی کمی تھی جیسا کہ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔

یہ بات قابل بحث ہے کہ مذہب کس حد تک عوام کو جو کہ قبیلوں، برادری، ذات پات اور نسلوں میں بٹے ہوئے تھے ان کے آپسی رشتہ اور حکمراں طبقوں کے ساتھ ان کے رشتہ کو کتنی پائیداری مہیا کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام نے مختلف طبقوں اور جماعتوں کے درمیان ایک مضبوط رشتہ مہیا کیا ہے۔ ان میں ایک مقصد اور جہاد کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ ہندوستان میں ان کے کارناموں میں ان جذبوں کے ساتھ ایک دوسرا جذبہ بھی شدت سے شامل تھا اور وہ تھا لوٹ مار کے ذریعہ دولت حاصل کرنے کا جذبہ۔ اسلام کا مساوات اور بھائی چارہ کا جذبہ یقیناً ایک اہم اور مثبت نکتہ تھا لیکن اس کے دائرے میں پورا سماج نہیں آتا تھا۔ ترکی اور راجپوت سماج دونوں ہی نظامِ مراتب کو مانتے تھے۔ ایک نسلی اور خاندانی مراتب پر قائم تھی تو دوسری برادری کے نظام پر۔ دونوں میں ہی اقتدار صرف چند لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن پھر بھی راجپوتوں کے مقابلے میں ترکوں میں سماج کے دوسرے طبقوں کے درمیان میل جول زیادہ تھا اسی لیے مغربی ایشیا میں غزنویوں کے عروج سے پہلے کچھ عرصے تک صفاری خاندان کی حکومت رہی جس کو ایک لوہار نے قائم کیا تھا۔ ہندوؤں میں چھوت چھات کا تصور اور کچھ خاص لوگوں کا مندروں میں داخلہ ممنوع ہونا ایسی باتیں تھیں جن کا منفی اثر تھا اور یہی ان کی کمزوری کی وجہ تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہندو سماج نے ان برادری سے نکالے ہوئے طبقوں کو ہندو مذہبی اعتقاد میں شامل رکھنے کے

دوسرے طریقے نکال لیے تھے۔ جیسے بہت سے گشتی سادھو اور برہمن ان کی مذہبی رسومات میں شامل ہو جاتے تھے اور ان کی صدارت میں ہی مذہبی رسومات ادا کی جاتی تھیں۔ لیکن یہ طریقہ بھی حکمراں راجپوت طبقہ اور عوام کے درمیانی فاصلہ کو ختم نہیں کر سکا۔

آخر میں راجپوتوں میں جنگی شعور کی کمی کو جس نے انہیں مصالحی حکمت سے اپنے دفاع پر مجبور کیا، جس کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں، جس کی وجہ سے انہیں دوررَس نقصانات کا سامنا کرنا پڑا ہمیں اس وقت کے رائج ثقافتی نظام کے پس منظر میں دیکھنے چاہئیں۔ البرونی، ایک مشہور عالم و دانشور، جس نے ہندوستان میں دس سال گزارے، برہمنوں کے ساتھ رہا، سنسکرت پڑھی اور ہندوستانیوں کی خود پسندی اور علیحدگی کا بغور مطالعہ کیا۔ اس نے لکھا ہے "ہندو سمجھتے ہیں کہ ان کے ملک کے علاوہ کوئی ملک نہیں بجز ان کی قوم کے کوئی قوم نہیں ہے، ان کے جیسے بادشاہ کہیں نہیں ہیں، ان کے جیسا علم کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہ مغرور، خود پسند، بے وقوفی کی حد تک شیخی باز اور بے حس لوگ ہیں۔ ان کے غرور اور خود پسندی کی انتہا یہ ہے کہ اگر آپ انہیں خراسان یا ایران کے علم اور دانش وروں کے بارے میں بتائیں گے تو یہ آپ کو جھوٹا اور جاہل سمجھیں گے۔"

ان کی یہی الگ تھلگ رہنے کی عادت تھی جو ہندوستانیوں کو مغربی اور وسطی ایشیا جانے اور وہاں کے علوم، عوام اور حکومتوں کا علم حاصل کرنے سے روکتی تھی۔ ہمیں ہندوستان کا کوئی البرونی نہیں ملتا جس نے دوسرے علاقوں کا مطالعہ کیا ہو۔ کلی ورج یا ہندوؤں کا ان ممالک کا سفر ممنوع ہونا جہاں مونج کی گھاس نہ اگتی ہو یا نمکین سمندروں کے پانی عبور کرنا ان کی علیحدگی پسند مزاج کے بڑھتے ہوئے رجحان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کشان سلطنت کے بکھرنے اور مغربی وسطی ایشیا میں بدھ مذہب کے تدریجی زوال کی وجہ سے ہندوستان رومانیت کی طرف زیادہ مائل ہوا۔ جنگی شعور کی کمی اور باہری دنیا کی طرف سے نہ صرف لاعلمی بلکہ اسے نظرانداز کرنے کے رویۂ سے دوررَس نتائج برآمد ہوئے جن میں ترکوں کی فتح شاید پہلا نتیجہ تھا جو یقیناً آخری نہیں تھا۔

اس طرح راجپوتوں کی شکست کو طویل مدتی تناظر میں دیکھنا چاہیے اس کی وجہ صرف ان میں جنگی تنظیمی صلاحیتوں کی کمی، سربراہوں کی کمزوری جنگی اصولوں کی ناقص سمجھ ہی نہیں تھی بلکہ اس کی جڑیں اس فرسودہ سماجی ڈھانچہ میں تھیں جس کی وجہ سے ایسے صوبے بنتے چلے گئے جن کا

بنیادی ڈھانچہ ترکوں کے صوبوں کے مقابلے میں نہایت کمزور تھا۔ آخری وجہ راجپوتوں کی علیحدہ رہنے کی عادت تھی جس کی جڑیں ہندوستانی سماج کے ثقافتی نظام میں پیوست تھیں اور جس نے ان میں وہ جنگی شعور نہیں پیدا ہونے دیا جس کی بدولت حربی سوجھ بوجھ اور حکمتِ عملی کے ذریعہ ہندوستان کے قدرتی حفاظتی مقامات سے ممکنہ حملہ آوروں کو دور رکھا جاسکتا تھا۔

■■■

-2-

دہلی سلطنت کے مقامی الحاق کا قیام

(1206-1236)

1206 میں معزالدین محمد کے انتقال کے وقت تک ترکوں نے انفرادی کوششوں کی بدولت اپنی حکمرانی بنگال میں لکھنوتی، راجستھان میں اجمیر اور رنتھمبور اور جنوب میں اجین کی سرحدوں تک اور سندھ میں ملتان اور اوچھ تک قائم کر لی تھی۔ اگرچہ انہیں بہت سی اندرونی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا اور کم وبیش سو سال تک ان کی سلطنت کی توسیع کی۔ ترکوں کو جن اندرونی اور باہری دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ان میں سب سے اہم تو کچھ برطرف کیے گئے حکمراں، خاص طور پر راجستھان اور بندیلکھنڈ اور پڑوسی علاقوں جیسے بیانا اور گوالیار کے راجپوت حکمرانوں کی ان کوششوں کا مقابلہ کرنا تھا جو وہ اپنے مقام کو حاصل کرنے کے لیے کر رہے تھے۔ اگرچہ ان کے ساتھ جدوجہد میں کافی اتار چڑھاؤ بھی رہا جو دونوں اطراف کی طاقت اور اسی کے بکھراؤ پر منحصر رہا۔ راجپوتوں نے کبھی بھی متحد ہو کر ترکوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی گنگا کی وادی یا پنجاب میں ترکوں کے خلاف کسی خاص مہم نے سر ابھارا (سوائے معزالدین کے زمانے میں کوکھروں کے) اس لیے انفرادی طور پر راجپوت حکمرانوں کی ان الگ تھلگ جنگوں کو ترکوں کے خلاف "ہندوؤں کا ردّ عمل" کہنا درست نہیں ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ ترکی امراء کی قبیلہ پسندی سے نبٹنے کے لیے ترکوں کو کافی وقت اور توجہ صرف کرنی پڑی جس کی وجہ سے مرکز پر متواتر وقفہ سے سیاسی استحکام قائم نہ رہ سکا۔ کچھ ترک حکمرانوں نے اپنے لیے ایک آزاد خود مختاری حلقہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح محمد بن بختیار خلجی اور اس کے جانشینوں نے لکھنوتی اور بہار کو دہلی کے اختیار سے باہر رکھنے کی کوشش کی۔ ملتان اور سندھ میں بھی علیحدگی کی زبردست صلاحیت موجود تھی۔ کچھ عرصے کے لیے دہلی اور لاہور کے حکمرانوں کے درمیان اقتدار کے لیے جدوجہد جاری رہی۔ کچھ طاقتور حکام (اقطاع

ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہلِ علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائرکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، حکومتِ ہند، نئی دہلی

داروں) نے بھی دہلی سے مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح علاقائی عوامل نے بھی اپنا اثر دکھایا۔ آخر کار، وسط ایشیا کی سیاست میں اہم تبدیلیاں آئیں جنھوں نے ہندوستان کو متاثر کیا۔ معزالدین کی موت کے بعد ہی غوری حکومت بکھر گئی۔ معزالدین کا چہیتا غلام یلدوز غزنی میں اس کا جانشین بنا جبکہ ایک دوسرے غلام قباچہ نے ملتان اور اوچھ پر قبضہ جمایا۔ قطب الدین ایبک کو جو دہلی میں معزالدین کی قائم مقامی کر رہا تھا، ترکی امراء نے لاہور بلا لیا۔ ایبک نے لاہور کی طرف کوچ کیا اور وہاں تخت نشین ہوا۔ حالانکہ قباچہ اور ایبک دونوں نے ہی یلدوز کی بیٹیوں سے شادی کی تھی پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے رہے خاص طور پر پنجاب پر تسلط قائم کرنے کے لیے۔ ایبک لاہور میں اپنا اثر قائم رکھنے میں کامیاب رہا جسے اس نے اپنا دارالسلطنت بنالیا۔ کچھ عرصے بعد وسط ایشیا کے سب سے زیادہ طاقتور صوبے مَرو کے حکمراں خوارزم شاہ نے غور اور غزنی کو فتح کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ خوارزم غور اور غزنی میں اپنی فتح کو استوار کرتا اور ہندوستان کی سمت کوچ کرنے کا ارادہ کرتا اسے ایک بہت بڑے خطرے کا سامنا کرنا پڑا یعنی منگول کا۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں کہ منگول حکمراں، چنگیز خاں 1218 میں ماوراء النہر اور خراسان میں ابھرا اور وقت کے ساتھ ساتھ منگول حکومت، چین سے وسط یوروپ میں سیکسونی تک پھیل گئی۔ منگولوں نے وسط اور مغربی ایشیا کے ان تمام قصبات اور شہروں کو لوٹ مار کے بعد تباہ کر دیا جنھوں نے ذرا سی بھی مزاحمت کی اور کچھ علاقوں کو تہس نہس کر کے خاک میں ملا دیا اور وہاں کے تمام مردوں کو قتل کر دیا گیا سوائے ہنرمند کاریگروں کے جن کو عورتوں اور بچوں کے ساتھ غلام بنالیا گیا۔ لیکن منگولوں کی فتوحات کے صرف منفی پہلو ہی نہیں ہیں۔ منگول سرپرستی میں وسط اور مغربی ایشیا کی یکجہتی سے تجارت اور تجارتی مال کی آمد و رفت میں اضافہ ہوا اور رفتہ رفتہ شہروں اور شہری زندگی میں جان پڑتی چلی گئی۔ بہر حال یہاں ہماری توجہ صرف دہلی پر منگولوں کے عروج کے اثرات تک ہی محدود رہے گی۔

1218 میں شمالی چین فتح کرنے کے بعد چنگیز خاں خوارزم شاہ کی طرف بڑھا جس نے چنگیز خاں سے تجارت کے لیے حفاظتی فرمان یافتہ مسلمان تاجروں کو موت کے گھاٹ اتار کر اسے ٹھیس پہنچائی تھی۔ خوارزم شاہ کو چنگیز کے بڑھتے ہوئے پیش رو دستہ سے پسپا ہونا پڑا۔ چنگیز کی

خاص فوج کے ہاتھوں شکست کے ڈر سے اس نے ماوراء النہر کو خالی کر دیا اور واپس مغرب کی سمت چلا گیا۔ سمرقند اور بخارا تھوڑی بہت مزاحمت پیش کرنے کے بعد منگولوں کے قبضے میں چلے گئے۔ جن قصبات نے مزاحمت کی ان کا حشر وہی ہوا جو منگولوں کے ہاتھوں ایسے علاقوں کا ہوتا تھا۔ بہر حال شہزادہ جلال الدین منکبرانی خوارزم شاہ کے بیٹے نے غور اور غزنی میں مزاحمت کو جاری رکھا۔ چنگیز نے شہزادہ کا تعاقب کیا اور 1221 میں دریائے سندھ کے کنارے اسے زبردست شکست دی۔ شہزادہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ دریا کے پار فرار ہو گیا۔ چنگیز تین ماہ تک آس پاس کے علاقوں میں گھومتا رہا پھر اس نے خراسان کی فتح کو مکمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد وہ منگولیا چلا گیا اور 1227 میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد منگولوں میں اندرونی تنازعہ بڑھ گیا جس نے ترکوں کو ہندوستان میں اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کا موقع فراہم کیا۔

منگولوں کے عروج اور اچھی تربیت یافتہ غوری فوج کی پشت پناہی اور مدد سے محرومی وہ چند اہم وجوہات تھیں جنھوں نے دہلی کے پہلے ترک حکمرانوں کو اپنی ریاست کی توسیع کرنے کا موقع نہیں دیا۔ دوسری طرف معزالدین کی وفات (1206) کے بعد غور اور غزنی سے ان کا رابطہ قائم ہو جانے کی وجہ سے انہیں وسط ایشیا کی سیاست میں دخل اندازی کرنے سے بچایا اور ہندوستان میں اپنے ذرائع اور کوششوں کی بنیاد پر قدم جمانے میں مدد کی۔ اس طرح ترک حکمراں ہندوستان میں ہی ایک خود مختار ریاست بنانے پر مجبور ہو گئے نوعیت اور ساخت ان کی اپنی ضروریات اور ملک کے مخصوص حالات کے مطابق تھے۔ نتیجہ کے طور پر رفتہ رفتہ شمالی ہندوستان میں ایک نئے سماجی ثقافتی دور کی شروعات ہوئی۔ ملک میں وسیع سیاسی ارتقاء کے مطالعے کے دوران ہم ان پہلوؤں پر توجہ دیں گے۔

(i) قطب الدین ایبک اور التتمش۔ دہلی سلطنت کا قیام:

جیسا کے ہم نے دیکھا قطب الدین ایبک (1206-1210) جو معزالدین کا چہیتا غلام تھا، جس نے ترائن اور اس کے بعد شمالی ہندوستان میں ترکوں کی فتح میں اہم کردار ادا کیا تھا، 1206 میں مقامی امراء اور روساء کی مدد سے لاہور کے تخت پر بیٹھا۔ اگرچہ وہ ہندوستان میں

نمایاں حیثیت رکھتا تھا لیکن اس میں شبہ ہے کہ معزالدین نے اسے کبھی ولی عہد بنانے کا اعلان کیا ہو۔ اس طرح وہ اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے تخت نشین ہوا۔ کچھ عرصے بعد اسے سلطان محمود سے، جسے اپنے والد غیاث الدین کے بعد غور کی جانشینی ملی تھی۔ ایک منشور (جس میں اپنی غلامی سے نجات دی گئی تھی کیونکہ ایک غلام سلطان نہیں ہو سکتا تھا) اور ایک چھتر ملا جس میں اس کی سلطان کی حیثیت کو تسلیم کیا گیا تھا۔ اس طرح ہندوستان میں ترکوں کی فتوحات پر غزنی کے قانونی دعوے کا خاتمہ ہوا۔ جیسا کے ہم دیکھ چکے ہیں کہ غزنی اور وسطی ایشیا کے معاملات سے جلد ہی تعلقات ختم کرنے کے دوررس نتائج رہے۔

ہندوستان میں ترکی فتوحات میں اضافہ کرنے کا ایبک کو مشکل سے ہی وقت ملا کیونکہ وہ 1210 میں ہی چوگان (عہد وسطی کا پولو) کھیلتے ہوئے اپنے گھوڑے سے گر کر ختم ہو گیا۔ لیکن اس کا یہ قلیل وقفہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ ہندوستان میں پہلے آزاد ترکی حکمراں کے عروج کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کے ہم عصر اس کی سخاوت، نیکی اور شجاعت کی تعریف کرتے ہیں۔ اگرچہ اس نے لاکھوں انعامات دیے ہونگے لیکن لاکھوں کو قتل بھی کروایا۔ انصاف کی بنیاد پر سخاوت اور فیاضی اور جنگ کے دوران بے رحمی کا اتصال ہندوستان کے اولین ترک حکمرانوں کا عام رویہ تھا۔

شمس الدین التتمش (36-1210) ایبک کا غلام تھا جو 1210 میں دہلی میں اس کا جانشین بنا۔ اس نے 1236 تک حکومت کی۔ وہ نہ صرف دہلی سلطنت کو قائم رکھنے کا ذمہ دار تھا بلکہ اس نے اسے ایک بہت مربوط و مختصر صوبہ بنادیا تھا۔ اس طرح اسے دہلی سلطنت کا بانی کہا جاسکتا ہے۔

التتمش کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے تو اسے آرام شاہ کی چنوتی کا سامنا کرنا پڑا جسے ترکی امراء نے لاہور میں قائم کیا تھا۔ آرام شاہ بظاہر ایبک کا بیٹا نہیں تھا کیونکہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ایبک کے کوئی بیٹا نہیں تھا بلکہ صرف تین بیٹیاں تھیں جن میں سے دو کی شادی ایک کے بعد ایک قباچہ سے کر دی تھی اور ایک بیٹی کی شادی التتمش سے اس وقت کی تھی جب وہ تخت نشین ہوا تھا۔ آرام شاہ نے دہلی کی سمت کوچ کیا مگر ترائن کی جنگ میں التتمش نے اسے بہت آسانی سے شکست دے دی۔ پھر بھی اس وقت تک التتمش کی حیثیت مستحکم نہیں تھی۔ کچھ ترک

امراء التتمش کے اقتدار کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ دہلی سے باہر چلے گئے اور وہاں سے بغاوت کی تیاری کی۔ التتمش نے دہلی سے کوچ کیا باغیوں کو شکست دی اور زیادہ تر سالاروں کو قتل کر ڈالا۔ ترکی امراء کی طرف سے یہ پہلی مخالفت نہیں تھی جس کا سامنا التتمش کو کرنا پڑا۔ ہم عصر مصنف منہاج سراج کے مطابق "اور کئی موقعوں پر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ترکوں، فوجوں اور اس کے درمیان عداوتیں ابھرتی رہی تھیں" بقول منہاج کے "قدرتی مدد" یا خود اس کے معاملات کے محتاط انتظام کی وجہ سے التتمش ان سب پر فتح حاصل کرتا گیا۔ دہلی اور اس کے ماتحت صوبوں، بنارس، اودھ، بدایوں اور شوالک وغیرہ پر قبضہ جمانے کے بعد التتمش نے اپنے آپ کو عجیب وغریب حالات کے درمیان پایا۔ اس وقت تک ہندوستان میں ترکی حکومت چار حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی: ملتان اور اوچھ اور دریائے سندھ تک ہندوستان قباچہ کے قبضہ میں تھا، لکھنوتی خلجی ملک کے ماتحت تھا، دہلی التتمش کے قبضہ میں اور لاہور جس کے خواہش مند یلدوز، قباچہ اور التتمش تھے حالات کے مطابق کبھی ایک کے تو کبھی دوسرے کے ماتحت رہا۔

(الف) پنجاب اور سندھ:

پنجاب اور سندھ پر اپنا اقتدار جمانے کی جدوجہد میں التتمش نے بڑے صبر، ہوشیاری اور حکمت عملی کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ پنجاب کے لیے جدوجہد میں وہ اس وقت تک بہت قریب سے شامل نہیں ہوا جب تک کہ حالات اس کے موافق نہ ہو گئے سب سے پہلے تو اس نے غزنی میں یلدوز سے دوستی کی اور اس کے ذریعہ بھیجے گئے منشور اور دورباش (دوموہی عصا جو شاہی اقتدار کا مظہر ہوتا ہے) کو قبول کیا اگرچہ اس کا مطلب یلدوز کو اعلیٰ مرتبت قبول کرنا تھا۔ اسی دوران یلدوز اور قباچہ کے درمیان پنجاب پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے زبردست کشمکش جاری تھی جس کا اس وقت ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ 1215 میں خوارزم شاہ کے ذریعہ غزنی سے نکالے جانے کے بعد یلدوز نے قباچہ کو نکال کر لاہور اور پورے پنجاب پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معزالدین کا جانشین بننے کے بعد یلدوز نے نہ صرف پنجاب کا حکمراں ہونے کا دعویٰ کیا بلکہ ہندوستان میں معزالدین کی تمام فتوحات پر مبہم اختیار کا دعویٰ بھی کیا۔ یہ صورتِ حال التتمش کو منظور نہیں تھی جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان رنجشیں بڑھیں اور اس میں

یلدوز کو شکست ہوئی اور وہ قید کر لیا گیا اور بعد میں قتل کروادیا گیا۔ بہر حال پنجاب کا مسئلہ برقرار رہا۔ شروع میں التتمش لاہور کو قباچہ کے حوالے کرنے پر تیار تھا مگر بعد میں دونوں کے درمیان اس کی سرحدوں کے تعین کی وجہ سے نااتفاقی پیدا ہو گئی۔ قباچہ تبرہند اور کوہرام تک اپنے اقتدار کو بڑھانا چاہتا تھا جو التتمش کے خیال سے دہلی میں اس کی حیثیت کے لیے خطرہ پیدا کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے دونوں کے درمیان جو عداوت بڑھی تو قباچہ کو شکست ہوئی اور التتمش لاہور پر قابض ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ التتمش پنجاب میں اپنے اقتدار کو مستحکم کرتا، خوارزم کے شہزادے جلال الدین منکبرنی نے جس کا تعاقب چنگیز خاں کر رہا تھا، 1221 میں دریائے سندھ کو پار کیا اور کھوکھروں کے ساتھ جنگی معاہدہ کر کے تھانیسور تک سے پنجاب پر قابض ہو گیا۔ پھر اس نے التتمش کو پیغام بھیجا کہ وہ منگولوں کے خلاف اس کے ساتھ معاہدہ کرے تاکہ وہ اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کر سکے لیکن التتمش نے نہایت نرمی سے اس پیغام کو رَد کر دیا اور اس کے ساتھ مل کر منگولوں سے جنگ کرنے سے انکار کر دیا۔ تب جلال الدین اس کے خلاف بھی ایک بڑی فوج لے کر آگے بڑھا لیکن وہ التتمش کی فوجوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور اس نے لاہور چھوڑ دیا اور سندھ میں قباچہ کی طرف چلا گیا۔ قباچہ کو اس نے شکستِ فاش دی اور اوچھ پر اقتدار حاصل کر لیا۔ اسی دوران منگولوں نے بھی ملتان کا محاصرہ کر لیا۔

اس طرح ہندوستان میں جلال الدین کے حملہ کی وجہ سے سندھ میں قباچہ کی حیثیت کمزور ہو گئی۔ جلال الدین نے 1224 میں ہندوستان چھوڑ دیا لیکن چنگیز کے خوف سے التتمش نے شمال مغرب میں اپنی پیش قدمی کو روکے رکھا۔ 1228 میں چنگیز کی موت کے بعد ہی اس نے قباچہ سے سندھ حاصل کرنے کا ارادہ کیا اور اوچھ کا محاصرہ کیا۔ تین مہینے کے محاصرے کے بعد ہی اس کو فتح کیا جا سکا۔ قباچہ بکھر کی سمت روانہ ہو گیا اور جب التتمش بکھر کی سمت بڑھا تو قباچہ نے اپنے آپ کو دریائے سندھ میں غرق کر لیا۔

اس طرح 1228 تک نہ صرف التتمش کا اقتدار دریائے سندھ تک بڑھا بلکہ پورا ملتان اور دریائے سندھ کا علاقہ اس کے قبضہ میں آ گیا۔ التتمش کے ذریعہ دہلی سلطنت کے الحاق کا یہ پہلا دور تھا۔

(ب) بہار اور لکھنوتی میں ترکوں کی فتح:

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ معزالدین کے زمانے میں بہار اور لکھنوتی پر خلجی ملک محمد بن بختیار خلجی نے قبضہ کیا تھا۔ ہم عصر تاریخ داں منہاج سراج نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے کہ وہ بہت پر جوش، مہم جو، جری، باعزم، ذہین اور جنگ وجدل کا ماہر تھا۔ خلجی، جنوب مغرب غور کے ایک ترکی قبیلہ کے لوگ تھے۔ بہر حال بختیار ایک بے ہنگم اور بے ڈول شخص تھا اور جس وقت وہ غزنی میں معزالدین کے سامنے ملازمت کے لیے حاضر ہوا تو اسے صرف نچلے درجہ کی ملازمت پیش کی گئی جسے اس نے رَد کر دیا اور دہلی چلا گیا۔ اس نے دہلی میں اپنی خدمات پیش کیں لیکن ایک بار پھر وہ رَد کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے بدایوں کے اقطاع دار (گورنر) کی ماتحتی میں ملازمت کی جس کے پاس جدید مغربی یو۔ پی کے وسیع وعریض علاقے کی نگرانی تھی۔ کچھ عرصے بعد ہی اسے اودھ کے کمانڈر کے ساتھ لگا دیا گیا جس نے اسے بہار کی سرحد پر دو گاؤں کی ذمہ داری دے دی۔ اس طرح اسے بہار اور منیر میں لوٹ مار کرنے کا موقع مل گیا جو گہدوال سلطنت کے گرنے کی وجہ سے لاوارث علاقے رہ گئے تھے اور جن پر زیادہ تر چھوٹے موٹے گہدوال سرداروں کا اقتدار تھا۔ بنگال کے حکمراں رائے لکشمن سینا نے، جو گہدوال کا حریف تھا، اپنے آپ کو بنگال تک ہی محدود رکھا یا تو اس لیے کہ وہ بہت بوڑھا اور کمزور تھا یا وہ اس دھوکے میں تھا کہ وہ مقابلہ پر نہ آئے تو ترک بہار سے ہی مطمئن رہیں گے۔

ایک مہم جو سپاہی کی حیثیت سے بختیار خلجی کی ساکھ دور دور تک پھیل گئی اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے خلجی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ یہاں تک کہ معزالدین نے اسے ایک خلعت بھیجی اور اس کی عزت افزائی کی حالانکہ نہ تو وہ اس کا غلام تھا اور نہ ملازم۔ اب جرأت بڑھنے کے بعد بختیار خلجی نے 200 گھوڑ سواروں کے ساتھ بہار کے قلعے پر حملہ کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بدھ خانقاہ (وہار) تھی۔ یہ غالباً نالندہ کی مشہور درسگاہ تھی۔ اس کے بعد اس نے ایک دوسرے علمی شہر، وکرم شِلا پر قبضہ کیا اور وہاں بہت تباہی مچائی۔ اس نے دارالسلطنت اودندا پور پر بھی قبضہ کیا اور وہاں ایک تاحد تعمیر کر دایا۔ یہ سب 1202 میں واقع ہوا۔ اس فتح کے بعد خلجی بہت مال وزر لے کر واپس لوٹا اور اپنے آپ کو قطب الدین ایبک کے سامنے پیش کر کے عزت افزائی اور اعزاز

حاصل کیے جس میں اس کے ذاتی ملبوسات میں سے ایک خاص لباس اور بہت سے انعامات شامل تھے۔ بختیار خلجی نے انعامات اپنے سپاہیوں میں تقسیم کر دیئے اور خود بہار واپس چلا گیا۔ یہ اس زمانے میں اہم سرداروں اور سلطان کے درمیانی تعلقات کی نوعیت کو ظاہر کرتا ہے۔ سرداروں سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ اپنی مدافعت خود کریں جبکہ ان کی فتوحات سلطان کی فتوحات ہوں گی۔ دوسری طرف سردار جب تک مناسب سمجھتے سلطان کی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے یا وہ خود مختاری کی کوشش کرتے تھے۔ اس طرح سلطنت کا ڈھانچہ ایک حد تک بے لوچ ہی تھا۔

بہار لوٹنے کے بعد بختیار خلجی نے لکشمن سینا کے متعلق معلومات فراہم کرنا شروع کیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ 80 سال کا تھا اور بہت مشہور جنگجو سپاہی تھا۔ منہاج سراج کے مطابق اس نے اپنی رعایا پر کبھی ظلم و ستم نہیں کیا اور بہت فراخدلی سے انہیں انعام و اکرامات دیا کرتا تھا۔ اس خوف سے کہ بہار کے بعد اب بنگال کا نمبر ہے، اور بختیار کی جنگی شجاعت کے ڈر سے جو دور دراز تک پھیلی ہوئی تھی اور بہت سے برہمنوں اور نجومیوں کے مشوروں سے برہمن اور تاجر، سینا کی دارالسلطنت چھوڑ کر مشرق میں نسبتاً پر امن علاقوں میں چلے گئے لیکن ہمیں بتایا گیا ہے کہ لکشمن سینا نے وہیں جمے رہنے کا فیصلہ کیا۔ ہمیں محمد بن بختیار خلجی کی لکھنوتی کی فتح کے لیے ہم عصر ماخذ منہاج سراج پر ہی انحصار کرنا ہو گا جس کی تفصیلات کو بعد کے مصنفوں نے استعمال کیا ہے۔ منہاج کی تحریر سے سب واقف ہیں کہ بختیار نے ایک فوج تیار کی اور سینا کی دارالسلطنت نادیہ کی سمت اتنی تیزی سے بڑھا کہ اس کا ساتھ صرف 18 گھوڑ سوار ہی دے سکے۔ وہ اس طرح آگے بڑھا تھا کہ مقامی لوگوں نے سوچا کہ یہ کوئی تاجروں کا گروہ ہے اور گھوڑوں کی فروخت کے لیے آیا ہے۔ مگر یہ کہ قلعہ پر پہنچ کر اس نے اچانک دھاوا بول دیا اور رائے جس کے لیے یہ سب کچھ اتنا اچانک تھا، وہ پچھلے دروازے سے فرار ہو گیا اور یہ کہ بختیار نے اس کی تمام دولت، بیویوں اور دوسری عورتوں اور کنیزوں وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کی خاص فوج بعد میں پہنچی جس نے تمام شہر اور اس کے راستوں پر ناکہ بندی کر دی۔

منہاج کی اس تحریر کو قبول کرنے میں بہت سی دشواریاں ہیں۔ منہاج کا کہنا ہے کہ نادیہ لکشمن سینا کا دارالسلطنت تھا۔ آثار قدیمہ کے شواہد سے ہم جانتے ہیں کہ سینا کا دارالسلطنت

پہلے بکرام پور تھا (جدید ڈھاکہ کے نزدیک) اور اس کے بعد لکشمن وتی یا لکھنوتی تھا۔ نادیہ ایک بہت چھوٹا سا قصبہ تھا۔ شاید کوئی زیارت یا برہمنی علم کا مرکز ہو سکتا ہے کہ جیسے بہار کے معاملے میں جہاں بختیار نے ایک علمی درسگاہ کو قلعہ سمجھ لیا تھا۔ اس نے زیارت کے مرکز 'نادیہ' کو سینا کا دارالسلطنت سمجھ لیا ہو۔ یہ اس طرح بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سینا کی فوج کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوئی تھی حالانکہ لکشمن سینا ایک مشہور جنگی سپاہی تھا اور جسے ترکی حملے کی پیشن گوئی کی جا چکی تھی(1)۔

اس وقت لکشمن سینا کی نادیہ میں موجودگی کی تصدیق کے لیے ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ایک چھوٹے حفاظتی دستہ کے ساتھ وہاں زیارت کے لیے گیا ہو۔ نادیہ کے بعد بختیار نے لکھنوتی پر قبضہ کیا۔ وہاں اس نے خطبہ پڑھوایا اور معزالدین کے نام کا سکہ جاری کروایا حالانکہ وہ سوائے نام کے، ہر امر میں خود مختار تھا۔ بہار اور بنگال کی فتح بختیار خلجی کی جسارت اور دلیری کی واضح مثال ہے۔ اس نے ہندوستان میں ترک فوجوں کی شہرت میں اضافہ کیا۔ لیکن بختیار خلجی اپنی کامیابی کے بعد زیادہ دن زندہ نہ رہ سکا۔ اگلے سال اس نے تبت اور ترکستان کو حاصل کرنے کے لیے 10,000 (دس ہزار) گھوڑ سواروں کی فوج تیار کروائی۔ ترکوں کو اس علاقے کے جغرافیہ کا صرف مبہم سا ہی اندازہ تھا۔ بختیار کا بظاہر یہ یقین تھا کہ تبت اور ترکستان بس پہاڑ کے پیچھے ہی ہیں اور یہ کہ اگر وہ ترکستان تک سیدھا پہنچ جائے تو وہ اس سے فوجی امداد لے سکتا ہے اور اپنے آپ کو آزاد حکمراں کی حیثیت سے قائم کر سکتا ہے۔ اس لیے اس مہم کو ابتدا سے ہی ناکام ہونا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ بختیار کبھی آسام سے آگے گیا ہی نہیں۔ ماگھ حکمرانوں نے اسے دریائے باگمتی کے پتھر کے پل کو پار کر کے جہاں تک وہ جا سکتا تھا، جانے دیا۔ یہ دیکھ کر کہ اب وہ اور آگے نہیں بڑھ سکتا، بختیار نے واپس لوٹنا چاہا تو اس نے دیکھا کہ پل کو تباہ کر دیا گیا ہے۔ ایک بہت بڑی مخالف فوج اور دریا کے درمیان گھر کر بختیار تیزی سے دریا کی سمت بڑھا لیکن دریا بہت گہرا تھا اور اسے عبور کرنا مشکل تھا۔ بہت سے سپاہی اس میں ڈوب گئے، خود بختیار 100 سپاہیوں کے ساتھ فرار

---

(1) یہ ممکن ہے کہ منہاج کو نادیہ اور لکھنوتی میں مغالطہ رہا ہو جو سینا کا دارالسلطنت تھا اور جسے بعد میں بختیار نے فتح کیا تھا پھر وہاں لڑائی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے سینا نے ترکی حملہ کے مدِ نظر شہر کو خالی کر دیا ہو۔ سینا اگلے پچاس سال تک جنوبی بنگال پر اپنے دارالسلطنت سونار گاؤں سے حکومت کرتے رہے جو قدیم گوڑ سے قریب ہے۔

ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

ترک فوجوں کا یہ سب سے المناک سانحہ تھا۔ بختیار کی ہمت جواب دے چکی تھی اور وہ بیمار ہو گیا جہاں اس کے ہی ایک امیر مردان خاں نے اسے سوتے میں ہلاک کر دیا۔ یہ واقعہ 1205 کا ہے۔

بنگال کے دہلی سے تعلقات:

علی مردان کو محمد بختیار کے وفادار امیروں نے باہر نکال دیا اور اسے قید کر لیا گیا لیکن وہ فرار ہو گیا اور کئی معرکے کرنے کے بعد وہ قطب الدین ایبک کے دربار میں پیش ہوا جس نے اس کی عزت افزائی کی اور اسے لکھنوتی کا علاقہ دے دیا۔ معزالدین اور اس کے جانشینوں کی بہت زیادہ شہرت تھی، لکھنوتی کے خلجی امراء نے علی مردان کی اطاعت قبول کر لی جس نے پورے بنگال کو اپنا ماتحت بنالیا۔

جب ایبک کا انتقال ہوا تو جاہ طلب امراء جیسے سندھ میں قباچہ نے خود مختاری کا اعلان کیا، علی مردان نے صوبے کے چھتر پر اختیار جمایا اور اس کے نام سے خطبہ پڑھا گیا۔ حالانکہ وہ ایک جابر فرماں رواں ثابت ہوا اور جلد ہی ایک خلجی امیر عواض کے ذریعہ برطرف کر دیا گیا جس نے سلطان غیاث الدین کے خطاب سے تخت سنبھالا۔ منہاج کے مطابق غیاث الدین خلجی ایک قابل، عادل اور رحم دل فرماں روا تھا۔ اس کی ماتحتی میں اس علاقے نے بہت ترقی کی اور اس نے بہت سے ایسے کام کیے جن سے عوام کو بہت فائدہ پہنچا۔ شمال مغرب میں التمش کی مصروفیات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے اقتدار کا دائرہ بہار تک وسیع کر لیا۔ وہ بہت سے پڑوسی حکمرانوں سے جبراً خراج وصول کرنے لگا۔

ایسا لگتا ہے کہ التمش کے مِلک اور عواض کے درمیان بہار پر قبضہ کے لیے بہت سی جھڑپیں ہوئی۔ یہ کاشی اور مگدھ کے حکمرانوں کے درمیان قدیم لشکر کشی کی جدوجہد کے مظاہرے کا دہرایا جانا تھا۔ 1225 میں جب شمال مغرب میں حالات کسی حد تک قابو میں آئے تو التمش نے عواض کی سرکوبی کا قصد کیا۔ دونوں کے درمیان ایک طرح کا معاہدہ ہو گیا جہاں عواض نے التمش کی محدود فرماں روائی کو قبول کیا اور بہت زیادہ تاوانِ جنگ پیش کیا۔ التمش نے بہار اپنے ہی دو امیروں کے سپرد کر دیا لیکن جیسے ہی التمش واپس ہوا عواض نے اس کی فرماں روائی کو رَدّ کر دیا۔

اوراس کے دونوں امیروں کو بہار سے نکال دیا۔ التتمش نے اپنے بیٹے ناصر الدین محمود سے جو اودھ کا گورنر تھا، حالات پر نظر رکھنے کے لیے کہا۔ دو سال بعد عواض کامروپ (آسام) اور بنگ (مشرقی بنگال) کی تنظیمی جدوجہد میں مصروف تھا اور لکھنوتی غیر محفوظ تھا، ناصر الدین نے اچانک ایک قدم اٹھایا اور لکھنوتی پر قابض ہو گیا۔ عواض واپس آیا اور جنگ کی جس میں اس کو شکست ہوئی وہ گرفتار کیا گیا اور پھر اسے قتل کروادیا گیا۔ ناصر الدین لکھنوتی پر قابض رہا لیکن کچھ عرصے بعد ہی اس کی موت واقع ہو گئی اور خلجیوں نے ایک بار پھر دہلی کا جوا اتار پھینکا۔

1230 میں التتمش نے دوسری فوجی تنظیم شروع کی جس کے بعد لکھنوتی اس کے قبضہ میں آگیا۔ لیکن بنگال ہمیشہ ہی ایک مسئلہ بنا رہا اور وہ مرکز میں ذرا بھی کمزوری کو دیکھتے تو فوراً ہی دہلی سلطنت سے تابعداری کو ختم کر دیتے تھے۔

(ii) اندرونی بغاوت، رنتھمبور اور گوالیار کی فتح اور بندیلکھنڈ اور مالوہ پر یورش:

ایک طویل حکمرانی کے دوران التتمش کو بہت سی اندرونی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ قنوج سے بے دخل کیے گئے گہد والوں نے دوبارہ قنوج اور بدایوں کو حاصل کیا اور بنارس میں بھی بغاوت ہوئی، ان سے نپٹا گیا لیکن کٹیہار (جدید روہیلکھنڈ) کے راجپوت اس علاقے کے لیے مسلسل خطرہ بنے رہے۔ کٹیہار پر حملہ کیا گیا اور التتمش نے شوالک تک اس پورے علاقے کو صاف کر لیا۔ دو آب اور اودھ کے علاقوں میں بھی ہندو سرداروں کی طرف سے مخالفت ہوتی رہی۔ یہ علاقے جو اس وقت گھنے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے تھے، کئی صدیوں تک باہر والوں کے لیے پریشانی کا باعث بنے رہے۔

بہار اور بنگال کے معاملات کو طے کرنے کے بعد التتمش نے اپنی توجہ بیانہ اور گوالیار جیسے چند قلعوں کو واپس حاصل کرنے کی طرف مبذول کرلی، جو ایبک کی موت کے بعد پیدا ہونے والی افراتفری میں راجپوت راجاؤں نے واپس لے لیے تھے۔ پہلے التتمش نے محاصرہ کر کے پرتھوی راج کے چوہان جانشینوں سے رنتھمبور قلعہ کو فتح کیا۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی کیونکہ رنتھمبور کا قلعہ ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا اور اس سے پہلے کئی حملہ آوروں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ چونکہ موثر نگرانی کے لیے وہ دہلی سے کافی دور تھا اس لیے کچھ عرصے بعد چوہانوں کو جاگیر کی

فہرست

دیباچہ

-1 دسویں اور بارہویں صدی کے دوران مغربی اور وسطی ایشیا اور ہندوستان کی سمت ترکوں کی پیش رفت 13-39

(i) مغربی اور وسطی ایشیا میں رفتار زمانہ

(ii) ہندوستان کی سمت ترکوں کی پیش قدمی اور ہندو شاہی

(iii) شمالی ہندوستان میں راجپوت حکومت (دس سے بارہویں صدی عیسوی) اور غزنوی

(iv) غوریوں کا عروج اور ہندوستان میں پیش قدمی ترائن کی جنگ۔ گنگا کی بالائی میں ترکوں کا پھیلاؤ معزالدین محمد اور محمود غزنوی

(v) راجپوتوں کی شکست کی وجوہات

-2 دہلی سلطنت کے مقامی الحاق کا قیام (1206-1236) 40-52

(i) قطب الدین ایبک اور التتمش دہلی سلطنت کا قیام (الف) پنجاب اور سندھ (ب) بہار اور لکھنوتی میں ترکوں کی فتح

(ii) اندرونی بغاوت، رنتھمبور اور گوالیار کی فتح، بندیلکھنڈ اور مالوا پر یورش

(iii) التتمش کا بحیثیت حکمراں ایک جائزہ

حیثیت سے واپس کر دیا گیا۔ اجمیر پر ترکوں کا ہی تسلط رہا۔ اس کے بعد التتمش نے بیانہ پر قبضہ کیا اور گوالیار کا محاصرہ کیا۔ گوالیار کے پار امار حکمراں نے ایک سال تک مزاحمت کی لیکن اس کے بعد وہ قلعہ خالی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ گوالیار کو بندیلکھنڈ اور مالوہ پر لوٹ مار اور غارتگری کے لیے چھاپہ مارنے کا بنیادی مقام بنایا گیا۔ گوالیار کے ترک گورنر نے چندیری اور کالنجر پر حملہ کیا لیکن وہ بہت مشکل سے وہاں سے فرار ہو سکا۔ لوٹ مار کے سازوسامان سے لدا پھندا جب وہ واپس لوٹا تو اس پر راجپوتوں نے حملہ کر دیا تھا۔

کچھ ہی پہلے التتمش نے مالوہ میں بھلسا اور اجیّن پر چھاپہ مارا تھا۔ اجین میں مہاکالی کا مندر تباہ کر دیا گیا اور لوٹ میں بہت مال وزر ہاتھ آیا۔ لیکن ترکی تسلط کو دوسرے علاقوں میں وسعت دینے کی بہت کم کوشش کی گئی۔

(iii) التتمش کا بحیثیت حکمراں ایک جائزہ:

معزالدین کے ذریعہ تشکیل کی گئی دہلی سلطنت کی مقامی سالمیت کو، جس کے بکھرنے کا خطرہ تھا، التتمش نے دوبارہ قائم کیا۔ اس نے یلدوز اور قباچہ جیسے جاہ طلب مخالفوں کی کوششوں کو ناکام کیا جو سلطنت کو تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ اس دوران اس نے بہت سمجھداری، صبر و تحمل اور دور اندیشی سے کام لیا۔ اس لیے وہ اپنے کو ٹالتا رہا جب تک کہ وہ اس مقام تک نہیں پہنچ گیا جہاں کوئی فیصلہ کن عمل کر سکے۔ قباچہ اور جلال الدین منکبرنی کے ساتھ معاملات میں اس کی اس خوبی کا اظہار ہوتا ہے۔ اپنے دور کے ابتدا ہی میں اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس کی پالیسی بجائے تیزی سے وسعت کرنے کے مستحکم الحاق کی ہونی چاہیے۔ وہ لکھنوتی کے خلجی ملک کے خلاف صرف اس وقت ہی بڑھا جب کہ اس نے شمال مغرب میں اپنے مقام کو مستحکم کر لیا۔

التتمش کی سربراہی میں ہی دہلی صحیح معنوں میں ایک آزاد ریاست کہی جا سکتی ہے جو غور یا غزنی میں رہنے والی کسی بیرونی طاقت کی ماتحتی میں نہیں تھی۔ ایک آزاد حکمراں کی حیثیت سے التتمش کی قانونی حیثیت مسلمانوں کی نظر میں اس وقت معتبر ہوئی جب 1229 میں بغداد کے خلیفہ کا ایک سفیر التتمش کی مسند نشینی کا خط لے کر دہلی پہنچا۔ اگرچہ یہ صرف ایک رسم ہی تھی جو کہ مسلم حقیقت کے اعلان کے لیے تھی پھر بھی التتمش نے اس آمد پر ایک بڑا جشن منایا۔

دہلی کو ہندوستان میں ترکی حکومت کا سیاسی، انتظامی اور ثقافتی مرکز بنانے کا سہرا التتمش کے سر ہی ہے۔ دہلی میں اس کی مستقل موجودگی اس کی ایک بڑی وجہ ہے اور یہ حقیقت بھی کہ منگول غارت گری کے خوف سے وسطی ایشیا سے اپنا وطن چھوڑ کر آئے ہوئے امیروں، افسروں، عالموں، شاعروں اور مذہبی رہنماؤں کے لیے دہلی ایک مرکز بن چکی تھی۔ نئی عمارتیں بنوا کر التتمش نے دہلی کو ایک خوبصورت شہر بنا دیا۔ ان میں سب سے نمایاں مثال یہ مینار تھا جسے بعد میں قطب مینار کہا جانے لگا جسے قطب الدین نے شروع کروایا تھا اور التتمش نے مکمل کروایا۔ بہت جلد اس کے اطراف ایک خوبصورت شہر آباد ہو گیا۔ قطب مینار کے جنوب میں حوض شمسی اور اس سے متصل ایک مدرسہ (کالج یا یونی ورسٹی) اسی نے تعمیر کروایا تھا۔ التتمش صرف دینی عالموں اور شاعروں کا ہی سرپرست نہیں تھا بلکہ وہ اپنے زمانے کے صوفی سنتوں جیسے قطب الدین بختیار کاکی کا بھی بڑا قدر دان تھا اور ان کا بہت احترام کرتا تھا۔

اس کی شجاعت، خوش اخلاقی اور سخاوت کی وجہ سے دہلی کے باشندوں کے دلوں میں اس کا بہت احترام اور اس کے خاندان کے افراد سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا جس کے نتیجہ میں انھوں نے اس کی اولاد کے جانشینی کے حق کو قبول کر لیا اس طرح اس نے دہلی میں خاندانی بادشاہت کی بنیاد ڈالی۔ حالانکہ اس کی اولاد کو کامیابی نہیں ملی کیونکہ التتمش ایک پیوستہ اور مربوط ریاست بنانے میں ناکام رہا تھا۔ ریاست کا ڈھانچہ ابھی بھی کمزور تھا جس میں ترکی امراء اور غلام افسروں کے درمیان اندرونی حسد اور عداوت کو ایک قابل حکمراں قابو میں رکھ سکتا تھا۔

■■■

-3-

مرکزی سلطنت کے قیام کے لیے جدوجہد

(1236-1290)

(i) رضیہ اور غیر مستحکم دور (1236-1246)

التمش کے انتقال کے کے بعد دس سال کا دور دہلی میں سیاسی طور پر غیر مستحکم دور تھا۔ اس زمانے میں التمش کے خاندان کے چار افراد تخت پر بٹھائے گئے اور پھر ان کو قتل کروادیا گیا اس کی اصل وجہ ترکی امراء کا سخت گروہی رویہ تھا۔ جیسا کے ہم نے دیکھا ہے کے ترک قبائل میں بٹے ہوئے تھے اور ان میں سے کچھ مسلمان ہو گئے تھے اور کچھ نہیں ہوئے تھے۔ ان کے درمیان سخت جدوجہد تھی مثال کے طور پر معزالدین اور ماوراءالنہر میں رہنے والے غز ترکی قبیلے جو ابھی غیر مسلم تھے یہاں تک کے جو ترکی قبائلی گردہ مسلمان ہو گئے تھے وہ بھی آپس میں لڑتے رہتے تھے۔

التمش کے امراء میں ترکوں کے علاوہ دوسرا اہم نسلی گروپ تاجیکوں کا تھا۔ یہ تاجیک ایران، ماوراءالنہر اور خراسان کے علاقوں کے رہنے والے تھے۔ ترکوں کے آنے سے پہلے ایرانی یہاں بسے اور اس علاقے پر تسلط جمالیا پھر ترکوں نے انہیں اس علاقے سے نکال دیا۔ اگرچہ ترک جنگجو تھے لیکن وہ انتظامی معاملات سے کم واقفیت رکھتے تھے۔ یہ تاجیک ہی تھے جن میں زیادہ تر زمیندار تھے جنھوں نے زیادہ تر انتظام کے معاملات کو سنبھالا۔ اسی دوران ان میں سے بہت سے لوگ بڑے عہدوں تک پہنچ گئے۔ نظام الملک جنیدی جو التمش کا وزیر تھا، وہ بھی تاجیک تھا۔ ترکی امراء جن میں غلام اور آزاد دونوں شامل تھے ان کو اس پر اعتراض تھا اور وہ ان کو نولیسندہ یا حکام ہی سمجھتے تھے اور ان کو سپاہی ماننے پر تیار نہ تھے حالانکہ جب سے ترک خراسان اور اس کے آس پاس کے علاقوں (ایران، غور، غزنی وغیرہ) میں قیام پذیر ہوئے تو ان کا قبائلی نظام کافی ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن پرانے قبائلی تعلقات اور ذاتی رشتے ابھی تک مضبوط تھے۔ اس میں سب سے مضبوط رشتہ

غلامی کا تھا۔ جیسا کے ہم نے دیکھا بہت سے سلاطین نے ترکی غلاموں کو صرف اس خیال سے خریدا کہ وہ انہیں سپاہی یا حکام بنائیں گے۔ایسے غلاموں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا گیا اور پھر ان کی تربیت سلاطین کے بیٹوں کے ساتھ کی گئی۔ التتمش کے غلام حکام جو اپنے منتخب اور اہم گروہ ہونے پر گھمنڈ کرتے تھے' آزاد امراء کو جن میں ترک و تاجیک شامل تھے اپنے برابر شمار نہیں کرتے تھے۔ بعد کے مورخ ضیاء الدین برنی ان غلاموں کو چہلگانی کے نام سے پکارتے تھے۔ چالیس کی تعداد کا کوئی مقصد نہیں اس لئے ان میں سے صرف پچیس (25) کی شناخت کرپاتے ہیں جو التتمش کے امراء کی فہرست میں ہیں۔

شاید معاملات بہتر طریقہ سے عمل میں آتے اگر یہ چالیس کی جماعت ایک گروپ کی حیثیت میں یکجا رہتی لیکن جیسا کہ برنی کا کہنا ہے "ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے سامنے نہیں جھکتا تھا اور اقطاع' فوج' شعبوں اور اعزازات کی تقسیم میں یہ مساوات کے حامی تھے" تاریخ وسطی کے ایک رومانی کردار' رضیہ (1236-1240) کے عروج وزوال کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے -وہ ترک غلام حکاموں کی ایک مضبوط جماعت کی مدد سے تخت پر بیٹھی تھی جو بدایوں، ملتان، ہانسی اور لاہور کے اقطاع دار تھے جنھوں نے رکن الدین ابن التتمش کے خلاف بغاوت کی تھی جو تخت سلطنت پر اپنے باپ التتمش کے انتقال کے بعد بیٹھا تھا۔ نظام الملک جنیدی جو التتمش کا وزیر تھا وہ بھی باغیوں کے ساتھ ہو گیا۔ رکن الدین اس لئے بدنام ہو گیا کہ اس نے اپنے آپ کو عیش و عشرت میں ڈبو دیا اور حکومت کے تمام کام اپنی ماں شاہ ترکان کے سپرد کر دیئے جو کہ ایک ترکی ملازمہ رہ چکی تھی۔ سلطان کے حرم کی صدر اور اس کی منتظم ہونے کی وجہ سے اب اس نے ان لوگوں کے ساتھ انتقامی کارروائی شروع کردی جنھوں نے اسے پہلے گری ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔ جب رکن الدین دہلی سے باہر باغیوں کی سرکوبی کے لئے گیا ہوا تھا تو رضیہ نے اس موقع کا پورا فائدہ اٹھایا اور جامع مسجد جاکر دہلی کے لوگوں سے اس کا ساتھ دینے کی اپیل یہ کہتے ہوئے کی کہ اس کو قتل کرنے کی سازش چل رہی ہے اس طرح اپنے حق کے لئے اسے عام بغاوت برپا کروانے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

رضیہ نے اپنے حق کو اس طرح مضبوط کیا کہ التتمش نے اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹوں

کے مقابلے میں اس کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ یہ عجیب زمانہ تھا کہ التمش نے یہ فیصلہ لینے سے پہلے علماء سے مشورہ نہیں کیا تھا بلکہ فیصلہ کرنے کے بعد انہیں بتایا گیا تھا تا کہ وہ پھر اس پر کچھ نہ کر سکیں۔ اس کے بعد کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے ترکی فرماں روایوں نے کچھ فیصلے سیاسی حالات کے تحت کر لیئے اور اس کے بعد علماء سے مشورہ کیا۔ بہر حال ترکی امراء معہ وزیر نظام الملک جنیدی نے التمش کی اس نامزدگی کو نہیں مانا اور اس کے بڑے بیٹے رکن الدین کا ساتھ دیا۔

اگرچہ رضیہ کو تخت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی لیکن ایسا لگتا ہے کہ اسے ترکی امراء کے کسی طاقت ور گروہ کی ٹھوس حمایت حاصل نہیں تھی بلکہ وہ اپنی سیاسی سوجھ بوجھ سے اپنے مخالفین کو تقسیم رکھ کر ہی اپنے مقام پر قائم رہی۔ لہذا پہلے تو امراء کے طاقتور گروہ نے، جو کے ملتان، لاہور، ہانسی اور بدایوں کے گورنر تھے جن میں نظام الملک بھی شامل تھا، اس کی مخالفت کی لیکن اس نے اہم مخالف لیڈروں کو اپنے ساتھ ملالیا جس کے نتیجہ میں نظام الملک جنیدی تنہا رہ گیا اور اس کو فرار ہونا پڑا۔ تخت پر پورا تسلط ہونے کے بعد رضیہ نے انتظامیہ میں پھیر بدل کرنا شروع کیا۔ منہاج کے مطابق "سلطنت میں سکون قائم ہو گیا اور سلطنت کی قوت دور تک قائم ہو گئی۔ لکھنوتی کے علاقے سے دیبل تک تمام مِلک اور امیروں نے اس کی اطاعت و فرمانبرداری قبول کر لی"۔ انتظامیہ سے براہ راست رشتہ قائم کرنے کے لیے اس نے اپنا نسوانی لباس اتار کر مردانہ لباس ملبوس کیا۔ اس نے نقاب چھوڑ دی۔ دربار میں بذاتِ خود آئی اور کھلے چہرے کے ساتھ ہاتھی کی سواری کرتی تا کہ لوگ اس کو دیکھ سکیں۔

اس کے اس رویہ سے تنگ نظر حلقوں میں سرگوشیاں ہوئی ہوں گی لیکن اس کی عام مخالفت نہیں ہوئی کیونکہ اسے دہلی کے لوگوں کی حمایت حاصل تھی لیکن جلد ہی دہلی اور صوبوں کے امراء کے ایک حلقہ میں اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ اس مخالفت کی وجہ جیسا کے ہم کو بتایا گیا ہے، یہ تھی کہ اس نے ایک حبشی ملک یاقوت کو امیر آخور یا داروغہ اصطبل تعینات کیا تھا۔ یہ عہدہ جس کا کنٹرول شاہی اصطبل معہ ہاتھیوں اور گھوڑوں کے تھا، بہت اہم عہدہ تھا اور اس کا عہدہ دار بھی سلطان کے کافی قریب سمجھا جاتا تھا لہذا اس پر ترکی امراء سخت ناراض ہوئے کیونکہ وہ حکومت کے تمام عہدے قبضہ و اختیار میں رکھنا چاہتے تھے۔ ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ یہ رضیہ کی کوئی پالیسی

تھی کہ وہ غیر ترکی امراء کا ایک گروہ بنانا چاہتی تھی تاکہ ترکی امراء کی طاقت کو کم کیا جاسکے۔ نہ ایسی کوئی وجہ سامنے ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ رضیہ اور ملک یاقوت کے درمیان کوئی ذاتی قربت تھی۔ یہ الزام بھی کہ یاقوت رضیہ کو اپنے ہاتھوں سے گھوڑے پر سوار کرتا تھا بعد کی من گھڑت داستان لگتی ہے۔ اس لیے کہ اس دور کے ماخذ میں ایسا کوئی بیان نہیں ملتا۔ رضیہ جب بھی عوام کے سامنے جاتی وہ ہاتھی پر ہی سوار ہوتی تھی گھوڑے پر نہیں۔

بظاہر یہ رضیہ کی ثابت قدمی اور طاقت کے استعمال کی خواہش ہی تھی جو اس کے اور ترکی امراء کے درمیان اختلاف کا باعث بنی۔ اس کے خلاف پہلی بغاوت لاہور کے گورنر کبیر خاں نے کی۔ رضیہ لاہور گئی اور کبیر خاں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی اطاعت قبول کرے۔ اس کے بعد اس نے اس کو لاہور کی جگہ ملتان کا اقطاع دار مقرر کر دیا۔ وہ دہلی پہنچی ہی تھی کہ تبرہند کے گورنر التونیہ نے بغاوت کر دی۔

کبیر خاں اور التونیہ، دونوں کو ہی رضیہ نے کافی نوازا تھا لہٰذا ان کی طرف سے مخالفت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ وہ التونیہ کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلی لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ دہلی میں ترکی امراء کے ایک طاقت ور گروہ کے ساتھ مل گیا ہے جو اسے راستہ سے ہٹا کر اقتدار تک پہنچنے کے لیے اپنا راستہ صاف کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا جب رضیہ تبرہند پہنچی تو ترکی امراء نے بغاوت کر دی۔ یاقوت کو قتل کر دیا اور رضیہ کو تبرہند میں مقید کر دیا۔ سازشیوں نے دہلی میں التمش کے خاندان کے دوسرے فرد کو تخت پر بٹھادیا۔

اور اس طرح رضیہ کا دور اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ اس کے بعد اس کی التونیہ سے شادی اور پھر ان کا دہلی آنا اور یہاں پر شکست کھانا اور پھر اس کی جلد بازی میں تیار کی ہوئی فوج کا بکھر جانا، یہ سب ایک ایسی رومانی داستان ہے جس کا کامیاب ہونا ممکن نہ تھا۔ جب وہ فرار ہو رہی تھی اس وقت ڈاکوؤں نے اس کو قتل کر دیا۔

رضیہ کے دردناک انجام سے چہلگانی ترکی امراء کی بڑھتی ہوئی طاقت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ہم عصر مورخ منہاج سراج رضیہ کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رضیہ میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک حکمراں کے لیے ضروری ہیں۔ ''وہ دانا، کریم النفس، حکومت کو فائدہ پہنچانے والی،

عدل کرنے والی، اپنی رعایا کی پرورش کرنے والی، اور ایک جنگجو سپاہی۔ ''لیکن وہ مزید لکھتا ہے کہ ''یہ تمام خوبیاں کس کام کی جبکہ وہ ایک عورت پیدا ہوئی تھی؟'' یہ کہنا منہاج کو زیادہ موزوں لگا بجائے اس کے کہ وہ اس کا الزام ترکی امراء پر لگاتا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ وہی اس کے اور اس کے ورثا کے زوال کا سبب بنے۔

رضیہ کے انتقال (1240) سے بلبن کے بحیثیت نائب کے عروج تک کا زمانہ بادشاہت اور امراء کے درمیان طاقت کے سوال پر مسلسل جدوجہد کا زمانہ ہے۔ امراء اس بات پر متفق تھے کہ دہلی کے تختِ سلطنت پر صرف التتمش کا وارث ہی بیٹھے لیکن طاقت ان کے قبضے میں ہی رہے۔ جیسا کہ نامور مورخ رام پرساد ترپاٹھی کا کہنا ہے ''التتمش کے خاندان کی تاریخ میں سب سے اہم آئینی دلچسپی ولی عہد اور امراء کے درمیان اصل طاقت کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں رہی۔'' پہلے امراء کامیاب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے بہرام شاہ ابن التتمش کو تخت پر اس شرط کے ساتھ بٹھایا کہ ترکی امراء میں سے ایتگن کو اپنا نائب مقرر کرے گا۔ کچھ عرصے کے لیے تین امراء۔ نائب، وزیر اور مستوفی نے ملکر ایک حکمراں بورڈ بنایا جس کے نتیجے میں بادشاہ صرف ایک تصویر کے لیے صدر تھا لیکن ارباب ثلاثہ میں مفادات کے ٹکراؤ اور حکمراں کی یہ کوشش کہ وہ اپنا وقار منوا سکے، حکمراں اور وزیر کے درمیان اختلاف کا باعث بن گئی جس کے نتیجہ میں بہرام شاہ کو اپنے تخت اور زندگی، دونوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس کے وارث مسعود کا بھی وہی حشر ہوا۔ وزیر نظام الملک کی بھی یہی کوشش رہی کہ تمام طاقت اس کے قبضہ میں ہی رہے اس کے نتیجہ میں اس کا بھی قتل ہو گیا اور اسی میں بلبن کا عروج ہوا۔ اس نے بادشاہ کو ہٹا کر اقتدار تک پہنچنے کا اپنا راستہ صاف کر لیا۔

التتمش کی موت کے بعد چھ سالوں کے اندر چار حکمرانوں کی موت اس بحران کی طرف اشارہ کرتی ہے جو بادشاہت اور ترکی امراء کے تعلقات کے درمیان تھا۔ امراء حکومت کرنا چاہتے تھے اور بادشاہ نے صرف بادشاہت کی لیکن وہ ایک متحد محاذ نہیں بنا سکے۔

التتمش کے پوتے ناصر الدین محمود کو 1246 میں تخت سلطنت پر بٹھانا بلبن کا ہی کام تھا حالانکہ اس نے کچھ عرصے تک یہ کوشش کی کہ تمام ترکی امراء کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔ ناصر الدین محمود امراء کے لیے ایک مناسب آلہ کار تھا اس لیے کہ اس کو سیاست و انتظام حکومت سے بہت کم

دلچسپی تھی۔اس کے اپنے اجداد کا حشر اس کہ متنبہ کرنے کے لیے کافی تھا۔اس نے اپنا زیادہ تر وقت عبادت اور مذہبی امور کی انجام دہی میں صرف کیا مثلاً قران کی کتابت یا مذہبی لوگوں کے واسطے ٹوپیاں سینا۔

بہر حال بظاہر امراء جیت گئے لیکن ان کی کامیابی بہت کم مدت کے لیے تھی جیسا کہ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔

(ii) بلبن کا عہد (87-1246):

حالانکہ بلبن تخت سلطنت پر 1266 میں ہی بیٹھا تھا لیکن 1246 سے اس کی موت 1287 تک کا دور بلبنی دور کہا جاسکتا ہے اس لیے کہ اس زمانے میں اسی کی طاقت کا غلبہ رہا۔

(الف) بلبن بحثیت نائب۔چہلگانی کے ساتھ جدو جہد:

الغ خاں کی زندگی کے ابتدائی دور کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتی جس کو بعد میں تاریخ میں بلبن کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس کا تعلق البری ترک خاندان سے تھا جن کا ترکستان میں بڑا وقار و عزت تھی۔ان کو کافر ترکوں نے وہاں سے نکال دیا اور بلبن کو غلام کی حیثیت سے بغداد میں بیچ دیا اور پھر 33-1232 میں اس کو دہلی لایا گیا جہاں پر التمش نے اس کو خرید لیا۔اس طرح وہ چہلگانی میں سے ایک تھا۔ترقی کرتے کرتے وہ میر حاجب کے عہدہ پر تعینات ہوا۔یہ عہدہ بہت ہی اہم امراء کو ملا کرتا تھا۔اس نے 1246 میں منگولوں کا مقابلہ کر کے کہ جنھوں نے لاہور کو تباہ کر دیا تھا اور سندھ کے علاقے اوچھ کا محاصرہ کر لیا تھا، اپنی شجاعت اور بہادر افسر کی حیثیت سے سکہ جما دیا تھا۔اس کے بعد بلبن نے ہندو راجاؤں کو لوٹنے اور باغی رئیس و رائے کے خلاف مہم شروع کر دی۔اس کے نتیجہ میں صرف تین سال کی مدت میں اس نے نائب کا عہدہ حاصل کیا۔اس نے قوت واقتدار کے ساتھ فوج اور انتظامیہ پر مکمل اختیار حاصل کر لیا۔اس نے اپنی حیثیت مزید مستحکم کرنے کے لیے اپنی لڑکی کی شادی نوجوان سلطان کے ساتھ کر دی۔باوجود اس کے کہ بلبن کی حیثیت کافی عرصے تک مضبوط نہ ہو سکی، بلبن کا بلند مرتبہ اور اس حقیقت کی بنا پر کہ اس کے زیادہ تر رشتہ دار بڑے عہدے اور اعلیٰ اقطاع رکھتے تھے، ترکی اور تاجیک امراء کی مخالفت کا سبب

بنے۔ان کا سرغنہ، بہار کا گورنر قتلغ خاں تھا جو چہلگانی غلام افسروں میں سب سے زیادہ سینئر تھا۔ انھی ترکی امراء کی جدوجہد کے نتیجہ میں 1253 میں بلبن سے کہدیا گیا کہ وہ نائب کا عہدہ چھوڑ کر واپس اپنے اقطاع پر چلا جائے۔اس کے بہت سے رشتہ داروں اور دوستوں معہ اس کے چچازاد بھائی شیر خاں کے، جو کہ سندھ کا گورنر تھا، حکومت سے نکال دیا گیا۔ نئے لوگوں میں جن کو عہدے دیئے گئے ان میں عماد الدین ریحان، ایک ہندوستانی ہیجڑہ بھی شامل تھا۔اس کو وکیل در بنایا گیا جو کہ عدالتی معاملات میں بادشاہ کا نائب ہوتا تھا۔اس کا سیاسی معاملات میں کیا اثر رہا یہ صحیح طرح اس لیے واضح نہیں ہو پایا کہ دوسرے امیر نظام الملک جنیدی کو وزیر بنادیا گیا۔ بہر حال اس دور کا مورخ منہاج سراج جس کا ریحان کی وجہ سے قاضی کا عہدہ ختم ہو گیا تھا، اس دور میں ہونے والے واقعات کا ذمہ دار ریحان کو ہی ٹھہراتا ہے۔ بلبن اپنے اقطاع سے ہی برابر اس کوشش میں لگا رہا کہ اسے اس کی پوزیشن دوبارہ مل جائے۔اسے رنتھمبور پر حملہ کرنے سے کافی مالِ غنیمت ملا اور اس نے ترکی امراء سے بھی بات چیت شروع کردی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے منگولوں سے بھی تعلقات بنائے۔ وہ جلد ہی بہت سے ترکی امراء کو ریحان سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سلطان کو بلبن کی طاقت کے آگے جھکنا پڑا اور ریحان کو اس کے عہدہ سے ہٹا کر اس کے اقطاع پر بھیج دیا گیا۔ یہ 1255 کے اوائل میں ہی ہوا۔ جلد ہی ریحان کے خلاف ایک فوج بھیجی گئی جس میں اس کو شکست ہوئی اور اس کو قتل کر دیا گیا۔ یہ اس خیال کو تقویت دیتا ہے کہ ریحان کے پاس کوئی طاقت ور گروپ نہیں تھا۔ وہ تو طاقت ور امراء کے لیے محاذ کا کام کر رہا تھا جو یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان میں سے کوئی بھی بلبن جیسی طاقت حاصل کر سکے۔

بلبن نے دوبارہ طاقت حاصل کرنے کے بعد اپنے خاص مخالفین کے ساتھ حساب چکانا شروع کیا۔اس نے ایک فوج قتلغ خاں کے خلاف بھیجی جس نے سلطان کی ماں سے شادی کر لی تھی اور اس کو اپنے ساتھ اودھ کے اقطاع لے گیا تھا اور آزادانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ بہت سے دوسروں کے ساتھ بھی سخت اقدامات کیے۔ اپنی نئی طاقت کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے اس نے جوان سلطان کو مجبور کیا کہ وہ چھتر یا شاہی چھتری اس کے حوالے کردے۔ ناصر الدین محمود کے آخری چھ سالوں کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب بڑھتی

ہوئی گروہی سیاست سے بلبن اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس نے یہ فیصلہ کر ہی لیا کہ وہ سلطان کو زہر دے دے۔ اس نے تمام شاہی شہزادوں کو ختم کروادیا تھا تاکہ وہ خود تخت پر آسانی سے قبضہ کر سکے۔

(ب) بلبن بحیثیت حکمراں (87-1266):

بلبن کا 1266 میں سلطنت کے تخت پر قبضہ کرنا ایک طاقت ور عہد اور طاقت ور مرکزی حکومت کی ابتدا کی نشاندہی کرتا ہے۔ بلبن نے کوشش کی کہ وہ بادشاہت کی طاقت اور اثر کو بڑھائے اور حکومت کی تمام تر طاقت کو سلطان کے ہاتھوں میں مرکوز کر دے اس لیے کہ وہ سمجھتا تھا کہ اسی کے بعد وہ داخلی اور خارجی خطرات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس منصوبے کے ساتھ وہ ایرانی نظریہ بادشاہت کی طرف متوجہ ہوا۔ ایرانی نظریہ بادشاہت کے تحت، بادشاہ الوہی یا نصف الوہی کردار رکھتا ہے اور وہ صرف خدا کو ہی جواب دہ ہے اور کسی درمیانی ہستی، یعنی مذہبی رہنماؤں کو نہیں اور اس طرح حکمراں اور امراء میں یہ بنیادی فرق تھا۔ مافی الذکر کا پورا انحصار سلطان کے رحم و کرم پر تھا وہ کسی بھی طرح اس کا ہمعصر نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ نظریات جو کچھ حد تک ہندوؤں نے بھی اپنائے، ان کو اسلامی نظریۂ فرماں روائی میں بھی شامل کر لیا گیا۔ اگرچہ یہ بہت ہی دشوار معاملہ تھا جس کی وجہ سے ترک اس پر کافی عرصے تک الجھے رہے بلبن کا نظریہ عمل تھا۔ اس نے اس نظریہ کی تشکیل اس طرح کی کہ سلطان "اللہ کا سایہ" (ظلِ اللہ) ہے اور اس کو اس تاکید کے ساتھ بااثر بنایا کہ اس کے دربار میں جو بھی اس کے سامنے آئے گا وہ سلطان کے سامنے سجدہ اور پابوس کریں یا سر تسلیم خم کریں۔ یہ عمل علماء کے مطابق صرف خدا کے ہی لائق ہے۔ دوسرے اس نے عالیشان دربار مرتب کیا جس میں امراء کے اپنے منصب کے مطابق کھڑے ہونے کی جگہ کا تعین کیا اور اس نظام پر سخت نظر رکھنے کے لیے میر حاجب ذمہ دار تھا جو ہمیشہ ایک اہم امیر ہی ہوتا تھا۔ بلبن بذات خود دربار میں وقار کو قائم رکھتا۔ وہ کبھی بھی دربار میں زور سے نہیں ہنستا تھا اور نہ ہی کسی دوسرے کو ایسا کرنے کی اجازت دیتا۔ اس کا دربار قیمتی زیبائش اور جواہرات سے سجے ہوئے ہاتھی اور گھوڑوں، قطاروں میں کھڑے ہوئے غلاموں اور پہلوانوں (جو تلوار بردار اور جلاد ہوتے تھے) سے سجا رہتا تھا۔ جب سلطان باہر جاتا تھا،

3- مرکزی سلطنت کے قیام کے لیے جدوجہد (1236-90) 53-73

(i) رضیہ اور غیر مستحکم دور (1236-46)

(ii) بلبن کا عہد (1246-87)

(الف) بلبن بحیثیت نائب۔ چہلگانی کے ساتھ جدوجہد

(ب) بلبن بحیثیت حکمراں

(iii) سلطنت کے صوبائی اتحاد کے لیے جدوجہد

(iv) بلبن کا تجزیہ

4- تیرھویں اور چودھویں صدی میں ہندوستان کو منگولوں کا خطرہ 74-85

(i) منگول یلغار (1292 تک)

(ii) دہلی کو منگول خطرہ (1292-1328)

5- دہلی سلطنت کی اندرونی تعمیر نو اور مقامی علاقوں کی وسعت 86-111

(1290-1320)

(i) جلال الدین اور علاؤالدین خلجی کا نظریۂ ریاست

(ii) علاؤالدین کی زرعی اور مارکیٹ اصلاحات

(iii) دہلی سلطنت کے رقبہ میں وسعت (1328 تک)

(الف) گجرات۔ (ب) راجستھان۔ (ج) مالوا

(د) مہاراشٹر اور جنوبی ہندوستان

(الف) پہلا دور۔ فتح۔ (ب) دوسرا دور۔ قبضہ

6- مرکزیت پر مبنی تمام ہندوستان پر حکومت کے مسائل

غیاث الدین اور محمد بن تغلق (1320-1351) 112-131

(i) مسائل اور مختلف راہیں

(ii) تجربات اور اصلاحات

(الف) انتظامی اور سیاسی اقدامات۔ دیوگیری کو کوچ

اس کے آگے سیستانی جنگجوؤں کی ایک بڑی تعداد ہوتی جن کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں سورج کی شعاعوں سے جگمگاتی ہوئی ہوتیں۔ مورخ برنی کے مطابق ہندو اور مسلمان سو اور دو سو کوس سے بلبن کے جلوس کو دیکھنے کے لیے آتے۔ یہاں تک کہ مطیع راجا اور رائے جو بلبن کے دربار میں آتے نہایت مرعوب ہوتے۔ برنی یہاں تک کہتا ہے کہ "جب تک حکمراں کا جاہ و جلال اور شان و شوکت عام رعایا اور قرب و جوار کے مخصوص لوگوں کو مرعوب نہیں کرتے، حکمت کا رعب اور کارکردگی صحیح طور پر نہیں ہو سکتی۔" لہٰذا بلبن کا شاندار دربار اور عام جلوس ایک سیاسی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے بلبن نے اپنی ذاتی مخصوص بیٹھکوں میں بھی شراب پینا ترک کر دیا حالانکہ ایک خان ہونے کے ناطے وہ شراب اور جوئے کا شوقین تھا اور وہ اپنے گھر پر ہفتہ میں کم از کم تین بار جشن منعقد کرتا تھا۔ بلبن نے اس پہلو پر بھی زور دیا کہ حکمراں کو چھوٹے طبقے کے لوگوں، کم اہل، مسخرے اور ناچنے والیوں سے قربت نہیں رکھنی چاہیے۔ حد یہ ہے کہ اس کے ذاتی خدمت گاروں کو بھی لباس اور برتاؤ میں ان آداب اور قواعد کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ بلبن اقتدار میں شرکت پر قطعی یقین نہیں رکھتا تھا چاہے وہ افرادِ خاندان ہی کیوں نہ ہوں اور اسی وجہ سے جب اس کے ایک بھائی شیر خاں نے اس کی مخالفت کی تو اس کو زہر دلوا دیا۔ ایسے معاملات میں اپنے مخالفین کے ساتھ وہ صحیح یا غلط حربے استعمال کرنے میں قطعی دریغ نہیں کرتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ترکی امراء کے مفادات کی حفاظت کے سلسلے میں بالکل صاف رویہ رکھتا تھا۔ اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے اعلان کر دیا کہ حکومت سے متعلق کوئی عہدہ یا اقطاع یا مقامی انتظامیہ میں کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کو نہیں دیا جائے گا جو کم اصل یا نچلے طبقہ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہو گا اس میں خواجہ یا مشرف اور مقامی درجہ پر برید وغیرہ کے عہدے بھی شامل تھے۔ اس دور میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا بھی یہ خیال تھا کہ اہم عہدے عام لوگوں کے مقابلے میں ان کو ملنے چاہئیں جن کا تعلق قدیم اور خاص خاندانوں سے ہے۔ اس دور کے مصنفین نے بھی اسی نظریے کی وکالت کی ہے۔ برنی پر بھی اسی سمجھ کا غلبہ تھا برنی نے اس نظریہ پر اس طرح زور دیا کہ بلبن کا یہ دعوے تھا کہ اس کا تعلق ایران کے سورما افراسیاب کے وارثین سے ہے لہٰذا اس نے یہ سوچا کہ اگر وہ حکومت کے اونچے عہدے چھوٹے اور کم اصل طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو دے گا تو وہ

دوسروں کو یہ ثبوت فراہم کرے گا کہ اس کا تعلق بھی کم اصل طبقے سے ہے۔ برنی کے لیے نچلے درجہ کے اور کم اصل لوگوں کو سلطنت کے معاملات سے خارج کرنے کی پالیسی کا مقصد ہندوؤں اور ان ہندوؤں کو جنھوں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا، سلطنت کے معاملات سے علیحدہ کرنا تھا تاکہ اس کی طرح مہاجرین اور ان کے ورثاء کی حیثیت کو مستحکم کیا جاسکے۔ ترکی سلاطین نے نسلی بنیاد پر ان کو حکومت کے عہدوں سے علیحدہ رکھنے کی پالیسی پر سختی کے ساتھ کس طرح عمل کیا اس پر مزید مطالعہ کی ضرورت ہے۔ برنی کے مطابق التمش کے عہد میں ایک جائزہ لیا گیا کہ کتنے کم اصل اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والوں کو نچلی سطح کے انتظامیہ میں اعلیٰ منصب مل گئے ہیں۔ ایسے تینتس (33) افراد کے نام معلوم ہوئے جن کو فوراً ہی برخاست کر دیا گیا۔ دراصل ایک انکوائری کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ نظام الملک جنیدی جو وزیر تھا اور تاجیک تھا، اس کے اجداد بھی کپڑا بنتے (جولاہے) تھے اس انکشاف کے بعد اس کی تمام تر عزت ختم ہو گئی۔

ایسا کوئی ماخذ نہیں ہے جس کی بنیاد پر برنی کے بیان کے تصدیق ہو سکے۔ ایک ابی سینیائی میر یاقوت اور ایک ہندوستانی جس نے مذہب تبدیل کیا، جیسے ریحان، اونچے عہدوں تک پہنچنا، نظام الملک جنیدی کو اس بنیاد پر برخاست نہیں کیا جاتا کہ وہ کپڑا بننے والوں کے خانوادہ سے تھا اور ان ہندوستانیوں جنہوں نے تبدیل مذہب کیا تھا اور جو اپنے کام میں ماہر اور ہنرمند تھے اور بقول برنی کے ترکی امراء جن کی سفارش سرکاری عہدوں پر کرتے رہے تھے ظاہر کرتا ہے کہ ترکوں کی اجارہ داری پر کافی دباؤ تھا۔ نچلے طبقے اور کم اصل لوگوں کے ساتھ بلبن کے برتاؤ پر برنی دو مثالیں پیش کرتا ہے۔ پہلے جب دو اہم امراء نے کمال میہار کا نام امروہہ کے اقطاع کے لیے خواجہ کی حیثیت سے تجویز کیا اور انکوائری کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ وہ ایک غلام ہندو کا بیٹا ہے جس نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا باوجود اس کے کہ کمال میہار باصلاحیت اور تجربہ کار تھا، بلبن نے نہ صرف یہ کہ اس تجویز کو مسترد کر دیا بلکہ اپنے افسر کو یہ تنبیہہ بھی کر دی کہ آئندہ وہ کسی ایسے شخص کا نام تقرری کے لیے ہرگز تجویز نہ کرے جس کا تعلق نچلے طبقے سے ہو اور کم اصلوں میں پیدا ہوا ہو۔ بلبن کے اس رویے کی تشریح کرتے ہوئے برنی کہتا ہے کہ دراصل اس امر کی ہدایت اس کو اللہ کی طرف سے ہی تھی کہ وہ کسی کم اصل کو تعینات نہ کرے اور یہ کہ جب کبھی وہ کسی نیچے طبقے سے تعلق رکھنے والے

لوگوں کو دیکھتا تو اس کے جسم میں لرزہ پیدا ہو جاتا (غصہ سے)۔

دوسرے معاملے میں، بلبن نے فخر باونی سے دربار میں ملنے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ وہ محض ملک التجار تھا اور اس طرح کے لوگوں سے ملنے سے سلطان کو اپنے وقار کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔

بلبن نے اپنی مطلق العنانیت کو اعتدال پر لانے کے لیے، انصاف پر زور دینے کی کوشش کی۔ برنی کے مطابق اس کی انصاف پسندی اور اپنے عوام کی خیر خواہی کے جذبے نے رعایا کو اس کا گرویدہ بنا دیا اور وہ اس کے زبردست حامی و مددگار بن گئے۔ انصاف کے معاملات میں وہ اس قدر سخت تھا کہ وہ اپنے بھائیوں یا اپنے بچوں یا اپنے ساتھیوں اور ملازموں کے ساتھ بھی کوئی مروت نہیں کرتا تھا۔ اس نے تمام شہروں، ضلعوں اور اقطاع میں اپنے بُرید (جاسوس) مقرر کیے تاکہ وہ وہاں کے واقعات اور افسروں کے کاموں سے باخبر رہ سکے اور اس بات کا یقین کیا جا سکے کہ کسی کے اوپر کوئی زیادتی نہ ہو اور وہ اپنے غلاموں اور گھریلو ملازموں کے ساتھ برابر تاؤنہ کر سکیں۔ لہٰذا جب اسے معلوم ہوا کہ ملک بق بق نے، جو اس کا معتمد اور بدایوں کے اقطاع کا گورنر تھا، نشے اور غصے کی حالت میں اپنے ایک ملازم کو کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا۔ ملازم کی بیوہ نے انصاف کی درخواست کی لہٰذا بلبن نے حکم دیا کہ ملک کو بھی کوڑے مار کر ہلاک کیا جائے اور برید کو بھی، جس نے اس واقعہ کی اطلاع سلطان کو نہیں دی تھی، عوام کے سامنے پھانسی دے دی جائے۔ دوسرے امیر ملک ہیبت نے، جو اودھ کا گورنر اور ہتھیاروں کا نگران تھا، نشے کی حالت میں ایک شخص کو قتل کر دیا۔ اسے بھی عوام کے سامنے پانچ سو (500) کوڑے لگائے جانے کا حکم دیا گیا اور پھر اس شخص کی بیوہ کے حوالے کیے جانے کا حکم دیا تاکہ وہ خوں بہا لے یا اگر وہ چاہے تو اس کو قتل کر دے۔ اس نے بڑی مشکل سے 20 ہزار ٹنکا دے کر اپنی جان بچائی اور اس ذلت و خواری کے بعد پھر گھر سے باہر نہیں نکلا۔

اس سخت اقدامات کا یقیناً مثبت اثر ہوا ہو گا اور ہمیں بتایا گیا ہے کہ بلبن کے ذاتی جاسوسوں سے امراء بہت ڈرتے تھے۔ عوام کے ساتھ اس کے رویہ میں سختی اور نرمی کا امتزاج ملتا ہے۔ بلبن کو یقین تھا کہ دولت کی زیادتی اور غربت دونوں ہی لوگوں کو بغاوت کے لیے آمادہ کرتی

ہیں اس نے اپنے بیٹے بغرا خان کو سمجھایا کہ کسانوں سے لگان وصول کرنے میں معتدل رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ جب بلبن کسی اقطاع میں خان تھا تب اس نے ان کسانوں کی مدد کی تھی جو برباد ہو گئے تھے (مختلف وجوہات کی بنا پر موسم کی زیادتی، یا پھر پہلے اقطاع داروں کی زیادتی یا جنگ کی وجہ سے) اس طرح وہ غریبوں اور بے یار ومددگار لوگوں کی مدد کرنے اور اپنے اقطاع کو خوشحال بنانے کی وجہ سے کافی مقبول ہو گیا تھا۔ جہاں کہیں بھی اس کی فوج پڑاؤ ڈالتی تو بحیثیت سلطان، اس کی خاص توجہ اس طرف ہوتی کہ (سپاہیوں کی طرف سے) غریبوں، بے یار ومددگار لوگوں، بچوں اور بوڑھوں کو جسمانی یا کسی اور طرح کا نقصان نہ پہنچے۔ جہاں کہیں دریا، نالہ یا دلدل ہوتی تو وہ لوگوں کو اسے پار کرنے میں مدد کرتا۔ ان کو کشتیاں دیتا اور کبھی کبھی اپنے ہاتھی بھی دے دیتا۔

لیکن بلبن اس وقت بہت سختی سے پیش آتا جب وہ دیکھتا کہ عوام کا رویہ باغیانہ ہو رہا ہے یا وہ امن وسکون کے لیے خطرہ پیدا کر رہے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ التتمش کی موت کے بعد، دہلی کے اطراف میں میو کی تعداد اور جسارت کافی بڑھ گئی تھی حالانکہ ان کے خلاف کئی مرتبہ جارحانہ اقدامات اٹھائے جا چکے تھے لیکن ان میں کامیابی نہیں مل سکی۔ اس کی وجہ دہلی کے اطراف میں کافی گھنے جنگلات کی موجودگی تھی۔ اس وقت میو کی جسارت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ وہ رات میں شہر پر حملہ کر دیتے۔ لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے اور انہیں پریشان کرتے۔ لوگ میو کے ڈر سے رات کو سو نہ پاتے اور شہر سے باہر متبرک مقامات کی زیارت کے لیے نکلتے ہوئے ڈرتے تھے۔ یہاں تک کہ دن میں بھی بہشتی (پانی بھرنے والے) اور باندیاں جو حوضِ شمسی سے پانی بھرنے جاتیں ان کو ستایا اور پریشان کیا جاتا۔ آس پاس کی تمام سراؤں کو میو لوٹ لیتے جس سے تجارت متاثر ہوئی۔ دو آبہ میں چوروں اور ڈکیتوں نے دہلی کے تمام راستے ہر طرف سے مسدود کر دیے تھے۔ کارواں اور تجارت کے لیے وہاں سے آمد و رفت بہت دشوار ہو گئی تھی۔

بلبن نے اپنی حکومت کے دو سال میو کی سرکوبی اور دہلی کے اطراف کے جنگلوں کو کاٹنے میں صرف کیے اس نے میو کی ایک بڑی تعداد کو قتل کروا دیا، قلعے تعمیر کروائے اور کئی چھاؤنیاں (تھانے) بنوا کر انہیں افغانوں کے سپرد کر دیا اور ٹیکس سے مبرا گاؤں اس کی دیکھ بھال کے لیے دے دیے گئے۔ اس طرح دہلی میو کے خوف سے آزاد ہو سکا۔

اس کے بعد اس نے دو آب پر توجہ کی۔ وہاں ان اقطاع داروں کا دو آب کے مختلف علاقوں میں تقرر کیا جو باحیثیت تھے۔ بلبن نے حکم جاری کیا کہ وہ گاؤں جو نافرمان تھے ان کو پورے طور پر تباہ و برباد کر دیا جائے، مردوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے۔ اس مہم کو سر کرنے کے لیے بڑے امراء کا تقرر کیا گیا۔ اس علاقے کے گھنے جنگلوں کو کاٹ دیا گیا۔ تقریباً اسی طرح کا طریقۂ کار اودھ میں بھی اپنایا گیا۔ مضبوط قلعے تعمیر کروائے گئے اور وہاں افغانوں اور دوسرے مسلمانوں کو لگان سے بری زمینیں دے کر بسایا تاکہ وہاں انتظام اور قانون کا نفاذ ہو سکے اس طرح تاجروں اور بنجاروں کے لیے زمین کے راستوں کو محفوظ کیا گیا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس کے نتیجے میں دہلی میں مویشیوں، گھریلو جانوروں اور غلاموں کی قیمت کافی گر گئی۔

بلبن نے اسی طرح کے حربے کٹیہار (موجودہ روہیلکھنڈ) کے باغیوں کے ساتھ بھی اپنائے جو گاؤں کو لوٹتے تھے اور بدایوں اور امروہہ کے لوگوں کو اپنے ڈر اور ہراس میں مبتلا رکھتے تھے۔ بلبن کے ان سخت اقدامات کو بعض جدید مورخین نے "خون اور فولاد" کی پالیسی کا نام دیا ہے لیکن بلبن کی تمام پالیسیوں کے بارے میں یہ رائے قائم کرنا درست نہ ہوگا۔

ایک مضبوط مرکزی حکومت کو ایک مضبوط فوج کی ضرورت تھی۔ عہد وسطی کے تمام مفکر فوج کو حکومت کا ایک مضبوط ستون مانتے ہیں۔ اگرچہ ہمیں بلبن کی فوجی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں لیکن ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس نے مرکزی فوج پر، جو براہ راست سلطان کی کمانڈ میں رہتی تھی، جدید تشکیل اور توسیع پر کافی توجہ دی۔ لہٰذا بہادر اور تجربہ کار ملکوں اور سرداروں کا تقرر شاہی افواج پر کیا گیا جس میں ہزاروں نئے سواروں کا اضافہ کیا گیا۔ اس بات پر خاص توجہ دی گئی کہ انکو جو مناسب پیسہ ملے۔ اس کے لیے انہیں زرخیز گاؤں اقطاع میں دیئے گئے۔ اصلاحات کے نظریے سے بلبن نے پرانے ترک سپاہیوں کی حیثیت سے متعلق ایک جائزہ کا حکم جاری کیا جن میں سے بہت سے لوگوں کو ان کی تنخواہ کے عوض اقطاع کی شکل میں دو آب میں گاؤں دیے گئے تھے۔ بہت سے سپاہی اس قدر بوڑھے ہو چکے تھے کہ وہ اب کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے لیکن دیوان عرض کی چشم پوشی کی وجہ سے اب تک ان گاؤں پر قابض تھے۔ بلبن پرانے سپاہیوں کو پنشن دے کر چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن فخر الدین کوتوال دہلی کے کہنے پر اس نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ لیکن اس

سے حالات میں بہتری ضروری واقع ہوئی۔ فوج کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے بلبن اکثر ہزاروں گھوڑ سواروں، تیر اندازوں اور پیدل سپاہیوں کو تعینات کیا کرتا تھاایسی مہموں کو مخفی رکھا جاتا تھااور صرف ایک رات پہلے اس کا حکم جاری کیا جاتا تھالہٰذاافسران اور دوسرے عہدے دار اور افراد ہمیشہ چاق وچوبند رہتے تھے۔ برنی، بلبن کی معاملات میں دوراندیشی کا مداح ہے لیکن اپنی حماقت میں یہ الفاظ منگول لیڈر ہلاکو کی زبان سے کہلوانے لگتاہے جو بلبن کے سلطان بننے سے پہلے ہی مرچکا تھا۔

ہم کو امراء کی فوج کے بارے میں اندازہ نہیں ہے۔ صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ بلبن نے صرف قابل اور تجربہ کار افسران کا ہی تقرر کیا تھا، ایسا ظاہر کرتا ہے کہ امراء اپنے سپاہیوں کو خود ہی بھرتی کیا کرتے تھے۔ بلبن ہاتھیوں اور گھوڑوں کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ ایک ہاتھی کو 500 (پانچ سو) سواروں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ بلبن کو آسام اور بنگال سے ہاتھیوں کی مسلسل سپلائی ملتی تھی لیکن وسط ایشیا میں منگولوں کی فتح کے بعد ان علاقوں سے گھوڑوں کی درآمد مشکل ہو گئی تھی لہٰذا بلبن کو ہندوستان سے ہی گھوڑوں کو حاصل کرنا پڑا جو پنجاب اور شوالِک وغیرہ سے مل سکتے تھے۔ فوج کے لیے بھی ترکستان اور خراسان وغیرہ سے سپاہی اور غلام ملنا مشکل ہو گئے تھے اس لیے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے افغانوں، ہندوستانیوں کو مع ہندوؤں کے، فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ زیادہ تر افغان سپاہیوں نے دوآب کے ان علاقوں میں سکونت اختیار کی جو دہلی کے قرب وجوار میں تھے۔ جب بلبن مشرق کی سمت بنگال میں بغاوت کچلنے کے لیے آگے بڑھا تو اودھ پہنچ کر اس نے حکم جاری کیا کہ بڑی تعداد میں لوگوں کو جنگ کے لیے تیار کیا جائے۔ اس کے نتیجے میں دو لاکھ سپاہی جن میں سوار، پیدل، تیر اندازوں اور سامان برداروں کو بھرتی کیا گیا، ان میں ایک بڑی تعداد ہندوؤں اور ہندوستانیوں (ہندوستانی مسلمانوں) کی تھی۔

باوجود اس کے کہ مسلسل مشقوں کے ساتھ ایک کثیر فوج ہر وقت بالکل تیار رہتی تھی، بلبن نے دہلی سلطنت کی حدود کو بڑھانے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی قرب وجوار کے علاقوں، مالوایا گجرات کے راجاؤں پر حملہ کیا، جیساکہ بلبن نے اپنے قریبی دوستوں کو بتایاکہ "بدبخت منگول ہمیشہ ایسے موقع کی تلاش میں لگے رہتے ہیں کہ وہ دوآب پر حملہ کریں، دہلی اور اس کے قرب وجوار کے علاقوں کو برباد کردیں اور یہاں کی رعایا پر ایسے مظالم ڈھائیں کہ جس کو بیان نہ کیا جاسکے۔"

(iii) سلطنت کے صوبائی اتحاد کے لیے جدو جہد:

منگولوں کا خطرہ بلبن کی توجہ کا بڑا مرکز تھا اور اسی وجہ سے اس نے دہلی سے دور علاقوں پر حملہ کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ 13ویں اور 14ویں صدی میں ہندوستان کو جو منگولوں کا خطرہ لاحق تھا اس کو علیحدہ بیان کیا جائے گا۔ برنی کے مطابق، جب بلبن سلطان بن گیا تو حکومت کا وقار اور طاقت قائم ہوئی۔ اس کے سخت قوانین اور حتمی فیصلوں نے تمام لوگوں کو، بڑے اور چھوٹے اور تمام سلطنت کے عہدیداروں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اس کی طاقت کے آگے سرنگوں کر دیں۔ دوسرے تمام عام بیانات کی طرح اس بیان پر بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ بلبن کے دور میں مرکزی حکومت کے وقار اور طاقت میں کافی اضافہ ہوا لیکن اندرونی اختلافات اپنا سر اٹھاتے ہی رہے، اس کے دو عناصر تھے۔ ایک تو بوالہوس ترکی امراء اور زمینداروں کی کوشش، جس میں سے کچھ ہندوستان کے پڑوسی بھی تھے، کہ اپنے لیے ایک آزاد حلقہ تیار کر سکیں۔ دوسری کوشش راجپوت راجاؤں اور رائے جن میں بڑے زمیندار بھی شامل تھے کی طرف سے تھی جو اپنی اہمیت کا سکہ جمانا چاہتے تھے اور اگر ممکن ہو سکے تو ترکوں کو اپنے علاقوں سے نکال کر باہر کر دیں۔ راجپوت راجاؤں اور رائے میں سب سے اہم راجستھان سے تعلق رکھنے والے تھے۔ رضیہ کی موت کے بعد جو افراتفری پھیلی اس کے نتیجے میں ترکوں نے گوالیار اور رنتھمبور کو چھوڑ دیا کیونکہ ایسی حالت میں راجپوتوں کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا۔ بلبن نے گوالیار پر قبضہ کر لیا لیکن وہ رنتھمبور پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسی زمانے سے رنتھمبور میں مقیم چوہانوں کی طاقت تیزی سے بڑھی لیکن ان کے توسیعی اقدامات کا رخ راجستھان، مالوہ اور گجرات کے موجودہ حکمرانوں کی طرف تھا اور ترکوں کی سمت نہیں تھا۔ ترکوں کا قبضہ اجمیر اور ناگور پر برقرار رہا لیکن ان کا اثر راجستھان میں ان شہروں سے آگے نہ بڑھ سکا۔

جمنا کا جنوبی حصہ یعنی بندیلکھنڈ کا علاقہ بھی راجپوتوں کی مختلف شاخوں کے زیرِ اثر رہا جیسے چنڈیل، بھار اور بگھیلا۔ بلن نے ایک مہم دیوا کے بگھیلا راجہ کے خلاف محض اس لیے کی کہ وہ کڑا کا جنوبی میدانی علاقہ صاف کرنا چاہتا تھا۔ اس کی فتح اور لوٹ مار کے بارے میں جو اس نے وہاں کی منہاج نے بہت بڑھا چڑھا کر لکھا ہے۔ بہر حال اس مہم کی سیاسی اہمیت بہت محدود ہے۔

بدایوں اقطاع کے جنوبی حصے یعنی موجودہ مغربی اتر پردیش کے کٹیہر راجپوت، جن کا مرکز اہچاتا تھا، لگاتار بدایوں اور سنبھل میں دہشت پھیلاتے رہے، بلبن کی مہموں اور اس کے سخت اقدامات نے اس خطرہ کو ختم کر دیا اور رفتہ رفتہ کٹیہر یا موجودہ روہیلکھنڈ میں ترکوں کا اثر بڑھتا رہا۔

ایسا دیکھا گیا ہے کہ راجپوتوں کے اقدامات میں سے کسی ایک سے بھی ترکی حکومت یا اس کی ریاستی حدود کو کبھی بھی کوئی خطرہ لاحق نہیں رہا۔ بہر حال اس ہندو خطرے کو کبھی کبھی حکمرانوں نے اپنے اندرونی اختلافات یا آپسی نزاعات کے انسداد کے لیے استعمال کیا ہے۔ بلبن نے ایک مہم ضرور مالوہ کے خلاف کی لیکن اس مہم کی نوعیت صرف لوٹ مار ہی تھی۔ ترکی ریاست جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے اس وقت اس حالت میں نہیں تھی کہ وہ سرحد کی وسعت کی پالیسی کو اپنا سکتی ہے۔

ان جنگوں کے مقابلے میں زیادہ خطرناک جاہ طلب ترکی امراء کے سلطنت کے اندر اور باہر سے اپنے لیے خود اختیاری حلقہ قائم کرنے کی کوشش کے اقدامات تھے۔ منگولوں کے خطرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کرلگ جو غور اور غزنی کے مقامی حکمراں تھے اور جنھیں منگولوں نے وہاں سے نکال دیا تھا، انھوں نے دریائے سندھ پار کر کے کوہِ جودیا نمک کے پہاڑی سلسلے سندھ کے اس پار کے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ انھوں نے اپنے قبضہ کو ملتان اور سندھ تک بڑھانے کی کوشش بھی کی۔ اس پیچیدہ جدوجہد میں کبھی کبھی کوہِ جود کا کنٹرول ان کے ہاتھوں سے نکل کر منگولوں کے ہاتھوں میں پہنچ گیا اور پھر دوبارہ انھوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ دہلی سلطنت کا کنٹرول اس راستہ پر ختم ہو چکا تھا جب کہ لاہور دہلی سلطنت کے زیر اختیار رہا۔ دریائے بیاس ہی شمالی مغربی علاقے میں ایک بااثر سرحد تھی، اسی وجہ سے زیادہ تر پنجاب ہاتھ سے نکل گیا۔ سندھ میں بھی کئی گورنروں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور اس میں سے کچھ نے تو دہلی سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں منگول شحنہ تک کو قبول کر لیا۔ بہر حال التتمش اور بعد میں بلبن نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ ملتان اور سندھ پر انکا اختیار قائم رہے۔

مشرق میں، بنگال اور بہار پر بھی زیادہ تر کنٹرول لکھنوتی کے گورنروں کا ہی رہا جو موقع کے لحاظ سے کبھی دہلی کے سلطان سے وفاداری کا عہد کرتے اور کبھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیتے۔ ان میں سے چند نے تو اپنے اقتدار کو وسیع کرنے کے لیے کامروپ (آسام) جاج نگر (اڑیسہ) اور

جنوبی بنگال (رادھا) کو بھی فتح کرنے کی کوشش کی۔ اپنی اس جدوجہد میں جو انھوں نے مقامی حکمرانوں کے ساتھ جاری رکھی، اکثر موقعوں پر انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان کے پاس وہ اسباب موجود نہ تھے۔ کچھ گورنروں نے تو اپنے علاقے کو بہار سے مانِک پور اور اودھ تک وسیع کرنے کی کوشش کی۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو دہلی میں ترکی سلطنت ٹکڑوں میں بٹ جاتی اور بہت سے اندرونی مسائل پیدا ہو جاتے۔

جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ التتمش نے دو مہمیں خلجی سردار عوض کے خلاف کیں مگر اس کی اور بعد کے سلاطینِ دہلی کی کوششیں اس امر میں کامیاب نہ ہو سکیں کہ وہ بہار کو لکھنوتی سے علیحدہ کر سکیں۔ لہٰذا اس افراتفری میں جو التتمش کی موت کے بعد ہوئی ایک اور ترکی سردار طوغان خاں، لکھنوتی اور بہار کا مالک بن بیٹھا۔ اس نے رادھا پر حملہ کیا اور ایک حملہ ترہت پر بھی کیا۔ اس نے تو ایک کوشش اودھ اور اس کے قرب وجوار کے علاقوں پر قبضہ کرنے کی بھی کی جس میں وہ ناکام رہا۔ اس کے باوجود وہ بہت چالاک تھا کہ اس نے کبھی بھی دہلی کی اطاعت سے انکار نہیں کیا اور رضیہ اور اس کے مورثین سے بھی اپنی حیثیت کا توثیق نامہ اور اس کے ساتھ ساتھ شاہی اعزازات مع چھتر کے، جس کو کہ بادشاہ کا ایک نشان تصور کیا جاتا تھا، حاصل کرتا رہا۔ معاملات اسی طرح چلتے رہے یہاں تک کہ جب اس کی اڑیسہ کے گنگا حکمرانوں کے خلاف جدوجہد جاری تھی اور طوغان اس مہم میں مدافعی پوزیشن میں آگیا تب اس نے دہلی سے مدد کی درخواست کی۔ اڑیسہ کی فوج نے لکھنوتی میں اس کا محاصرہ کر لیا اور وہ اسی وقت وہاں سے واپس گئے جب انہیں یہ خبر ملی کہ اودھ کے گورنر کی سرکردگی میں ایک فوج اس کی مدد کے لیے آرہی ہے۔ اودھ کے گورنر نے طوغان کو برطرف کر دیا اور خود لکھنوتی میں اقتدار حاصل کر لیا لیکن جلد ہی اس کو قتل کر دیا گیا۔

جب بلبن نے دہلی میں نائب کی حیثیت حاصل کر لی تب اس نے اپنے غلام، یزبیک کو لکھنوتی کا گورنر بنا کر بھیجا۔ اپنے پیش رووں کی طرح یُزبیک بھی آزادی حاصل کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔ اگرچہ وہ اُڑیسہ کے خلاف نہ جم سکا لیکن وہ رادھا (1255) پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کامیابی نے اس کی دہلی سے متعلق پالیسی میں بھی کافی تبدیلی پیدا کی۔ اس نے اب سلطان کا لقب اور شاہی چھتر اختیار کر لیا۔ اودھ کے بحران سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، کہ جس میں بلبن

نے وہاں کے گورنر کو برطرف کر دیا تھا، یزبیک نے حملہ کر کے اودھ پر قبضہ کر لیا اور اپنے نام سے خطبہ پڑھوایا۔ لیکن اس افواہ کو سن کر کہ دہلی کی فوج اودھ کی سمت آ رہی ہے، یزبیک واپس چلا گیا۔ اس ناکامی کے بعد اس نے کامروپ پر حملہ کر دیا۔ مقامی حکمراں جہاں تک جا سکتا تھا پیچھے ہٹتا چلا گیا اور پھر موسم برسات کی شروعات میں یزبیک کے خلاف کھڑا ہو گیا۔ بڑھتے ہوئے دریا کی وجہ سے راستے کٹ گئے۔ یزبیک کو شکستِ فاش ہوئی اور وہ گرفتار کر لیا گیا اور پھر قتل کر دیا گیا (1257)۔

اس طرح جب بھی ترکی افسروں کو دہلی سے لکھنوتی بھیجا گیا انھوں نے آزادی کے منصوبے بنانے شروع کر دیئے ان میں سب سے خراب حشر طغرل کا ہوا جو ایک غلام افسر تھا، جسے بلبن نے لکھنوتی کا گورنر بنا کر بھیجا تھا۔ اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے بعد طغرل نے جاج نگر پر حملہ کر دیا۔ وہاں سے اسے کثیر دولت اور ہاتھی ملے جس کو اس نے دہلی کے ساتھ بانٹنے سے انکار کر دیا۔ اس نے سلطان کا لقب اختیار کیا اور اپنے نام سے خطبہ پڑھوایا۔

طغرل کی بغاوت کی خبر نے بلبن کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس کی نیندیں اُڑ گئیں وہ یہ سوچ رہا تھا کہ بنگال کے حالات سے دہلی میں اس کی پوزیشن ضرور متاثر ہو گی۔ 1276 میں بلبن نے اودھ کے گورنر امین خاں کو حکم دیا کہ وہ اس کی فوج اور ہندوستان کی فوج کے ساتھ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے آگے بڑھے۔ لیکن اسی دوران طغرل خاں سے واسطہ ہونے سے امین خاں کے بہت سے سپاہی اس کا ساتھ چھوڑ کر طغرل سے مل گئے کیونکہ اس کے پاس دولت کی فراوانی تھی۔ جب امین خاں دہلی واپس آیا تو بلبن نے غصہ میں اس کو پھانسی پر لٹکوا دیا اور اس کی لاش کو تشہیر کے لیے لٹکوا دیا۔ بلبن نے اب اپنے منتخب افسر بہادر کو طغرل کی سرکوبی کے لیے تعینات کیا لیکن اس کا نتیجہ بھی وہی نکلا۔ بہادر بہت بہادری سے لڑا لیکن اس کو بھی طغرل نے شکست دے دی۔ دہلی کی فوج بکھر گئی اور اس کے بہت سے سپاہی طغرل سے جا ملے۔

اس طرح بلبن کو بہت ہی سخت حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ دو افسروں کو شکست ہو چکی تھی اور اب طغرل بلبن کے ہم پلہ کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔ لہٰذا بلبن نے فیصلہ کیا کہ وہ بذاتِ خود طغرل کے خلاف مہم کی سربراہی کرے گا۔ حادثات کے نتیجہ کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے اپنے بڑے بیٹے شہزادہ محمد کو اپنا قانونی ولی عہد مقرر کیا۔ دہلی کے انتظام کی ذمے داری کسی ترکی امیر

خراسان اور قراچیل کی مہمیں

(ب) معاشی اور زرعی اصلاحات

علامتی سکے۔ زرعی اصلاحات

(iii) بغاوتیں اور حکمراں طبقہ میں تبدیلیاں

-7 فلاح و بہبود کی بنیاد پر حکومت کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش 132-150

دہلی سلطنت کا منتشر ہونا

(i) عوام کی فلاح و بہبود کے متعلق فیروز کا تصور

(ii) فیروز کی فوجی مہمات اور ان کی محدود کامیابیوں کے اثرات بنگال کی مہمیں۔ جاج نگر (اڑیسہ) اور نگر کوٹ۔ ٹھٹھ کی مہم (1365-67)

(iii) امراء اور انتظامیہ کی از سر نو تنظیم

(iv) ترقیاتی کام۔ زرعی اور شہری

(v) دہلی سلطنت کا انتشار اور اس کے اسباب

-8 دہلی سلطنت کے تحت حکومت اور انتظامیہ

(تیرھویں۔ چودھویں صدی) 151-169

(i) سلطان۔ وزارتیں، وزیر، دیوانِ عرض، دیوانِ انشاء، دیوانِ رسالت، دیگر وزارتیں

(ii) دربار اور شاہی حرم

(iii) صوبائی اور علاقائی حکومتیں

-9 دہلی سلطنت کے دور میں شمالی ہندوستان کی معاشی اور سماجی زندگی 170-209

(الف) معاشی زندگی

(i) زرعی پیداوار، دیہی معاشرہ اور محاصل کا نظام

(ii) غیر زرعی پیداوار، کپڑے کی صنعت، دھات کا کام عمارتی صنعت، دوسرے حرفے اور کاغذ سازی کی صنعت

کو نہ دیکر اس نے دہلی کے کوتوال فخر الدین کے سپرد کی اور اس کو نائب مقرر کر دیا۔ بلبن نے اپنے دوسرے بیٹے بغرا خان کو لکھنوتی جاتے وقت اپنے ساتھ لے لیا۔

طغرل کے خلاف مہم میں بلبن کو دو سال (82-1280) کا عرصہ لگا اس لئے کہ طغرل جنگ سے بچنا چاہتا تھا اسی لئے وہ بنگال کے بالکل ہی اندرونی علاقوں میں چلا گیا تاکہ بلبن اس مہم سے تھک کر واپس چلا جائے لیکن بلبن نے سختی کے ساتھ طغرل کا پیچھا کیا یہاں تک کہ بلبن کی فوج کے اگلے دستہ نے کچھ بنجاروں سے اشارہ ملنے پر طغرل کو اچانک پکڑ لیا اور قتل کر دیا۔ بلبن نے لکھنوتی میں طغرل کے ساتھیوں کو سخت سزائیں دیں لیکن جب وہ دہلی واپس آگیا تو اس کو مشورہ دیا گیا کہ وہ ان فوجیوں کی مثال قائم نہ کرے کہ جنھوں نے طغرل کو چھوڑ دیا تھا شاید بلبن کی یہ خواہش کہ وہ ترکی باہمی اتحاد کو قائم رکھ سکے بہت مضبوط ثابت ہوئی۔ بغرا خان کو مشرقی علاقوں کا گورنر بنا دیا گیا جس نے بلبن کی موت کے بعد ایک آزاد خاندان کی حکومت قائم کی جس نے بنگال پر تقریباً چالیس سال حکومت کی۔

(iv) بلبن کا تجزیہ:

جس خاندان کو بلبن نے قائم کیا تھا وہ اس کی موت کے بعد صرف تین سال تک قائم رہ سکا۔ اس کے بیٹے بغرا خان نے لکھنوتی پر حکومت کرنے کو ترجیح دی اور دہلی کا تخت اپنے بیٹے کیقباد کے لئے چھوڑ دیا۔ اس وقت کیقباد اٹھارہ سال کا نوجوان تھا۔ کیقباد نہایت ہی عیاش ثابت ہوا۔ اس نے حکومت کے تمام کام نظام الدین کے سپرد کر دیئے جس نے ان تمام ترکی افسران کو قتل کرنا شروع کر دیا جو اس کے مخالفین میں سے تھے۔ اسی دوران نظام الدین کو بھی قتل کر دیا گیا اور انتظامیہ بالکل بیٹھ گیا۔ جلال الدین خلجی جو مہموں کا سربراہ تھا اور اس کی لیاقت منگولوں سے ٹکر لینے کے بعد قائم ہو چکی تھی اسکو مدد کے لئے بلایا گیا۔ اس نے جلد ہی کیقباد سے نجات حاصل کر لی اور ایک نئے خاندان کی بنیاد ڈالی۔ (1290)

اگرچہ بلبن اپنے خاندان کو قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا لیکن اس نے بالائی دوآب گنگا کے میدانی علاقوں میں 'جو اس کی سلطنت کا اہم حصہ تھے' سختی کے ساتھ قانون اور نظام کو قائم کیا اور ان عناصر کو سختی کے ساتھ دبا دیا جو لاقانونیت کے ذمہ دار تھے 'اس طرح شاہراہوں کو

تجارتی مال اور تاجروں کی آمد ورفت کے لئے صاف کر دیا۔ اس نے وہ ضروری بنیاد فراہم کی جس کی بدولت سلطنت کا ارتقاء اور مستقبل میں اس کی وسعت کو بڑھایا جاسکے۔ اس بات کو نوٹ کیا جانا چاہیئے کہ گنگا کا میدانی علاقہ جو بنارس اور جون پور تک پھیلا ہوا ہے وہ دنیا کا سب سے بڑا اور زرخیز علاقہ ہے اور اس کی وحدانیت ہی ماضی میں سلطنتوں کی کامیابی کی اصل بنیاد رہی ہے حالانکہ ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ بلبن نے انتظامیہ کو از سرِ نو منظم کرنے کی کوشش کی ہو، خاص طور پر مقامی یا صوبائی سطح پر اس کا اقطاع داروں پر سخت کنٹرول، جو بریدوں کی کی وجہ سے تھا جو اسے مختلف حالات و واقعات سے باخبر رکھتے تھے، اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے پہلے جو چہلگانی یا ترکی غلام افسران لگان وصول کرتے تھے اور اپنے ذاتی استعمال میں لاتے تھے اب وہ سب مرکزی حکومت کو ملنے لگا۔ اس دولت کا ایک حصہ بلبن نے ایک طمطراق دربار بنانے میں صرف کیا اور باقی دولت مرکزی فوج کو مضبوط بنانے میں صرف کی۔ بلبن نے دہلی اور دوسرے علاقوں میں عمارتوں کی تعمیر میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ فنِ تعمیر کے میدان میں اس کا عہد کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ بلبن کی توجہ کا مرکز ایک مضبوط اور بڑی فوج رہی۔ اس نے اپنے بیٹے بغرا خاں کو ہدایت کی کہ فوج کے علاوہ آدھی آمدنی کو علیحدہ رکھ دینا چاہیے تاکہ وقتِ ضرورت کام آسکے:

بلبن کی فوج کی قوت وصلاحیت کا اندازہ لگانا اس لیے مشکل ہے کہ اس نے منگولوں کے ڈر کی وجہ سے سرحد کی وسعت کے لیے اسے کبھی استعمال نہیں کیا۔ بلبن منگولوں کو ملتان، دیپالپور، سینام کی حد تک جو دریائے بیاس کے ساتھ تھی، روکنے میں کامیاب رہا۔ لیکن وہ منگولوں کو لاہور کی حد سے آگے ڈھکیلنے میں کامیاب نہیں رہا حالانکہ اس کا مقابلہ منگولوں کے دوسرے درجہ کے سرداروں سے ہی رہا۔ منگول حکمرانوں کی توجہ کا مرکز ایران، عراق اور شام رہا۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ دہلی کو منگولوں سے اصل خطرہ نہیں تھا۔ بہر حال بلبن اپنے آپ کو آزمائش میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ دو پرانے ترکی افسروں کی ناکامی۔۔۔ امیر خاں جو اودھ کا گورنر تھا اور بہار اور وہ بہت سے سپاہی جو طغرل سے جاملے تھے، اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ لوگ بلبن کے طریقۂ کار اور اس کی پالیسی سے مطمئن نہیں تھے۔ ترکی سپاہی اپنی تنخواہوں سے کبھی بھی مطمئن نہیں تھے اور اس

کو مالِ غنیمت (غنیمہ) سے پورا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ بلبن کی سلطنت کو مستحکم کرنے کی پالیسی نے ان کو وہ توقع بھی فراہم نہیں کی۔ سندھ میں ترکی افسران کی بغاوت اور خاص طور پر بلبن کے اپنے دو غلاموں یزبیک اور طغرل کی لکھنوتی میں آزاد ہونے کی خواہش اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ بلبن کی سخت روی بھی ترکی قبیلہ کی آزادی کی فطری خواہش کو دبا نہ سکی حالانکہ بلبن نے آخرکار ترکان چہلگانی کی طاقت کو توڑ ہی دیا۔ اس کا بہت سے ترکی امراء کو زہر دلوانا اور خاموشی سے قتل کروانا، صلاحیت اور کارکردگی کے مقابلے میں خاندان اور اجداد پر خاص توجہ دینا، زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا۔ آخری بات نے نہ صرف قابل اور بااہل ہندوستانیوں کا تقرریاان کی نوکریوں میں ترقی سے باز رکھا بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا اثران ترکوں پر بھی پڑا جو ادنیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

تاہم بلبن کی کامیابیاں اس کی کمزوریوں کے مقابلے میں زیادہ اور اہم ہیں۔ اس نے ایک ایسی سیاست کی تعمیر کی جس میں نہ صرف اپنے آپ کو برقرار رکھنے کی صلاحیت تھی بلکہ اس میں یہ صلاحیت بھی تھی کہ جب وہ سخت بندشیں جو اس نے قائم کردی تھیں ختم ہو جاتیں اور قابل اور باصلاحیت لوگوں کو آگے بڑھایا جاتا تو پھر توسیع کی پالیسی کو اپنا سکتے۔ یہ کام تھا جو اس نے اپنے وارثین کے سپرد کیا تھا۔

■■■

-4-

13ویں اور 14ویں صدی میں ہندوستان کو منگولوں کا خطرہ

اگرچہ ہندوستان شمال اور شمال مغرب میں پہاڑوں کے سلسلے کے ذریعے محفوظ تھا۔ ہمالیہ اور شمال مغرب میں پھیلے ہوئے چھوٹے پہاڑوں کے درمیان کچھ قدرتی درّے تھے جو ہندوستان میں داخل ہونے کے روایتی راستے تھے۔ ان درّوں میں سب سے زیادہ مشہور اور استعمال ہونے والے خیبر اور بولان کے درّے تھے۔ شمال مغرب میں ان نچلے پہاڑوں کی بہ نسبت ہندوستان کی حفاظت کے لیے ایک قدرتی لائن ہندوکش پہاڑوں نے مہیا کی تھی جو شمال میں افغانستان اور وسط ایشیا کے درمیان ایک مستحکم روکاوٹ تھی جبکہ ایرانی صحرا مغرب میں ڈھال کا کام انجام دیتا تھا۔ افغانستان اور اس کے پڑوسی علاقے مصلحت کے لحاظ سے ہندوستان کے لیے اہم تھے کیونکہ وہ ہندوستان پر کسی بھی حملے کے لیے مرکزی مچان کا کام انجام دیتے تھے۔ لہٰذا ہم نے دیکھا کہ افغانستان پر حملہ غزنویوں اور غوریوں کی ہندوستان پر فتح کا پہلا مقام تھا۔

(i) منگول یلغار (1292 تک):

غوریوں کی فتح کے بعد ایسی توقع کی جاسکتی تھی کہ غور اور غزنی ہندوستان پر آئندہ ہونے والے حملوں کے لیے ڈھال کا کام انجام دیں گے۔ لیکن غور اور غزنی سے ہندوستان کی علیحدگی اور پھر خوارزم شاہ کے ذریعے اس علاقے کا فتح کرنا اور پھر منگولوں کی فتوحات نے اس اہم حیثیت کو یکسر بدل دیا۔ اب شمال مغرب میں حفاظتی لائن دریائے سندھ یا کوہ جود (نمک کے پہاڑی سلسلے) جو دریائے سندھ کے اس طرف تھے، مہیا کر سکتے تھے۔ ہم ان منزلوں کا جائزہ لیں گے جن میں منگولوں نے ان حفاظتی لائینوں کو توڑا اور اس دوران دریائے بیاس تک پہنچ گئے اور اس طرح دہلی سلطنت کے لیے ایک نہایت خطرناک خطرہ لاحق ہو گیا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ 1221 میں چنگیز خوارزم شہزادے جلال الدین منکبرنی کو شکست دینے کے بعد دریائے سندھ کے پاس تین ماہ تک گھومتا رہا۔ شہزادے نے دریائے سندھ پار کر کے کھوکھروں کے ساتھ معاہدہ کرلیا تھا جو اس علاقے پر اپنا اقتدار رکھتے تھے جو نمک کی پہاڑی سلسلے تک پھیلا ہوا تھا۔ اس علاقے سے روانہ ہونے سے پہلے چنگیز نے دہلی کے سلطان التمش کے پاس اپنا سفیر بھیجا کہ اس نے ہندوستان میں اپنی فوج بھیجنے اور گلگت یا آسام کے راستہ چین واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے کیونکہ اسے بھیڑوں کی کھال جلانے سے کوئی بہتر شگون نہیں ملا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ چنگیز کا ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ تھا لیکن اس نے اسے ترک کر دیا شاید اس لیے کہ التمش نے شہزادہ جلال الدین کی مدد سے انکار کیا تھا یا پھر ترکستان میں بغاوت کی وجہ سے جہاں چنگیز کی فوری توجہ کی ضرورت تھی۔ یہ سوچنا بہت آسان ہے کہ اگر چنگیز شمالی ہندوستان پر حملہ کرتا تو اس کے شہروں کا کیا حشر ہوتا۔ چنگیز کی موت کے بعد منگول کچھ عرصے تک اپنے اندرونی معاملات کو حل کرنے اور ساتھ ہی ایران اور خراسان کی فتح کو مکمل کرنے کی جدوجہد میں لگے رہے لہٰذا انہیں ہندوستان کے بارے میں سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن 1234 میں اوکتائی نے، جو ترکستان میں چنگیز کا جانشین بنا تھا (جس کو خطائی کے نام سے بھی جانتے ہیں) ہند اور کشمیر پر حملہ کرنیکا فیصلہ کیا۔ التمش اس خطرے کا سامنا کرنے کے لیے سالٹ رینج تک بڑھا۔ راستہ میں ہی التمش بیمار ہو گیا اور واپس دہلی لوٹ آیا جہاں کچھ ہی عرصے بعد اس کی موت واقع ہو گئی۔

التمش کی موت کے فوراً بعد ہی غزنی کے سابق گورنر وفا ملک، جس کو منگولوں نے نکال دیا تھا، ہندوستان آیا اور کوہِ جود یا سالٹ پہاڑیوں کے پورے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اس امر نے منگولوں کے حملے کو دعوت دی۔ منگولوں نے وفا ملک کو نکال کر کوہِ جود کے پورے علاقے کو اپنے اختیار میں لے لیا۔ کوہِ جود اور ملتان پر قبضے کے لیے منگولوں اور وفا ملک جس کا تعلق غرلغ خاندان سے تھا، کے درمیان لمبے عرصے تک جھڑپیں چلتی رہیں جس میں دہلی کے سلطان بھی جب ممکن ہو تا دخل اندازی کرتے رہتے۔ 1246 تک غرلغوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ اس وقت تک کوہِ جود منگولوں کی ایک چوکی اور ایسی بنیاد بن چکا تھا جہاں سے ہندوستان پر حملہ کیا جا سکے۔

دہلی کے باشندوں کو منگولوں کے خطرے کا سنجیدگی سے اس وقت تک احساس ہو گیا تھا

جب 1240 میں منگول فوج نے لاہور کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اس فوج کا سپہ سالار طائر بہادر تھا جو ہرات، غزنی اور افغانستان کا کمانڈر تھا، ترکی گورنر اس محاصرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس میں دشواری اس وجہ سے بھی پیش آئی کیونکہ یہاں کے باشندے وہ تجار تھے جو منگولوں کے علاقوں میں تجارت کرتے تھے اور وہ گورنر کی مدد کرنے اور اس کا ساتھ دینے کے لیے قطعی تیار نہیں تھے کیونکہ انہیں منگولوں کی انتقامی کارروائی سے خطرہ تھا۔ اس کے علاوہ دہلی سے بھی مدد کی امید بہت کم تھی کیونکہ رضیہ کے انتقال کے بعد وہاں خود ایک بحران تھا اسی لیے گورنر نے شہر چھوڑ دیا۔ شہر پر قبضہ کرنے کے بعد، منگولوں کو وہاں کے باشندوں کی طرف سے بھی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ جیسا کہ ہم کو بتایا گیا ہے کہ تقریباً تیس سے چالیس ہزار منگول اور ان کے سردار جن میں طائر خاں بھی شامل تھا قتل کر دیئے گئے۔ منگولوں نے بھی بدلے کے جذبے سے بے انتہا قتل و غارت گری کی۔ انھوں نے لاہور کے تمام باشندوں کو یا تو قتل کر دیا یا غلام بنا لیا اور شہر کو تباہ کر دیا لیکن وہ اچانک ہی واپس چلے گئے کیونکہ منگول قآن اوگتائی مر گیا تھا۔ اگرچہ لاہور پر دوبارہ دہلی کا قبضہ ہو گیا تھا لیکن تقریباً بیس سال تک لاہور اجڑا ہی پڑا رہا اس لیے کہ اس کے بعد بھی مختلف اوقات میں کبھی منگولوں نے اور کبھی کھوکھروں نے، جو منگولوں کے ساتھ تھے اس پر حملے جاری رکھے۔ ہمارے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ پنجاب، ملتان اور سندھ پر بار بار ہونے والے منگولوں کے حملوں کے بارے میں زیادہ تفصیلی مطالعہ کریں۔ یہ کہنا ہی کافی ہوگا کہ چغتائی منگولوں کا افغانستان پر قبضہ تھا۔ وہ کوہِ جود کی پہاڑیوں پر قابض تھے اور ان کی غارت گری دریائے بیاس تک پھیلی ہوئی تھی جو ستلج کے شمال میں بہتی ہوئی ملتان اور اوچھ کے درمیان چناب سے جا ملتی تھی۔ یہ وہ حالات تھے جو دہلی کے سلاطین کے روبرو تھے جب 1246 میں ناصر الدین محمود تخت پر بیٹھا تھا اور اسی وقت بلبن اس کا نائب مقرر ہوا تھا۔ حالانکہ بلبن ایک سخت پالیسی اپنانا چاہتا تھا اور اس علاقے کو منگولوں اور ان کے مددگار کھوکھروں سے کوہِ جود تک قطعی طور پر صاف کر دینا چاہتا تھا لیکن ترکی امراء کی گروہ بندی اور رقابت کی وجہ سے وہ زیادہ کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ لہٰذا ملتان اور سندھ کے سرحدی سرداروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ جس طرح چاہیں منگولوں سے مدافعت کریں۔ اس کے نتیجے میں کچھ سرداروں نے منگولوں سے مصالحت بھی کر لی اور بعض نے

آزادی کا اعلان کر کے منگولوں کی قیادت قبول کر لی۔ لہٰذا شیر خاں، جو بلبن کا چچازاد بھائی تھا جس کو سندھ سے نکال دیا گیا تھا جب بلبن کو ریحان نے برطرف کیا تھا، منگول سردار منجوقان سے مل گیا۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تاکہ شیر خاں کو اپنا پرانا مقام واپس مل جائے۔ ایسا نہیں کہ صرف شیر خاں ہی ترکی سردار ہے جس نے ایسا کیا ہو۔ لیکن منگول یہ طے کر چکے تھے کہ انہیں چین فتح کرنا ہے اور اپنی پوری توجہ عراق، شام اور مصر کی فتوحات پر رکھنی ہیں اور مقامی سرداروں کو یہ چھوٹ تھی کہ وہ اپنی طاقت کی بنیاد پر ہندوستان میں جتنی لوٹ مار کر سکتے ہیں کریں۔ اس لحاظ سے سلاطینِ دہلی بہت ہی خوش نصیب رہے کہ وہ منگولوں کی پوری طاقت کے ٹکراؤ سے بچے رہے۔

منگولوں کی لوٹ مار سے بچنے کے لیے بلبن نے فوجی اور سیاسی حربوں کا استعمال کیا اس نے اپنے ایک سفیر ہلاکو کے پاس بھیجا جو ایران میں منگولوں کا اِل۔ خان تھا اور جو اس کے علاوہ کہ اوگتائی۔ چغتائی سلسلہ کا اہم شخص تھا جن کا ترکستان اور ماوراء النہر کے علاقے پر غلبہ تھا، وہ چنگیز کے وارثین میں اہم درجہ رکھتا تھا۔ ہلاکو نے اس کے جواب میں ایک سفیر 1260 میں بھیجا جس کا استقبال بلبن نے بہت ہی شاندار طریقے سے کیا۔ سمجھا جاتا ہے کہ ہلاکو نے اپنے افسران کو سخت ہدایت کی تھی کہ وہ ہندوستان پر حملہ نہ کریں ورنہ سخت سزا دی جائے گی۔ لیکن ہمیں اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیئے کیونکہ اس وقت ہلاکو اپنی تمام تر طاقت کا استعمال عراق، شام اور مصر کی فتوحات پر کر رہا تھا۔ اس کو 1260 میں مصریوں کے مقابلے میں شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کے دباؤ میں منگولوں کو شام بھی چھوڑنا پڑا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تقریباً اسی زمانے میں برکا خان کی طرف سے جو جنوبی روس میں منگول سنہری جرگہ کا سردار تھا اور منگولوں میں سب سے زیادہ طاقت ور گروہ تھا اور جسے ہلاکو سے دشمنی بھی تھی، ایک سفیر ہندوستان آیا۔ ان الجھے ہوئے پیچیدہ حالات کے دوران ہلاکو نے اپنے شحنہ (داروغہ) کو کوہِ جود اور سندھ کے علاقوں میں اس لیے بھیجا کہ ان پر اس کی سرپرستی قائم رہے۔ اس معاہدہ کا یہ بھی مطلب ہے کہ سلاطینِ دہلی سندھ اور لاہور کے مغربی علاقوں میں منگولوں کو پریشان نہ کریں۔ 1266 میں جب بلبن تخت پر بیٹھا تو ہلاکو مر چکا تھا جس کے نتیجے میں وہ معاہدہ اور خوش آیند تعلقات جو منگولوں اور دہلی کے حکمرانوں کے درمیان

تھے، ختم ہو چکے تھے۔ بہر حال حقائق میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی حالانکہ بلبن کا چچازاد بھائی شیر خاں جو کہ فوجی حرکات کا نگران تھا اور اس وقت لاہور، سنام اور دیپالپور کا اقطاع دار بھی تھا۔ منگولوں کے خلاف اس کی حیثیت ایک ڈھال کی مانند تھی۔ منگول اکثر دریائے بیاس کو پار کر لیتے تھے۔ بلبن نے شروعات میں ہی جارحانہ پالیسی اپنائی۔ دوآب میں راستوں کو صاف کروانے کے بعد اس نے اپنی فوج کو کوہِ جود کی جانب بڑھنے کا حکم دیا۔ اس نے پہاڑی راستوں اور آس پاس کے علاقوں کو روند ڈالا اور کافی تعداد میں گھوڑوں پر قبضہ کر لیا جس کے نتیجے میں دہلی میں گھوڑوں کی قیمت میں کافی گراوٹ آئی۔ 1270 میں اس نے حکم دیا کہ لاہور کا قلعہ دوبارہ بنایا جائے اور ماہرینِ فن تعمیر کا تقرر کیا کہ وہ شہر کی از سر نو تعمیر کریں حالانکہ اس کے فوراً بعد ہی بلبن کو یہ محسوس ہوا کہ شیر خاں آزادی کا خواب دیکھ رہا ہے تو اس کو زہر دلوادیا اس کے بعد اس نے سرحد کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے بڑے بیٹے شہزادہ محمد کے سپرد کر دی۔ شہزادہ محمد ایک لائق اور پر جوش نوجوان تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بلبن کی حکومت کے باقی دور میں جس میں منگولوں کے حملے جاری رہے اس کے حفاظتی اقدامات کے تحت ملتان اور لاہور میں دریائے بیاس کے کنارے کنارے فوجی حفاظتی لائن برقرار رہی۔ برنی کا کہنا ہے کہ منگولوں کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ بیاس کو پار کر کے حملہ کرتے اور یہ کہ منگول کے 70 سے 80 ہزار سوار ملتان سے شہزادہ محمد، سمانہ سے بغرا خان اور دہلی سے ملک بار بک بکتارس کی فوجوں کا سامنا نہیں کر سکتے تھے۔ 1285 میں ملتان کے باہر شہزادہ محمد کی موت ایک اچانک حملہ کی وجہ سے ہوئی۔ شہزادہ منگولوں کی ایک فوج کو آگے بڑھتے دیکھ کر حیران رہ گیا لیکن اس نے حفاظت کے لیے فرار اختیار کرنے کے بجائے وہیں قدم جمائے رکھنا اور مرنا پسند کیا۔

شہزادے کی موت بلبن کے لیے ایک سخت اور ذاتی سانحہ تھا اس لیے کہ اس نے شہزادے کو ہی اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ لیکن جہاں تک منگولوں کا تعلق تھا اس سے حقائق پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

بلبن کے جانشینوں کے دور میں منگولوں کا آخری حملہ 1288 میں ہوا تھا جب تامر خان نے ملک کو لاہور سے ملتان تک روند ڈالا تھا لیکن منگولوں کو جیسے ہی علم ہوا کہ شاہی فوج آرہی ہے وہ فوراً واپس ہو گئے۔

اس طرح 1290 تک مغربی پنجاب پر منگولوں کا ہی قبضہ رہااور دریائے بیاس ہی سرحد بنی رہی لیکن وہ لگاتار ملتان اور سندھ کو دھمکاتے رہے لیکن انھوں نے دہلی پر کوئی جارحانہ حملہ نہیں کیااس کی وجہ سے دہلی سلطنت کاوجود قائم رہالیکن اس کی وجہ ان کی باخبری اور فوجی چوکسی تھی۔

ایران میں قائم منگولوں کی شاخ کا ہندوستان پر آخری حملہ 1292 میں ہوا جب عبداللہ کی سربراہی میں، جو ایران کے اِل خاں، ہلاکو کا پوتا تھا 150 ہزار منگول فوج نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ جلال الدین خلجی نے جو کچھ عرصے پہلے ہی سلطنت کے تخت پر بیٹھا تھا، اپنی زندگی کا کافی حصہ منگولوں سے لڑنے میں صرف کیا تھا۔ جلال الدین خلجی ایک بڑی فوج لے کر آگے بڑھا۔ چھوٹی موٹی جھڑپوں کے بعد ہی منگول بغیر جنگ لڑے ہی واپس جانے پر رضامند ہوگئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان کسی قسم کا معاہدہ ہوگیا تھا۔ جلال الدین کی عبداللہ کے ساتھ میٹنگ خوش آیند رہی جس کو اس نے بیٹا کہہ کر مخاطب کیا۔ منگولوں کے ایک گروہ نے، جس کی سربراہی ہلاکو کا ہی ایک پوتا، اُلاغو کر رہا تھا اپنے 4000 ساتھیوں سمیت اسلام قبول کیا۔ ان کو مع ان کے خاندانوں کے، دہلی کے قریب رہنے کی اجازت دی گئی۔ سلطان نے اپنی ایک بیٹی کی شادی الاغو کے ساتھ کردی۔ یہ اور 5000 منگولوں کا ایک دوسرا گروہ جو 1279 میں ہندوستان آئے تھے، مسلمان ہوگئے۔ ان کو نو مسلم کہا جاتا تھا۔

یہ خوشگوار تعلقات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا تھا کہ دونوں اطراف سے موجودہ حالات ہیں کوئی مداخلت نہیں ہوگی اور مغربی پنجاب پر منگولوں کا قبضہ قائم رہے گا۔ لیکن خود منگولوں کی خانگی سیاست نے ایک نئی صورتِ حال پیدا کردی جس کی وجہ سے منگول پہلی مرتبہ دہلی کے لیے زبردست خطرہ بن گئے۔

(ii) دہلی کو منگول خطرہ (1292-1328):

منگولوں کی اوگتائی۔ چغتائی شاخ کا عروج، جن کو اپنے ملک اور ترکستان پر اقتدار حاصل تھا، مرکزی ایشیا میں سیاسی تبدیلیوں کا باعث بنا۔ منگول سردار داوا خاں ایران کے منگول قان کے خلاف لڑنے نکلا۔ داوا خان نے افغانستان کو روند ڈالا اور اپنا اثر دریائے راوی تک بڑھالیا۔

منگولوں کی نئی پالیسی کا احساس اس وقت ہوا جب 98-1297 میں ایک لاکھ فوج نے جس کو داواخان نے بھیجا تھا نہ صرف دریائے بیاس کو پار کیا بلکہ دریائے ستلج کو بھی پار کر لیا اور اب دہلی کا راستہ ان کے لیے بالکل صاف تھا۔ علاء الدین نے ایک بڑی فوج اپنے مخصوص کمانڈر الغ خاں کی سربراہی میں بھیجی جس کا مقابلہ منگولوں سے جالندھر کے قریب ہوا اور انھوں نے منگولوں کے قدم پوری طرح اکھاڑ پھینکے۔ تقریباً 20 ہزار منگول دریا کو پار کرنے کے لیے بھاگتے ہوئے قتل کر دیئے گئے اور باقی بہت سے سپاہی جس میں افسران بھی شامل تھے قید کر لیے گئے اور دہلی لا کر قتل کر دیئے گئے۔ یہ دہلی سلطنت کی ایک بڑی فتح تھی جس میں منگول فوج سے براہ راست جنگ میں انہیں کامیابی ملی تھی۔ اسی طرح کی ایک اور کامیابی اگلے سال حاصل ہوئی جب منگولوں نے سندھ کے زیریں علاقے سوِستان پر قبضہ کر لیا تھا۔ ظفر خان، جو علاء الدین کا ایک اور خاص کمانڈر تھا منگولوں کے خلاف آگے بڑھا۔ اس نے بھی مکمل فتح حاصل کی۔ بندرگاہ کے شہر پر قبضہ کر لیا اور منگولوں کے سردار سالدی کو زنجیروں میں قید کر کے دہلی لایا۔

ان شاندار کامیابیوں نے علاء الدین کو منگولوں کی طرف سے حفاظت کی خام خیالی کی وجہ سے پوری طرح مطمئن کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ 1299 کے آخر میں اس وقت بغیر تیاری کے پکڑا گیا جب داواخان کے پوتے قتلغ خاں نے دو لاکھ منگول فوج کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کیا۔ ہو سکتا ہے منگول فوج کی تعداد بڑھا چڑھا کر بتائی گئی ہو اور شاید اس میں بچوں اور عورتوں کی تعداد کو شامل کر لیا گیا ہو جو چنگیز کے زمانے کے برعکس منگول فوج کے ساتھ شامل ہونے لگے تھے۔ پرانے زمانے کے برعکس منگولوں نے راستہ میں آنے والے گاؤوں اور شہروں کو تباہ نہیں کیا کیونکہ ان کا مقصد دہلی کو فتح کرنا اور حکومت کرنا تھا۔ ان کے آنے کی اطلاع ملتے ہی علاء الدین نے تیزی سے ایک فوج جمع کی اور سری کے باہر مورچہ سنبھال لیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں اپنے چچا جلال الدین کو قتل کرنے کے بعد دہلی پہنچنے سے پہلے اس نے سکونت اختیار کی تھی۔ منگولوں کے لشکر نے دہلی کے شمال سے چھ میل کے فاصلہ پر کِلی پر پڑاؤ ڈال دیا جب دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا تو علاء الدین نے فوراً دوآب کے امراء کو اس کی فوجی مدد کرنے کے حکم نامے جاری کیے۔ اسی دوران آس پاس کے رہنے والوں نے بھی دہلی میں پناہ لی جس کی وجہ سے یہاں بہت بھیڑ اکٹھا ہو گئی اور

(iii) تجارت:(الف)اندرونی تجارت(ب)غیر ملکی تجارت

(ب)سماجی زندگی

(i) حکمراں طبقے (الف)امراء(ب)سردار۔زمینداروں کا منظر عام پر آنا

(ii) حکمراں طبقے کے ملحقات،عدالتی اور نچلے درجہ پر

انتظامیہ کے افسر اور علماء

(iii) تاجراو سرمایہ دار طبقے

(iv) معیارِ زندگی

(v) شہر اور شہری زندگی۔کاریگر اور غلام

(vi) عورتیں،ذات پات،سماجی دستور اور رسم ورواج

10- وجے نگر اور بہمنی عہدِ حکومت میں جنوبی ہندوستان میں سیاست، حکومت،معاشرہ اور معاشی حالات۔(1350-1565) 210-231

(i) وجے نگر سلطنت۔اس کی کیفیت اور بہمنی سلطنت سے ٹکراؤ

(ii) بہمنی سلطنت۔اس کا عروج وانتشار،محمود گوان کا دور(82-1463)

(iii) وجے نگر کا نقطہ عروج اور انتشار

11- ہندوستان کے سمندری علاقوں پر پرتگالیوں کی گرفت اور اس کے معاشی وسیاسی اثرات۔ 232-252

(i) پرتگالیوں کی آمد سے پہلے ایشیا میں بحری تجارت کا پھیلاؤ

(ii) پرتگال کا 'ایسٹاڈوڈا انڈیا'

(iii) بحر ہند کے تجارتی سلسلے پر پرتگال کے اثرات

12- شمالی ہندوستان میں علاقائی سلطنتیں اور طاقت کے توازن کا نظام 253-278

(i) مشرقی ہندوستان:بنگال،آسام اور اُڑیسہ

(ii) مغربی ہندوستان:گجرات،مالوا اور راجستھان

(iii) شمال،مغربی اور شمالی ہندوستان:شرقی،لودی سلطان اور کشمیر

کھانے پینے کا سامان بہت مہنگا ہو گیا کیونکہ دوآب سے سامان کے کارواں آنے بند ہو گئے تھے۔

اس حالت کو دیکھتے ہوئے دہلی کے کوتوال علاء الملک نے علاء الدین کو یہ مشورہ دیا کہ وہ انتظار کا کھیل کھیلے اور اگر ممکن ہو تو ایسی ترکیب کرے کہ منگول سکون کے ساتھ واپس چلے جائیں اس لیے کہ اس کی فوج میں زیادہ تر ہندوستانی سپاہی ہیں جو صرف ہندوؤں سے ہی جنگ لڑ چکے ہیں اور ان کو منگولوں سے جنگ کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ ان کے حربی حیلوں سے ہی واقفیت رکھتے ہیں۔ علاء الدین نے کوتوال کے مشورے کو رد کر دیا کیونکہ یہ بزدلانہ تھا اور اس سے بحیثیت حکمراں اس کے وقار کو زک پہنچ سکتی تھی۔ حالانکہ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ سارا فیصلہ ایک ہی جنگ سے ہو۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ وقت اس کے ساتھ ہے اور منگول، جو اپنے وطن سے دور ہیں ان کے پاس جلد ہی رسد کی کمی ہو جائے گی علاء الدین نے سزائے موت کی دھمکی دیتے ہوئے احکامات جاری کیے کہ اس کے افسر محافظ بنے رہیں اور جب تک وہ حکم نہ دے منگولوں پر حملہ کرنے کے لیے اپنی قطار سے باہر نہ آئیں۔ لیکن ظفر خاں، جو لڑنے کے لیے بے چین تھا اس نے اپنے سامنے کھڑے منگول دستہ پر حملہ کر دیا۔ اپنے طریقے کے مطابق منگول پیچھے ہٹ گئے جب ظفر خاں ان کا تعاقب کرتا ہوا کئی میل آگے نکل گیا تب ان کی دس ہزار کی فوج نے گھات لگا کر اس کی واپسی کے راستہ کو بند کر دیا اور چاروں طرف سے گھیر لیا۔ علاء الدین کے حکم کے مطابق کوئی ظفر خاں کو بچانے نہیں گیا اور وہ اپنے تمام ساتھیوں سمیت بہادری سے لڑتے ہوئے مارا گیا۔

حالانکہ منگولوں نے پہلی جھڑپ جیت لی تھی لیکن ظفر خاں کے استقلال کا سکہ قائم ہو گیا۔ قتلغ خاں کو یقین ہو گیا کہ وہ علاء الدین کی لائن کو نہیں توڑ سکتا اور دہلی پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا دو دن کی جھڑپوں کے بعد وہ دہلی سے واپس چلا گیا اور تیزی سے دریائے سندھ پار کر لیا۔ علاء الدین نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔

منگولوں کا یہ بھرپور حملہ نہ صرف دہلی والوں بلکہ علاء الدین کے لیے بہت سخت جھٹکا تھا۔ اب وہ اپنی لاپرواہی سے بیدار ہوا اور اس نے دور رس اقدامات اٹھائے۔ پہلی مرتبہ دہلی کے گرد حفاظتی دیوار تعمیر ہوئی اور جتنے پرانے قلعے منگولوں کے راستہ پر واقع تھے ان کی مرمت کروائی۔ سمانہ اور دیپالپور میں بہت بڑی تعداد میں فوجی دستوں کو تعینات کیا۔ اس کے ساتھ اس

نے اندرونی نظام کو بھی دوبارہ سے منظم کرنے کے لیے اقدامات اٹھائے اور بڑی تعداد میں فوجیوں کا تقرر کر کے ایک بڑی فوج تشکیل کی۔ یہ وہ اقدامات ہیں جن پر ہم علیحدہ سے تبصرہ کریں گے اور جن کی بنیاد پر وہ منگولوں سے ٹکر لے سکا حالانکہ منگولوں کا خطرہ ہندوستان پر کئی سالوں تک منڈلاتا رہا۔

1303 میں منگولوں نے ترغی کی سرداری میں دوسری مرتبہ دہلی پر حملہ کیا۔ کچھ مفسر تو منگولوں کی فوج کی تعداد 12 تومان یعنی ایک لاکھ 20 ہزار مانتے ہیں لیکن برنی نے کہیں 30 اور کہیں 40 ہزار بتائی ہے جو قریب تر معلوم ہوتی ہے۔ منگول بہت تیز رفتار سے آگے بڑھے۔ راستہ میں بہت کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ دہلی اچانک پہنچنا چاہ رہے تھے کیونکہ ان کی اطلاع کے مطابق علاء الدین دہلی سے دور پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ علاء الدین ایک مہینہ پہلے ہی چتوڑ سے واپس آیا تھا اس کے سپاہیوں کو ابھی تجدید کی ضرورت تھی۔ مرکز بالکل خالی تھا کیونکہ ایک فوج بنگال سے ہوتی ہوئی وارنگل بھیجی گئی تھی اور وہ بہت خستہ حالت میں دو آب واپس آئی تھی دوسرے منگولوں نے جمنا کے تمام گھاٹوں پر قبضہ کر لیا تھا تاکہ شاہی فرمان کے باوجود فوجی دستے دو آب سے دہلی نہ پہنچ سکیں۔ ایسی حالت میں علاء الدین اپنی دستیاب فوج کے ساتھ سری سے باہر آ گیا اور ایک بہت ہی مضبوط مقام پر پوزیشن لی۔ ایک سمت دریائے جمنا اور دوسری سمت پرانی دہلی تھی۔ اپنی پوزیشن کو مزید مستحکم کرنے کے لیے اس نے چاروں طرف خندق کھدوائی اور اس کے کناروں پر لکڑی کے تختے لگوائے تاکہ برنی کے مطابق اس کا کیمپ لکڑی کے قلعہ کی مانند لگے۔ منگولوں کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس پر حملہ کر سکیں لیکن وہ دہلی کے گرد گھومتے اور شہریوں میں دہشت پھیلاتے رہے۔ شہر میں اناج اور تیل کی کمی ہو گئی۔ کاروانوں نے دو آب سے دہلی آنا بند کر دیا۔ بہر حال منگول بھی اب پہلے جیسے منگول نہیں رہے تھے اور ان کا نظم بہت کمزور ہو گیا تھا۔ وہ دہلی کے باہر تالابوں پر آکر شراب پیتے اور شہریوں کو سستا اناج فروخت کرتے اور اس طرح اناج کی قلت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس دو ماہ کی بے کار کی بھاگ دوڑ کے بعد منگول ایک مرتبہ پھر بغیر لڑے واپس چلے گئے۔

دہلی فتح کرنے کی دو مہموں کے ناکام ہونے کے باوجود دو سال بعد یعنی 1305 میں منگولوں نے تیسری اور آخری کوشش ہندوستان کو فتح کرنے کے لیے کی۔ سندھ پار کر کے تیس

سے چالیس ہزار گھوڑ سواروں پر مشتمل فوج تیر کی مانند پنجاب سے گزری اور شوالک پہاڑیوں کے دامن میں بستیوں کو خاکستر کرتی ہوئی، دہلی کو چھوڑتی ہوئی دو آب میں داخل ہوئی۔ بہر حال علاء الدین نے جس کی فوج پہلے سے بہت مضبوط تھی، ایک ہندو امیر ملک نائک کی سرپرستی میں تیس ہزاری فوج روانہ کی جو، امیر خسرو کے مطابق پہلے سمانہ اور سنام کا گورنر تھا بہت سے مسلمان افسروں کو اس کی ماتحتی میں تعینات کیا گیا۔ یہ اس بات کا مظہر ہے کہ بلبن کے دور سے ترکی سلطنت میں سماجی بنیاد میں کس حد تک وسعت پیدا ہوئی تھی۔ ملک نائک کا مقابلہ منگولوں سے امروہہ کے قریب (یو۔پی کا شمالی مغربی حصہ) ہوا اور اس نے منگولوں کو شکست فاش دی۔ منگول فوج کے سردار علی بیگ اور ترطاق نے ہتھیار ڈال دیے۔ ان کو دہلی لایا گیا اور 20 ہزار منگولوں کو قتل کر دیا گیا۔

اس فتح نے ہندوستان میں اس احساس کو ختم کر دیا کہ منگولوں کو ہرانا ممکن نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہوا جیسا کہ 1260 میں مصریوں کے ہاتھوں شکست کے بعد ان کے ہاتھ سے مغربی ایشیا کا اور پھر شام کا علاقہ نکل گیا۔ 1306 میں داوا خاں کی موت کے بعد دہلی کو فتح کرنے میں منگولوں کی دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ انھوں نے کئی حملے کٹھہار اور شوالک کے علاقوں میں کیے لیکن وہ سب پسپا کر دیے گئے جس میں منگولوں کا بڑا قتل ہوا۔ برنی کے مطابق جب بھی منگولوں نے دہلی اور اس کے قرب وجوار پر حملے کیے ان میں انہیں شکست ہی ہوئی۔ لشکر اسلام میں اس درجہ اعتماد پیدا ہو چکا تھا کہ ایک فوجی جو دو اسپہ کا منصبدار تھا دس منگولوں کو قیدی بنا کر ان کی گردنوں کو رسی سے باندھ کر لا سکتا تھا۔ "ایک مسلمان گھوڑ سوار سو منگولوں کو میدان سے بھگا سکتا تھا۔" جن علاقوں کو منگولوں نے تباہ کر دیا تھا اب دوبارہ سے وہاں کھیتی شروع ہو چکی تھی۔ ہم کو بتایا گیا ہے کہ دیپالپور اور لاہور منگولوں کیلیے ناقابل عبور علاقے بن گئے تھے، بالکل "دیوارِ چین" کی طرح اس علاقے کے سردار تغلق شاہ یا غازی ملک نے منگولوں کے دریائے سندھ تک کے مغربی پنجاب کے مقبوضہ علاقوں پر لگاتار حملے کیے تھے وہ اتنے کامیاب تھے کہ وہاں کے باشندوں کے دلوں سے منگولوں کی دہشت یکسر ختم ہو گئی تھی۔ برنی کے مطابق اب منگولوں کی یہ ہمت نہ رہی کہ وہ دریائے سندھ کو پار کر سکیں۔ اس کو ہم دیکھیں کہ یہ مبالغہ آرائی تھی۔

اس طرح علاء الدین نے نہ صرف دہلی اور دو آب کو منگول خطرہ سے محفوظ کیا بلکہ ایسے حالات پیدا کیے جہاں ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کو دریا بیاس اور لاہور کے بجائے دریائے سندھ تک پہنچا دیا۔

یہ انتہائی اہم کارنامے تھے۔ بہر حال جب تک منگولوں کا افغانستان اور اس کے پڑوسی علاقوں پر اثر رہا یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ہندوستان کے لیے خطرہ ٹل گیا ہے۔ اس لیے علاء الدین کی موت کے بعد ہندوستان کے لیے منگولوں کا خطرہ پھر پیدا ہو گیا۔

1320 میں دالو چا خاں 70 ہزار گھوڑوں کے ساتھ وادیٔ کشمیر میں داخل ہوا اور اس کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک تباہ کر دیا۔ تمام مردوں کو قتل کر دیا گیا اور عورتوں اور بچوں کو خطائی اور ترکستان کے غلاموں کے تجارت کرنے والے تجار کو فروخت کر دیا۔ شہروں اور گاؤں کے تمام مکانات جلا دیے گئے خوش قسمتی سے آٹھ ماہ بعد جب یہ منگول حملہ آور واپس جا رہے تھے تو برف باری کی نذر ہو گئے۔ غیاث الدین کی تخت نشینی (1320) کے فوراً بعد دو منگول فوجیں سنام اور سمانہ تک پہنچ گئیں اور میرٹھ تک جا پہنچیں۔ بڑے قتلِ عام کے بعد ان کو شکست ہوئی۔ 1326-27 میں نئے منگول خاں، ترما شرین نے پھر ہندوستان پر حملہ کیا۔ غیاث الدین تغلق ترما شرین سے مقابلے کے لیے نکلا اور نہ صرف اس کو پیچھے بھگا دیا بلکہ ہندوستان کی سرحد کو دریائے سندھ کے پار بڑھا کر پشاور اور کلانور کو شامل کر لیا تاکہ مستقبل میں منگولوں کے حملے کے خلاف ایک بہتر محاذ قائم کر سکے۔ بہر حال کچھ عرصے بعد ہندوستان کی فوجوں کو سندھ کے عقب تک واپس آنا پڑا جو منگولوں کے درمیان سرحد قائم رہی۔

ہندوستان کو منگولوں سے خطرے کا مقابلہ کرنے کی سب سے زیادہ جرأت مندانہ کوشش محمد بن تغلق نے کی جس نے اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد 3 لاکھ 75 ہزار سپاہیوں کی فوج اس مہم کے لیے تیار کی جس کو خراسان مہم کہا جاتا ہے۔ جبکہ سلطان کے بڑے مقاصد کے بارے میں تو صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے لیکن اس مہم کا ایک مقصد کابل، غزنی اور آس پاس کے علاقوں کو فتح کرنا تھا۔ یہی وہ علاقے ہیں جن کے ذریعہ ہندوستان پر حملہ کا خطرہ بنا ہوا تھا۔ محمد بن تغلق کا یہ منصوبہ بھی ناکام ہو گیا جس طرح اس کے دوسرے منصوبے ابتدائی منزل میں ہی ناکام ہو گئے

تھے۔ بہر حال وہ ان سلاطین میں سے تھا جن کے ذہن میں ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد کی حفاظت کے لیے ایک گہری سمجھ تھی یہ اس لیے ممکن ہوا ہوگا کیونکہ وہ ایشیا کے معاملات کی بہتر سمجھ رکھنے والا طالبِ علم تھا۔ ان تمام پہلوؤں پر لاپرواہی کے نتیجہ میں ہی تیمور نے 1399 میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔

اس طرح ہندوستان پر منگولوں کا خطرہ تقریباً سو سال تک قائم رہا اور اس میں سختی آتی چلی گئی یہاں تک کہ علاء الدین خلجی کے عہد میں یہ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ منگولوں کے حملوں کی وجہ سے ہی مغربی پنجاب یعنی لاہور سے آگے تک کا علاقہ تیرہویں صدی کے آخری نصف حصے میں منگولوں کے ہی قبضہ میں رہا جس کے نتیجہ میں دہلی اور دوآب کو وہی خطرہ لاحق ہو گیا جیسا کہ غزنویوں کے دور میں تھا۔ بہر حال اس زمانے کے راجپوت حکمرانوں کے برخلاف سلاطین دہلی نے اپنے وسائل کو منظم کیا اور اپنے معاشی ڈھانچہ کو بھی از سر نو منظم کیا تا کہ وہ منگول خطرے کا مقابلہ کر سکیں۔ بہر حال وہ اس کام میں ناکام رہے کہ ایک مضبوط سرحد جس کی بنیاد افغانستان میں ہو قائم کرتے، تاکہ مستقبل میں ہونے والے حملوں کو روکا جاسکتا۔ یہ مہم بعد میں مغلوں نے شروع کی۔

■■■

-5-

دہلی سلطنت کی اندرونی تعمیرِ نو اور مقامی علاقوں کی وسعت

خلجی حکومت کے مختصر دور (1320-1290) میں دہلی کے سماجی و معاشی اور انتظامی ڈھانچہ میں کچھ اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اس نے کچھ نئے سوالات ہندوستان میں ریاست کی ماہیت اور سیاست پر اٹھائے۔ خلجیوں کے اقتدار میں عروج کے نتیجے میں حکمراں طبقہ کی سماجی بنیاد میں وسعت ہونا سب سے اہم واقعہ ہے۔ ابتدائی ترکی سلطان جن کو 'اَلبری' کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی بنیاد قبائلی نظام پر تھی، یا مملوک یعنی غلام افسران وغیرہ کی سمجھ تھی کہ ریاست کے اہم اور اعلیٰ عہدے صرف ان کے لیے ہیں جن کا تعلق ترکوں کے اعلیٰ خاندان سے ہے۔ تاجیک جن کو التمش کے عہد میں ترکی امراء میں اہم جگہ ملی ان کو التمش کی موت کے بعد ہٹادیا گیا۔ ابی سینائی، یاقوت، یا ایک ہندوستانی مسلمان، ریحان اور کچھ خلجی جو سرحدوں پر اہم عہدے رکھتے تھے، استثنائی ماہیت کی مثالیں ہیں۔ برنی کا کہنا ہے کہ خلجیوں کے برسرِ اقتدار آنے سے حکومت ترکوں کے ہاتھوں سے جاتی رہی اور دہلی کے باشندے جن پر ترکوں کی حکومت اسی سال رہی "خلجیوں کو ترکی سلاطین کے تخت پر قابض دیکھ کر تحسین واستعجاب میں پڑگئے۔"

(i) جلال الدین اور علاء الدین کا نظریہ ریاست:

خلجیوں کے عروج کے بعد نئے لوگوں کا گروہ اقتدار میں آیا اور بڑے عہدے حاصل کیے اس کے بانی جلال الدین خلجی (96-1290) نے مستثنیٰ تنگ نظر پالیسی کو نہیں اپنایا۔ بہت سے ترک افسران جو بلبن عہد سے تعلق رکھتے تھے جب جلال الدین سے ملنے آئے تو اس نے انہیں اہم عہدے اور اقطاع دیئے۔ یہاں تک کہ مِلک چھجو کِشلی خاں جو بلبن کا بھتیجہ تھا اس کو کڑا کا گورنر بنادیا جو کہ بہت زرخیز اور خوشحال علاقہ تھا۔ جب مِلک چھجو نے بغاوت کی اور دہلی پر حملہ کیا جس میں اس کو شکست ہوئی تب بھی اس کو کوئی سخت سزا نہیں دی گئی۔

لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جلال الدین نے اپنے عمل سے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی

کہ وہ ایک نئی طرح کی ریاست کا تصور قائم کر رہا ہے ایک ایسی ریاست کا جس کی بنیاد لوگوں کی نیک خواہشات اور تعاون پر ہو گی، جس میں تمام لوگوں کی شرکت ہو گی اور جس کا بنیادی مقصد لوگوں کو فائدہ پہنچانا اور ان کی حفاظت کرنا ہو گا۔ لہٰذا بلبن کے برعکس اس نے اقتدار کو ذاتی گھمنڈ اور ظلم سے ہم آہنگ کرنے سے انکار کر دیا۔ برنی کی دلکش زبان میں وہ اس پالیسی میں یقین رکھتا تھا کہ "ایک چیونٹی کو بھی نقصان نہ پہنچے۔"

حالانکہ جلال الدین خلجی ایک نیک اور مذہبی مسلمان تھا لیکن علماء کے اس مطالبہ سے وہ قطعی متفق نہیں تھا کہ ہندوؤں سے زبردستی ان کا مذہب تبدیل کروایا جائے یا ان کی بے عزتی کی جائے۔ ایک مباحثہ کے دوران اس نے اپنے ایک خاص ساتھی احمد چپ کے سامنے اپنی اس پالیسی کی مدافعت کی کہ جس کے تحت اس نے ہندوؤں کو اجازت دی تھی کہ وہ بت پرستی، اپنے عقائد کی تبلیغ اور مذہبی امور کی انجام دہی کر سکیں اگرچہ وہ کفر ہے۔ لہٰذا ان کو اس کے محل کے سامنے سے اپنے جلوس نکالنے، تاشے بجانے یا اپنے بتوں کو جمنا میں بہانے میں کوئی مزاحمت پیش نہیں آتی تھی۔ اسی طرح ہندوؤں کو دہلی میں بھی پوری عزت اور آرام و آسائش کے ساتھ زندگی گزارنے کی اجازت تھی جو کہ اسلام کا مرکز تھا۔ اس کے مطابق خوف کی سیاست، حکومت کا ڈر اور عظمت لوگوں کے دلوں میں کم عرصے کے لیے قائم ہو سکتی ہے اور اس کا مطلب اسلام کو ترک کرنا ہو گا یا جیسا کہ کہاوت ہے اس کا مطلب ہو گا "لوگوں کے دلوں سے اسلام کو ایسے خارج کرنا جیسے آٹا گوندھتے وقت بال کو نکال دیتے ہیں۔"

جلال الدین خلجی کا بھتیجا اور داماد علاء الدین خلجی (1296-1316) جو دھوکے سے اپنے چچا کو قتل کر کے تخت پر بیٹھا تھا، اس نے جلال الدین کے روادارانہ اور انسانی اصولوں کو نہیں مانا۔ بہر حال جلال الدین نے جن اصولوں کی بنیاد ڈالی تھی وہ دور رس تھے۔ اس کے جانشینوں کو کسی نہ کسی شکل میں ان کا سامنا کرنا ہی پڑا۔

لہٰذا جلال الدین خلجی کا دور دور رس اہمیت کا حامل ہے لیکن اس بات کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

علاء الدین خلجی نے جلال الدین کے نظریہ کریم النفسی اور انسانیت کو اس لیے نہیں مانا

کیونکہ وہ وقت کے تقاضوں کے مطابق نہیں تھا اور حکومت کی کمزوری کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ اس نے بلبن کے نظریے، کہ خوف ہی اچھی حکومت کی بنیاد ہے، کو زیادہ اہمیت دی۔ اسی نظریے کے مطابق اس نے امراء اور عام لوگوں کے ساتھ رویہ اختیار کیا۔ لہٰذا اس کے ابتدائی دور میں جب چند بغاوتیں ہوئیں جس میں ایک اس کے اپنے بھتیجے آقات خاں کے ذریعہ بھی تھی تب اس نے طے کیا کہ وہ امراء کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے سخت اقدامات اٹھائے گا۔ اس نے بلبن کے جاسوسی نظام کو دوبارہ قائم کیا جو اس کو تمام حالات سے باخبر رکھیں یہاں تک کہ ان حالات سے بھی جو امراء کے اندرون خانہ ہو رہے ہیں۔ امراء کو ایک دوسرے سے ملنے کے لیے منع کر دیا گیا اور ضیافتی محفلوں کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ حد یہ ہے کہ ازدواجی رشتوں میں بھی انہیں پہلے سلطان سے اجازت لینا پڑتی تھی۔

دوسرے وہ بلبن کے اس خیال کی طرف بھی متوجہ ہوا کہ لوگوں کے پاس اتنی دولت نہیں رہنی چاہیئے کہ وہ بغاوت کے بارے میں سوچ سکیں۔ اس خیال سے برنی بھی متفق ہے۔ اس پالیسی کے تحت اس نے حکم جاری کیا کہ وہ تمام زمین جو خیرات کے طور پر یعنی وقف اور انعام کے طور پر دی گئی ہیں وہ ضبط کر لی جائیں۔ جلال الدین کے عہد کے تقریباً تمام امراء کو جن کو علاء الدین نے سونے اور عہدے کا لالچ دے کر اپنی طرف ملا لیا تھا، ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور ان کی جمع کی ہوئی تمام دولت کو ضبط کر لیا۔

شراب پینا بھی ممنوع قرار دے دیا گیا اور ان کو سخت سزائیں دی گئیں جنہوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی۔ بہر حال علاء الدین نے اس حقیقت کا اعتراف قاضی القضاۃ سے کیا کہ شراب کی خرید و فروخت بند نہیں ہوئی۔

برنی ہم کو یہی باور کرواتے ہیں کہ علاء الدین خلجی کی زراعتی اصلاحات کا مقصد یہی تھا کہ لوگوں کو اس درجہ پر پہنچا دو، یعنی ہندوؤں کو اتنا کم مایہ کر دو کہ وہ بغاوت نہ کر سکیں۔ اس مسئلہ پر ہم علیحدہ بات کریں گے۔ علاء الدین نے بہر حال، ایک قابل ملامت پالیسی کی بنیاد ڈالی۔ جب کچھ منگول فوجیوں نے، جنہوں نے گجرات کی مہم میں حصہ لیا تھا، اس پالیسی کے خلاف بغاوت کر دی کہ غنیمہ میں 4/5 حصہ حکومت کا ہوگا تو علاء الدین نے ان کی بیوی اور بچوں کو، جو دہلی میں تھے، قید

کر لیا۔ یہ ایک ایسا عمل تھا جس کو برنی بہت نیا بتاتا ہے۔ علاء الدین کا بھائی نصرت خاں اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ گیا اس نے ان باغیوں کے بیوی اور بچوں کو سفاکانہ سزائیں دیں اور ایذا پہنچائی۔

بہر حال علاء الدین نے جلال الدین خلجی کے اس خیال کو مان لیا کہ ہندوستان کے حالات میں اسلامی نظریہ سیاست کے مطابق حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ برنی نے بتایا ہے کہ دہلی میں قاضی مغیث سے دوران گفتگو علاء الدین نے اس بات پر زور دے کر کہا کہ اقتدار و طاقت کی شان و شوکت اور سخت سزا دینے کی شریعت اور متبرک قانون اجازت نہیں دیتے اور ان سے ہندوستان میں فرار ممکن نہیں ہے۔ دراصل وہ تو اس معاملے میں اس حد تک گیا کہ اس نے کہا ”میں نہیں جانتا کہ شریعت کے مطابق کیا جائز ہے اور کیا ناجائز۔ میں جو کچھ بھی حکومت کے لیے ضروری سمجھتا ہوں یا اس کی بہبودی کے لیے ضروری ہوتا ہے میں وہی حکم دیتا ہوں۔“ برنی افسردگی سے اس پر اختتام کرتا ہے کہ علاء الدین اس بات کا ہی قائل تھا کہ ریاست اور انتظام سے متعلق معاملات کا کوئی تعلق شریعت کے قوانین اور احکامات سے نہیں ہے جبکہ پہلے کا تعلق صرف بادشاہ سے ہے اور دوسرے معاملات قاضی اور مفتیوں کے ذمہ ہیں (یعنی جن کا تعلق عدالت میں انصاف سے ہے)۔

علاء الدین خلجی کے عہد میں غیر ترکوں کو پیچھے نہیں چھوڑا گیا بلکہ ان کو بھی آگے بڑھایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ علاء الدین غیر ترک لوگوں کا انتخاب اور ان کی اعلیٰ عہدوں پر تقرری کر سکا۔ جیسے ظفر خاں اور نصرت خاں اور بعد میں مِلک کافور جو ایک غیر ترک غلام تھا جس کو گجرات میں گرفتار کیا گیا تھا۔ مِلک نائک جو ایک ہندو تھا اور سنام اور سمانا کا گورنر تھا اس کو ایک ایسی فوج کا کمانڈر بنایا جس میں کافی تعداد میں مسلم افسران تھے جنہوں نے اس کی ماتحتی میں کام کیا اور اس فوج نے منگولوں کو شکست فاش دی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اس کی فوج کا حصہ تھی۔

(ii) علاء الدین کے زرعی اور مارکیٹ اصلاحات:

علاء الدین خلجی کی زرعی اور مارکیٹ کی اصلاحات کو دونوں نظریوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے ایک تو سلطنت کے اندرونی ڈھانچہ کو ٹھیک کرنے کی کوشش اور دوسرے منگولوں کے خطرے کو دیکھتے ہوئے ایک بڑی فوج کی تشکیل کی ضرورت۔

علاءالدین خلجی کی زرعی اصلاحات کا مقصد دیہاتوں کو حکومت کے قریب کرنا تھاخاص طور سے وہ علاقہ جو دیپال پور اور لاہور سے جدید الٰہ آباد کے نزدیک کڑا کے علاقہ تک تھا۔ اس علاقہ میں دیہاتوں کو خالصہ کے تحت لانا تھایعنی یہ علاقہ کسی بھی امیر کو اقطاع میں نہیں دیا جائے گا۔ وہ زمینیں بھی جو امداد کے طور پر دی گئی تھیں انہیں بھی ضبط کر کے خالصہ میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ اس علاقہ کا خراج پیداوار کا نصف قرار دیا اور اس کا تخمینہ پیائش کی بنیاد پر طے کیا گیا۔ برنی جو ہماری معلومات کا اہم ماخذ ہے وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں بتاتا کہ کھیتوں کی پیائش کا کیا طریقہ تھا۔ زیرِ کاشت زمین کی پیائش اور وہاں سے ہونے والی پیداوار کا تخمینہ بسوا (1/20 بیگھ) کے حساب سے حکومت کا حصہ مقرر کیا گیا۔ اس کے علاوہ سوائے جانوروں کے چرائی ٹیکس اور مکانوں کے گھری ٹیکس کے کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا گیا۔ یہ دونوں ٹیکس پہلے بھی لیے جاتے رہے تھے اور روایتی ٹیکس تھے۔ لگان کا تخمینہ اناج پر طے کیا لیکن نقدی میں وصول کیا جاتا تھا۔ اس لیے کسانوں کو اپنا اناج یا تو بنجاروں کو بیچنا پڑتا تھا یا وہ منڈی لے جاتے تھے۔

اس بارے میں ہم کو کچھ نہیں معلوم کہ علاءالدین کی نصف پیداوار کی وصولیابی کا لگان بڑھنے پر کیا اثر پڑا اس لیے کہ ہم کو نہیں معلوم کہ اس سے پہلے کتنا لگان وصول کیا جاتا تھا۔ چاہے وہ راجپوت حکمرانوں یا ابتدائی ترکی حکمرانوں کا دور ہو۔ دھرم شاستر کے مطابق لگان چوتھائی یا چھٹا حصہ ہوتا تھا جو ناگہانی حالات کے تحت نصف تک بڑھایا جاسکتا تھا۔ لگان کے علاوہ بھی بہت سے منظور شدہ ٹیکس تھے جن کے بارے میں تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔ لہٰذا زمیندار کو زمین دینے کا جو فارمولا تھا وہ 'بھاگ' بھوگ۔ کر یعنی لگان، محصول اور ٹیکس' تھے۔ یہ اصول ابتدائی ترک حکمرانوں کے دور تک رہے ہوں گے۔ علاءالدین نے تمام ٹیکسوں کو یکجا کر کے وصول کرنا شروع کیا یا اس نے کسانوں سے وصول کی جانے والی رقم کی مقدار بڑھادی ہمیں اس بارے میں کوئی معلومات نہیں ہے۔

اسی طرح پیائش کا بھی ایک پرانا طریقہ تھا لیکن شمالی ہندوستان میں اس کا استعمال عمل میں نہیں تھا۔ یہ ممکن ہے کہ پہلے حکمرانوں جیسے بلبن وغیرہ کے دور میں یہ طریقہ رائج رہا ہو اس لیے کہ برنی کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کوئی بالکل نیا طریقہ نہیں تھا۔ بہر حال ایک بڑے علاقے پر اس کا باضابطہ نفاذ علاءالدین خلجی کا ایک اہم کارنامہ تھا۔ دوآب کا خالصہ میں شامل کر لینا

-13 دہلی سلطنت دور میں مذہبی اور ثقافتی زندگی 279-325

(i) طرز تعمیر

(ii) مذہبی تصورات اور عقائد

(الف) صوفی تحریک۔ ابتدا۔ چشتی اور سہروردی سلسلے

(ب) بھکتی تحریک۔ ابتدا۔ شمالی ہندوستان میں

بھکتی تحریک کی مقبولیت ۔وشنو تحریک

(iii) ادب اور فنونِ لطیفہ، سنسکرت ادب ۔ عربی اور فارسی ادب

علاقائی زبانیں۔ فنون لطیفہ (موسیقی)

-14 سلطنت عہد میں ریاست 326-345

(i) ریاست کا قانونی، سیاسی اور سماجی کردار

(ii) علماء سے رشتہ

(iii) ہندوؤں کی حیثیت

(iv) جبر واستبداد، لطف و کرم اور ارتقاء۔

اور کسانوں سے براہ راست تعلق قائم کرنے کا یہ مطلب قطعی نہیں تھا کہ تمام سامنت کو ختم کر دیا گیا ہو۔ دیہاتی علاقوں میں ایک عرصۂ دراز سے سامنت میں بھی درجات تھے جس میں رائے، رانا اور راوت اہم حیثیت رکھتے تھے۔ یہ سردار کہلاتے تھے۔ ایک سردار کبھی کبھی ایک بڑے علاقے پر اختیار رکھتا تھا جو اپنے مددگاروں کے ذریعہ کسانوں سے لگان وصول کرتا تھا۔ گاؤں میں ایک سردار ہوتا تھا جس کو چودھری یا مقدم کہتے تھے۔ جیسے ہی دو آب میں ترکی سلطنت کا قیام مضبوط ہوا تو رائے اور راناؤں کی طاقت اور اختیار ختم ہو گیا اور ان میں سے کچھ تو برطرف کر دیے گئے۔ اسی دوران نئے سامنت کا عروج ہوا جن کا دائرہ عمل پرگنہ یا شق (ضلع) تک محدود تھا۔ بظاہر یہی وہ لوگ ہیں جن کو برنی خوط کے نام سے مخاطب کرتا ہے اور انہی کے لیے سامنت کی اصطلاح پہلی مرتبہ خسرو نے استعمال کی ہے۔ اس کے بعد سامنت کی اصطلاح کا استعمال تمام قسم کے سامنت کے لیے ہونے لگا۔ علاء الدین کی زرعی اصطلاحات اس مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس کے تحت رائے اور راناؤں کو برطرف کرنے کے لیے دباؤ بڑھایا جا سکے۔ بہرحال ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سامنت جنھوں نے حکومت کو لگان کا روپیہ یکمشت دے دیا وہ 16ویں اور 17ویں صدی تک برسر اقتدار رہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ زمینیں جن پر ایسے سرداروں کا اقتدار تھا ان کو خالصہ میں شامل نہیں کیا گیا۔

ان علاقوں میں بھی جن کو خالصہ میں شامل کیا گیا، علاء الدین نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ وہ خوط، مقدم اور چودھریوں کی مراعات کو ختم کر دے۔ یہ طبقہ دیہات کے اشراف کا تھا جو برنی کے مطابق اتنے دولت مند تھے کہ عربی اور عراقی گھوڑوں پر سواری کرتے، ہتھیار سجاتے اور قیمتی لباس پہنتے، اور شراب نوشی کرتے اور محفلِ جشن سجاتے۔ ان کی دولت گاؤں کی بہترین زمینوں پر قبضہ کی وجہ سے تھی۔ اسی کے ساتھ ایسا بھی ہوتا کہ جب پورے گاؤں کا تخمینہ ہوتا (جس کو گروہی تخمینہ کہتے ہیں) تو یہ کبھی کبھی ایسا بھی کرتے کہ اپنے لگان کا بوجھ ان کے کندھوں پر ڈال دیتے جو کمزور ہوتے۔

ہم نہیں جانتے کہ علاء الدین کی زرعی اصلاحات کا اثر دیہاتی سماج کے مختلف طبقات پر کیا پڑا۔ علاء الدین نے نہ صرف خوط، مقدم اور چودھریوں کو مجبور کیا کہ وہ دوسروں کی طرح چرائی اور رہائش گاہ کا ٹیکس ادا کریں بلکہ پیمائش کے نظام کے ذریعہ اس کا بھی خاص خیال رکھا کہ یہ لوگ

اپنے لگان کا بوجھ کمزور لوگوں پر نہ ڈال سکیں۔ ان سے خوطی کا کمیشن بھی چھین لیا گیا جو ان کو لگان وصول کرنے کے عوض میں دیا جاتا تھا۔ لہٰذا برنی کے مبالغہ آمیز بیان کے مطابق ان کی حیثیت کم ہو کر بالاہار یعنی دیہاتی سماج کے سب سے نچلے طبقے، نوکروں، تک پہنچ گئی تھی۔ اب وہ اس قابل نہیں تھے کہ گھوڑے پر چلتے، قیمتی لباس پہنتے یا پان کھاتے اور ان کی عورتوں کو مجبوراً مسلمانوں کے گھروں میں مزدوری کرنی پڑتی۔ حالانکہ علاء الدین کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ گاؤں کی زمینوں کا بٹوارہ دوبارہ کرواتا یہ طبقہ اب بھی گاؤں کی سب سے زیادہ اور بہترین زمین پر قابض تھا لہٰذا وہ اب بھی دیہی سماج میں بہتر استحقاق کا حامل تھا بہر حال ہم برنی کے اس قول کو قبول کر سکتے ہیں کہ سزا کے ڈر سے یہ لوگ نہایت فرمانبردار ہو گئے تھے یہاں تک کہ چپراسی کے حکم سے بھی یہ لوگ لگان کی ادائیگی کے لیے امین کے دفتر تک جاتے تھے۔ علاء الدین کے ان اقدامات کی وجہ سے کاشتکار گاؤں کے صاحبِ حیثیت لوگوں کی معمول سے زیادہ غیر قانونی اخراج کی وصولیابی سے کسی حد تک محفوظ رہ سکے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کاشتکاروں کو اگر ایک طرف سے فائدہ ہوا تو دوسری طرف وہ نقصان میں تبدیل ہو گیا۔ علاء الدین کی مارکیٹ اصلاحات نے کسانوں کو بری طرح متاثر کیا اور اس پالیسی کے نتیجے میں کاشتکار کے پاس "صرف اتنا سرمایہ رہ جاتا تھا کہ وہ کھیتی کو جاری رکھ سکے اور اپنا پیٹ پال سکے (صرف دودھ اور چھاچھ کے لیے)۔" ہمیں بتایا گیا ہے کہ کاشتکار لگان ادا کرنے کے لیے حکومت کے ڈر سے اپنی بیویوں اور جانوروں کو بیچ دیا کرتے تھے۔

زرعی نظام کی اصلاح کے سلسلے میں علاء الدین نے اس بات کی کوشش کی کہ لگان سے متعلق انتظامیہ ایمانداری اور بہتر طریقے سے کام کرے۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا اس لیے کہ خالصہ کی وسعت کے بعد بڑی تعداد میں متصرف، عاملوں اور گماشتوں کا تقرر ہوتا تھا۔ یہ کام نسبتاً کم وقت میں ممکن ہو سکا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح اتنے کم وقت میں، نئے حکمراں چھوٹے قصبات تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ علاء الدین چاہتا تھا کہ ان تمام افسران کے حساب کتاب کی جانچ نائب وزیر شرف قیس کرے اور اگر گاؤں کے پٹواری کی حساب کی کتاب میں، جس کے بارے میں ہم پہلی مرتبہ سن رہے ہیں، اگر ان کی طرف ایک جیتل بھی واجب الاداء ہے، تو انہیں سخت سزا دی جائے یا ان کو جیل میں ڈال دیا جائے یا اس سے بھی سخت سزا دی جائے۔

علاءالدین ان کو اچھی تنخواہ دینا چاہتا تھا تاکہ وہ ایک اچھی زندگی گزار سکیں لیکن ان کے رشوت لینے اور بے ایمانی کرنے کی وجہ سے سخت رویہ اختیار کیا۔ جو ایسا کرتے تھے ان کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ اپنے مخصوص انداز میں برنی بیان کرتا ہے کہ کسی بھی عامل اور متصرف کی مجال نہیں تھی کہ وہ رشوت لے سکے اور وہ سخت محنت، لمبے عرصے تک قید ہونے اور تھوڑی سی بھی واجب الادا رقم کے ادا نہ کرنے پر سخت سزائیں جھیلتے جھیلتے اس حالت کو پہنچ گئے تھے کہ لوگ ان عہدوں کو بخار سے بھی بدتر سمجھنے لگے تھے اور اپنی بیٹیوں کی شادی ان سے کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے جو ان عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔

علاءالدین کا پیائش کا نظام جس میں مقامی بااثر لوگوں کے ذریعہ خراج کی وصولیابی پر پابندی لگانا اور شعبہ لگان کے مقامی افسران کے حساب کی، پٹواری کے بہی کھاتوں کی بنیاد پر حساب کی جانچ کروانا، ایک معیار اور سمت مقرر کرنے کی کوشش تھی جس پر اس کے جانشینوں، مثلاً شیر شاہ اور اکبر نے عمل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بااثر طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے منافع پر پابندی لگانے کی کوشش میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا۔ ان طبقوں سے تعلق رکھنے والے بہت بارسوخ تھے اور علاءالدین کے جانشین مبارک شاہ کے دور میں خوط اور مقدم کے حقوق بحال کر دیے گئے اور لگان سے متعلق علاءالدین کے بہت سے ضابطے چھوڑ دیے گئے۔ شاید علاءالدین کی اصلاحات کا اہم اور دیرپا اثر یہ تھا کہ دیہاتوں میں مارکیٹ معیشیت بہتر ہوئی اور شہروں اور دیہاتوں میں ایک قریبی تعلق قائم ہوا جس کے نتیجے میں سلطنت کے اندرونی ڈھانچے میں وسعت پیدا ہوئی۔

مارکیٹ اصلاحات:

باوجود یہ کہ علاء الدین خلجی کی مارکیٹ اصلاحات کا مطمع نظر اندرونی ڈھانچے میں تبدیلی کے بجائے انتظامی اور فوجی ضروریات پر زیادہ تھا، ان کے بارے میں یہاں بات کرنا زیادہ مناسب رہے گا۔

علاءالدین خلجی کی مارکیٹ اصلاحات اور ان کا پُر اثر ہونا اس دور کے لوگوں کے لیے تعجب خیز تھا۔ عہد وسطیٰ کے حکمرانوں سے اس بات کی توقع کی جاتی تھی کہ ضروریات زندگی کی

چیزیں خاص طور سے اناج، شہر کے لوگوں کے لیے بہتر اور مناسب نرخ پر مہیا کیا جائے۔ یہ اس لیے تھا کہ تمام عالم اسلام میں شہر، طاقت اور اقتدار کی شہ رگ سمجھے جاتے تھے۔ گاؤں میں رہنے والوں کو پسماندہ اور اپنی دنیا میں محدود تصور کیا جاتا تھا۔ بہر حال تاجروں پر وقتاً فوقتاً نظر رکھنے کے علاوہ، کچھ حکمراں چیزوں کی قیمتوں پر تھوڑے یا کبھی کبھی لمبے عرصے تک، کنٹرول رکھنے میں کامیاب رہے۔ علاء الدین خلجی بہر حال پہلا حکمراں تھا جس نے قیمتوں کے کنٹرول کے مسئلہ کو ایک باقاعدہ نظام کے تحت کنٹرول کرنے کی کوشش کی اور وہ چیزوں کی قیمتوں کو ایک عرصے تک کنٹرول میں رکھ سکا۔

برنی کا کہنا ہے کہ علاء الدین خلجی نے مارکیٹ اصلاحات کی بنیاد منگولوں کے ذریعہ دہلی کے محاصرہ کے بعد ڈالی تھی کیونکہ وہ اپنی ایک بڑی فوج تیار کرنا چاہتا تھا لیکن اتنی بڑی فوج کو تنخواہ دینے میں اس کا سارا خزانہ خالی ہو جاتا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ قیمتوں پر کنٹرول کرنے اور قیمتوں کے گرنے کی وجہ سے ہی وہ ایک گھوڑ سوار کو مع ایک گھوڑے کے 238 ٹنکا سالانہ اور دو گھوڑوں کے ساتھ 75 ٹنکا زیادہ تنخواہ دینے میں کامیاب ہو سکا۔ برنی مارکیٹ اصلاحات کی دوسری وجہ بھی دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ علاء الدین کی ایک عام پالیسی تھی کہ ہندوؤں کو اتنا مفلس کر دو کہ ان کے دماغ میں بغاوت کے خیالات ہی نہ آسکیں۔ ہم اس کی تحقیق اس وقت کریں گے جب ہم مارکیٹ اصلاحات کا تجزیہ کریں گے۔

برنی کے مطابق علاء الدین نے دہلی میں تین قسم کے بازار قائم کیے۔ پہلا اناج کے لیے، دوسرا تمام قسم کے کپڑوں اور مہنگی اشیاء جیسے چینی، گھی، تیل، خشک میوے وغیرہ اور تیسرا گھوڑوں، جانوروں اور غلاموں کے لیے۔ ان سب بازاروں کے انتظام اور کنٹرول کے لیے تفصیلی ضابطے تیار کیے گئے۔

کھانے کی اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول کرنے کے لیے علاء الدین نے نہ صرف اس پر کنٹرول کیا کہ اناج کی آمد گاؤں سے ہو اور بنجارے اسے شہروں تک پہنچاتے رہیں بلکہ اس کی تقسیم بھی شہریوں میں مناسب طریقے سے ہو۔ بلاشبہ یہی تین اہم پہلو تھے کہ جن کے ذریعہ غذائی اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول ممکن تھا۔ علاء الدین کی پہلی کوشش یہ تھی کہ حکومت کے پاس اناج کی کثیر

مقدار گودام میں رہے تاکہ تاجر اناج کی مصنوعی کمی کو دکھا کر چیزوں کی قیمتیں نہ بڑھا سکیں یا زیادہ منافع کمانے میں نہ لگ جائیں۔ اس مقصد کے تحت دہلی میں شاہی گودام بنائے گئے۔ اس نے حکم جاری کیا کہ دہلی کے قریبی علاقے جیسے جھائن وغیرہ سے شاہی حصہ کا آدھا حصہ یعنی پیداوار کا چوتھائی حصہ لگان کے عوض اناج کی شکل میں لیا جائے گا۔ اناج کو پہلے مقامی جگہ پر رکھا جائے اور پھر دہلی بھیجا جائے۔

گاؤں سے اناج لانے کا کام عام طور پر بنجاروں کے سپرد تھا جن میں سے کچھ کے پاس دس یا بیس ہزار بیل تھے۔ ان بنجاروں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی ایک جماعت قائم کریں اور ایک دوسرے کے ضامن بن جائیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں، جانوروں اور سامان سمیت جمنا کے کنارے رہیں گے۔ ان پر نظر رکھنے کے لیے ایک افسر (شحنہ) کا تقرر کیا گیا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ بنجارے عام حالات میں اتنا اناج شہر میں لاتے تھے کہ شاہی گودام سے کچھ لینے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

بنجاروں کو اناج کی متواتر سپلائی کے لیے کچھ ضابطے بنائے گئے۔ دوآب کے علاقے میں اور اس کے آس پاس کے سو کوس علاقے کو خالصہ میں شامل کر لیا گیا اور یہاں پر لگان پیداوار کا نصف حصہ مقرر کیا گیا۔ مقامی افسروں جن کو لگان وصول کرنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی تھی، ان کو ہدایت دی گئی کہ وہ اتنی سختی برتیں کہ کاشتکار اپنے اناج کو ستا بیچ کر لگان ادا کریں اور اناج اپنے گھروں کو واپس نہ لے جائیں یعنی اپنے گودام میں ذخیرہ نہ کریں[1] اور اگر کاشتکار کچھ زیادہ بیچنا چاہیں یعنی جو ان کی ضرورت اور بیج کو نکال کر زائد ہو تو ان کو ایسا کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ بہرحال مقامی افسران کو حکم دیا گیا کہ وہ ضمانتی کاغذ پر دستخط کریں کہ وہ کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ وہ یا تو ذخیرہ کرے یا سرکار کی طرف سے مقرر کردہ قیمت سے زیادہ قیمت پر بیچے۔ اور اگر کوئی اس حکم کو نہ مانے تو اس کا تمام اناج ضبط کر لیا جائے اور ذخیرہ کرنے والے، یعنی کاشتکار یا دوکاندار اور متعلقہ افسر کو سخت سزا دی جائے۔ برنی کا کہنا ہے کہ کاشتکار 10 من سے زیادہ اناج اپنے لیے نہیں رکھ سکتے تھے، لیکن اس قانون کا نفاذ اتنا آسان نہیں تھا۔ تمام اناج کو منڈی لایا جاتا جو اناج

(1) ایک قاعدہ کے مطابق 'سلطان نے حکم دیا ہے کہ دوآبہ میں خالصہ قصبات کا تمام خراج (مالگزاری) جنس کی شکل میں طلب کیا جائے اور دہلی کے شاہی گوداموں میں لے جایا جائے۔' یہ حکمنامہ محولہ بالا قاعدے کی خلاف ورزی کرتا ہے اور علاقہ کے ان دیگر قصبات اور شہروں کو غلہ اور جنس سے محروم کر دیتا ہے کہ جہاں ان کی ضرورت ہے عملاً ایسا لگتا ہے کہ خراج نقد اور جنس دونوں شکلوں میں وصول کر لیا جاتا تھا۔

کی فروخت کے لیے علاء الدین نے قائم کیے تھے، اور وہیں سرکاری قیمت پر اناج فروخت ہوتا۔

علاء الدین نے ایسے سخت اقدامات اٹھائے کہ جن کے تحت اس بات پر کنٹرول ہو سکے کہ جو قیمتیں اس نے مقرر کی ہیں ان پر سختی سے عمل ہوتا رہے۔ اس نے ایک شہنہ کا تقرر کیا جس کو ایک فوج بھی مہیا کی گئی اور اس کو ان ہدایات کے ساتھ مارکیٹ کا انچارج مقرر کیا گیا کہ جو اس کے حکم کی خلاف ورزی کرے اسے سخت سزا دی جائے۔

برنی کا کہنا ہے کہ اس کے نتیجے میں اناج کی قیمت گر گئی۔ لہٰذا گیہوں 1/2 7 جیتل فی من، باجرہ 4 جیتل، چاول کی عمدہ قسم 5 جیتل، چنا 5 جیتل وغیرہ کے حساب سے فروخت ہوا۔ اگر موجودہ وزن سے مقابلہ کریں تو ایک روپیہ کا 88 سیر گیہوں، 98 سیر چنا اور عمدہ قسم کا چاول ہوگا۔ حد یہ ہے کہ اس دور کے لوگوں کی نظر میں یہ بہت سستی چیزیں تھیں(1)۔

اناج کی قلت کے زمانے میں علاء الدین نے راشن کا انتظام بھی کیا۔ ہر دوکاندار کو اس کے محلے کی آبادی کے حساب سے سرکاری گودام سے اناج دیا جاتا تھا۔ کسی شخص کو یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ ایک وقت میں آدھے من سے زیادہ اناج خرید سکے لیکن اس کا اطلاق امراء پر نہیں کیا گیا۔ اگر ان کے پاس اپنی زمین یا گاؤں نہیں ہیں تو ان کے ساتھ رہنے والوں کے حساب سے انہیں اناج دیا جاتا۔

برنی کا کہنا ہے کہ ان اقدامات کے نتیجے میں قحط کے زمانے میں بھی دہلی میں اناج کی کمی نہیں ہوئی اور اناج کی قیمت میں ایک دام یا درہم کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔ برنی کا ہم عصر عصامی بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ قحط کے زمانے میں اناج کی منڈی میں اتنا کثیر مجمع تھا کہ دو تین کمزور لوگ تو دب کر ہی مر گئے۔ علاء الدین نے حکم جاری کیا کہ اناج کو جمع کیا جائے اور اسی قیمت پر فروخت کیا جائے جو قیمت قحط سے پہلے تھی۔

دوسرا بازار کپڑوں کا بازار تھا جہاں خشک میوے، جڑی بوٹیاں، گھی، تیل وغیرہ بھی فروخت کیا جاتا تھا اور ان چیزوں کو کافی مدت کے لیے رکھا جا سکتا تھا۔ یہ مقام سرائے عدل کہلاتا تھا۔ علاء الدین نے حکم جاری کیا کہ تاجر جو بھی کپڑا ملک کے مختلف علاقوں یا ملک کے باہر سے لائیں اس کو اسی سرکاری بازار میں رکھا جائے اور حکومت کی طے شدہ قیمت پر فروخت کیا جائے۔

---

(1) علاء الدین کا 1 من، اکبر کے زمانے کے 1 من کی طرح ہی 28 سیر کا ہوتا تھا۔

اگر کسی بھی چیز کو حکومت کی طرف سے طے شدہ قیمت سے ایک جیتل زیادہ قیمت پر بھی فروخت کیا گیا تو پورا مال ضبط کر لیا جائے گا اور بیچنے والے کو سزا دی جائے گی۔ ان تمام اشیاء کی بڑی مقدار میں سپلائی کی ضمانت کے لیے تمام تاجر چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، ان کے نام رجسٹر میں درج کیے گئے اور ان سے اقرار نامہ لکھوایا گیا کہ وہ ہر سال اشیاء کی یہی مقدار سرائے عدل میں لاتے رہیں گے اور ان کو سرکار کی طرف سے مقرر کی گئی قیمت پر فروخت کریں گے۔

یہ اقدامات کوئی نئے نہیں تھے لیکن دو اقدامات نئی سمجھ کی دلالت کرتے ہیں۔ پہلا یہ کہ مالدار ملتانی تجار، یعنی وہ لوگ جو دور دراز کے ممالک سے بھی اشیاء کو لاتے، ان کو سرکاری خزانے سے 20 لاکھ ٹنکے بطور نزداد دیے جاتے اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی اشیا کسی بچولیے کو نہیں بیچیں گے بلکہ اس کو سرائے عدل میں ہی سرکاری نرخ پر فروخت کریں گے۔ دوسرے یہ کہ ان احکامات اور ضابطوں کی پیروی کی ذمہ داری کا اختیار بھی تاجروں کے ایک گروپ کو دے دیا گیا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ان ضابطوں کی بدولت ہی دہلی میں اتنا کپڑا لایا گیا کہ وہ برسوں استعمال نہ ہو سکا۔

آخر میں اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ عام لوگ قیمتی کپڑا نہ خرید سکیں اور دوسرے لوگوں کو دے سکیں جو دہلی کے باہر لے جائیں اور قریب کے علاقوں میں اصل قیمت سے چار اور پانچ گنا زیادہ پر بیچ سکیں، ایک افسر کا تقرر کیا گیا جو امیروں اور ملکوں وغیرہ کو ان کی آمدنی کے حساب سے قیمتی کپڑا خریدنے کی اجازت دے۔

مختلف قسم کے کپڑوں اور دیگر اشیاء کی قیمتوں کی ایک لمبی فہرست برنی دیتا ہے جیسی کہ اس نے اچھے اناج کے لیے دی تھی۔ یہ صرف اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اشیاء کتنی سستی تھیں۔ لہٰذا ایک ٹنکا میں ایک آدمی 40 گز معمولی کپڑا یا 20 گز بہترین بنا ہوا کپڑا، ایک سیر موٹی چینی ڈیڑھ جیتل میں، 1/2 سیر گھی 1 جیتل میں، تین سیر تل کا تیل 1 جیتل وغیرہ میں خریدا جا سکتا تھا۔

تیسرا بازار گھوڑوں، جانوروں اور غلاموں وغیرہ سے متعلق تھا۔ اچھی قسم کے گھوڑوں کو بہتر قیمت پر مہیا کرنا بھی فوجی شعبوں اور سپاہیوں، دونوں کے لیے بہت اہم تھا۔ گھوڑوں کی تجارت کسی حد تک اجارہ داری کی تجارت تھی اس علاقے کی تجارت پر ملتانی اور افغانی تاجروں کی اجارہ داری تھی لیکن بازار میں ان کی فروخت بچولیے یا دلال کے ذریعہ ہوتی تھی۔ برنی کے مطابق

یہ مالدار دلال بھی اتنے ہی طاقت ور تھے جتنے کہ بازار کے افسران تھے۔ وہ بے شرمی سے سودا کرتے اور رشوت یا کسی بھی غلط طریقے کا سہارا لیتے۔ گھوڑوں کے سوداگران دلالوں سے مل کر گھوڑوں کی قیمت میں اضافہ کرانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

علاء الدین نے ایسے دلالوں کے خلاف سخت اقدامات اٹھائے۔ ان کو شہر سے نکال دیا گیا اور کچھ دلالوں کو قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد دوسرے دلالوں کی مدد سے گھوڑوں کی صفت اور ان کی قیمت کو طے کیا گیا۔ اوّل درجہ کے گھوڑوں کی قیمت 100 اور 200 ٹنکے، دوسرے درجہ کے 80 سے 90 ٹنکے اور تیسرے درجہ کے گھوڑوں کی قیمت 65 سے 70 ٹنکے مقرر کی گئی۔ معمولی گھوڑے یا ٹٹو جن کا استعمال فوج میں نہیں ہوتا تھا ان کی قیمت 10 سے 25 ٹنکے مقرر کی گئی۔

علاء الدین چاہتا تھا کہ مالدار لوگ اور دلال گھوڑوں کے بازار میں نہ جائیں اور گھوڑوں کے تجار گھوڑوں کی فروخت براہ راست فوجی شعبہ (دیوانِ عرض) کو کریں۔ لیکن بچولیوں کو ختم کرنے کی اس کی کوشش زیادہ کامیاب نہیں رہی حالانکہ برنی کا کہنا تھا کہ علاء الدین نے جو گھوڑوں کی قیمت مقرر کی تھی وہ اس کے پورے عہد تک قائم رہی تھی۔

اس طرح غلام لڑکے اور لڑکیوں کی قیمت اور جانوروں کی قیمت بھی مقرر کی گئی اگرچہ اس کی ضرورت واضح نہیں ہوتی۔ کیونکہ نہ تو یہ ایک ضرورت ہی تھی اور نہ ہی فوجی کاموں کے لیے ان کی ضرورت تھی۔ بظاہر یہ قیمت اس لیے مقرر کی گئی تھی کہ امراء کی زندگی کو آرام دہ اور آسان بنایا جاسکے اور مالدار طبقے معہ سرکاری افسران کے اور وہ فوجی جو گھر کے اور ذاتی کاموں کے لیے غلام خریدنے کے عادی ہو چکے تھے، انہیں خرید سکیں۔ اسی طرح جانوروں کی ضرورت گوشت، آمدورفت، دودھ اور دودھ سے بنی چیزوں کے لیے تھی۔

برنی کا کہنا ہے کہ علاء الدین کے عہد میں قیمتوں کا ٹھہراؤ، جو تعجب خیز تھا، دراصل علاء الدین کی سختیوں کا نتیجہ تھا۔ سلطان نے قیمتوں سے باخبر رہنے کے لیے مخبری کے مختلف طریقے استعمال کر رکھے تھے۔ یہاں تک کہ وہ چھوٹے بچوں کو دوکانداروں کے پاس بازار بھیجتا تھا تاکہ وہ دیکھ سکے کہ دوکاندار تول میں تو کوئی بے ایمانی نہیں کرتے۔ اپنے مخصوص انداز میں برنی لکھتا ہے کہ اگر کوئی دوکاندار کم تولتا تو اس کے جسم سے اس سے دوگنا گوشت کاٹ لیا جاتا۔ ایسا لگتا

ہے کہ کچھ معاملات میں مثالی سزائیں دی گئیں۔ لیکن یہ اسکیم تجار اور عام لوگوں کی کم سے کم مدد کے بغیر مشکل سے دس یا اس سے زیادہ سال چل سکتی تھی۔

یہ بات تو صاف ہے کہ ان اقدامات کا مقصد کسی ایک مذہب کے لوگوں کو نقصان پہنچانا نہیں تھا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ تجار جن کے نام رجسٹر میں درج کیے گئے وہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے۔ اسی طرح ملتانی اور گھوڑوں کے تاجروں کے دلالوں پر بھی سخت گرفت تھی اور ہمیں بتایا گیا ہے وہ اپنی زندگی سے عاجز تھے اور موت کے خواہش مند تھے۔ کاشتکار یقیناً اناج کی کم قیمت اور بڑھے ہوئے لگان سے بری طرح متاثر ہوئے۔

ہم کو بتایا گیا ہے کہ علاء الدین کی موت کے بعد اس کی مارکیٹ اصلاحات دفعتاً غائب ہو گئیں۔ قطب الدین مبارک شاہ نے جو اس کا جانشین بنا، قیدیوں کی ایک بڑی تعداد کو جو مختلف خلاف ورزیوں کی بدولت یا تو شہر بدر کر دیئے گئے تھے یا قید میں تھے، آزاد کر دیا۔ اس نے ان قوانین کو بھی واپس لے لیا جن کی بدولت لوگوں کو آزادی سے کھانے، پینے، بات چیت کرنے اور خرید و فروخت میں دشواری پیش آتی تھی۔

برنی کا کہنا ہے کہ علاء الدین کی مارکیٹ اصلاحات کا اطلاق صرف دہلی میں ہی تھا۔ اگر ایسا تھا، تو پورے دوآب میں اناج کی فراہمی پر کنٹرول کرنے کی مشکل سے ہی ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ ہی فوجی اور ان کے خاندان صرف دہلی میں ہی سکونت نہیں رکھتے تھے بلکہ دوسرے شہروں اور قصبوں میں لاہور سے اودھ تک سکونت پذیر تھے۔ برنی خود اپنی کتاب میں تجویز کرتا ہے جو اس نے سیاسی نظریے سے متعلق لکھی ہے، کہ جو کچھ کہ مرکز میں ہوتا ہے اس کی پیروی عام طور پر دوسرے شہروں میں بھی ہوتی ہے۔ بہر حال ہمارے پاس وہ ذرائع نہیں ہیں جن کی مدد سے ہم یہ اندازہ لگا سکیں کہ قیمتوں پر کنٹرول دہلی کے علاوہ دوسرے شہروں میں کس حد تک موثر رہا۔

بظاہر علاء الدین کے ضابطوں کا نتیجہ لوگوں کے لیے تکلیف دہ، ضابطہ پرستی کے کنٹرول اور بدعنوانیوں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ علاء الدین اگر صرف ضرورت کی اشیاء یا وہ چیزیں جن کا استعمال براہ راست فوجیوں کے لیے تھا، پر کنٹرول کرتا تو شاید زیادہ کامیاب رہتا۔ لیکن اس نے ہر چیز کی قیمت پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ ''ٹوپیوں سے موزوں، کنگھیوں سے سوئیوں، سبزیوں،

مٹھائیوں سے چپاتیوں وغیرہ تک کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔" اتنے بڑے پیانے پر کنٹرول کا مطلب تھا کہ لوگ اس کی مخالفت اور خلاف ورزی کریں اور سزاؤں کو دعوت دیں جس کے نتیجے میں غم وغصہ کا اظہار ہو۔

بہر حال، اپنی نوعیت کے اعتبار سے علاء الدین خلجی کے اصلاحات عارضی ہی تھیں اور اس کا مقصد ناگہانی صورت حال یا خاص صورت حال سے نکلنا تھا۔

(iii) دہلی سلطنت کے رقبے میں وسعت (1328 تک):

ہم نے دیکھا کہ کس طرح پچھلے 85 سالوں میں، 1206 میں دہلی سلطنت کے قیام سے سلاطین کی توجہ دہلی کے رقبہ کو وسیع کرنے کے بجائے اس بات پر رہی کہ دہلی کی حدود قائم رہیں اور اس کا کوئی حصہ علیحدہ نہ ہونے پائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود دہلی میں طاقت کے لیے جدوجہد تھی اور کچھ حد تک چند امیروں کی یہ کوشش کہ وہ اپنے اثر والے علاقے کو علیحدہ کرلیں، منگولوں کے حملے، اور ہندو راجاؤں کا اپنے علاقوں پر دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کی سخت جدوجہد وغیرہ۔ بہر حال خلجیوں کے اقتدار میں عروج کے بعد اور افسران، منتظمین، فوجی اور دوسرے افراد کے تقرر کے سلسلے میں سلطنت کے کھلے رویہ کی بدولت ترکوں کے علاوہ یعنی ہندوستانی مسلمان اور ہندو کی شمولیت، انتظامیہ کے اندرونی ڈھانچہ میں تبدیلی، وغیرہ سے ایسے حالات پیدا ہو گئے جو تیزی کے ساتھ سلطنت کے رقبہ کی وسعت میں معاون ثابت ہوئے۔

یہ وسعت خود مختلف مرحلوں میں انجام پذیر ہوئی۔ پہلے مرحلے میں وہ علاقے جو دہلی سے زیادہ دور نہ تھے جیسے گجرات، راجستھان اور مالوہ وغیرہ، ان کو دہلی کے زیرِ اقتدار لایا گیا۔ دوسرے مرحلے میں موجودہ مہاراشٹر اور دکن کی حکومتوں پر حملے کیے گئے اور ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ دہلی کی تابعداری کو مانیں۔ لیکن اس مرحلے میں اس بات کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ ان پر براہ راست دہلی سلاطین کی حکومت قائم ہو۔ تیسرا مرحلہ علاء الدین کے عہد کے آخری سالوں میں شروع ہوا اور غیاث الدین تغلق (24-1320) کے عہد میں اپنے عروج پر پہنچا۔ اس دور میں پورے دکن پر مرکز کا اقتدار قائم ہو گیا۔ بنگال کو دوبارہ دہلی کے اقتدار میں لے آیا گیا۔

لہٰذا 30 سال کے مختصر دور میں، دہلی سلطنت کے رقبے کی وسعت تقریباً سارے